OSMANIA UNIVERSITY

جامعہ عثمانیہ

تقریب

علم السیاست

سلسلۂ نصابات علمیہ جامعۂ عثمانیہ

تقریب علم السیاسیات

خطبات کے دو سلسلے

تصنیف

سر جے۔ آر۔ سیلی۔ کے۔ سی۔ ایم۔ جی۔ لٹ۔ ڈی۔

ترجمہ

قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے

رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۳۴۸ھ م سنہ ۱۳۳۸ف م سنہ ۱۹۲۹ء

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

یہ کتاب مسرز میکملن اینڈ کمپنی پبلشرز کی اجازت سے
جن کو حق اشاعت حاصل ہے اُردو میں ترجمہ کرکے
طبع و شائع کی گئی ہے۔

فہرست مضامین تقریب علم السیاست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچۂ مدیر

کیمبرج میں تاریخ کے "معلّم" پروفیسر کی حیثیت سے کئی برس تک سر جان سیلی کی تعلیم کا یہ ایک اہم جزو رہا ہے کہ وہ علم السیاست میں ابتدائی تعلیم اس نظر سے نہیں دیتے تھے کہ یہ علم تاریخ کا ایک ہمجنس مضمون ہے جس کے لئے تاریخ کا مطالعہ ایک طرح کی طیاری ہے بلکہ یہ تعلیم وہ اس نظر سے دیتے تھے کہ یہ علم خود تاریخ کے مطالعے کا ایک طریقہ ہے۔ لیکن یہ تعلیم بالعموم باضابطہ تشریحی خطبات کی شکل میں نہیں دی جاتی تھی بلکہ ایک ہفتہ وار مکالمانہ درجے میں ہوتی تھی۔ مسٹر جے آر ٹینر نے جو اس درجے میں تھے جولائی ۱۸۹۵ء کے "انگلش ہسٹاریکل ریویو" (English Historical Review) (صفحہ ۵۱۲) میں اس درجے کے اس طرح چلانے کے طریقے کو بہت صفائی سے بیان کیا ہے۔ میں اُن کے بیان کا ایک حصہ یہاں نقل کرتا ہوں:-

"ان کے پرانے شاگرد ان کے "مکالمانہ درس" کی شکر گزارانہ یاد اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس درس کا مضمون علم السیاست ہوا کرتا تھا، جس کا مطالعہ مباحثے کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ جن 'با احترام حالات' میں یہ مباحثہ ہوتا تھا' ان سے یہ مباحثہ سوال و جواب کے سانچے میں ڈھل جاتا تھا، گویا سقراط، اہل ایتھنز کی حماقت کو ظاہر کرتا تھا۔ ان میں زیادہ تر اصطلاحات کی تعریف اور ان کے علمی استعمال کے متعلق مشق ہوتی تھی۔ آزادی کیا ہے؟ طلبا کی طرف سے مختلف تعریفیں پیش کی جاتیں اور وہ تجزیہ و تحلیل کے زیر عمل آتیں، نازک جرحوں کے ذریعے سے ان تعریفوں کے واضعین خود اپنے تناقضات کا اعتراف کر بیٹھتے۔ اس وقت پروفیسر صاحب اپنی حکایت بیان کرتے، پہلے وہ ان مختلف مفاہیم پر بحث کرتے جن مفاہیم میں یہ اصطلاح علم ادب میں استعمال ہو چکی ہے....

متضاد بیانات کی تنقیح سے آگے بڑھکر تدریجی عمل اور خود طلاب کی مدد سے اپنی ایک خاص تعریف وضع کرتے ...... ہم سے تحکمانہ طور پر یہ نہیں کہا جاتا تھا کہ یہ کوئی ایسی شے ہے جسے ہمیں یاد کرنا چاہیے ہم خود اس کے بنانے میں ممد و معاون ہوتے تھے۔ اس طرح یہ ایک ایسی ملک ہوجاتی تھی جس سے ہم ویسے ہی استحقاق کیساتھ لطف اندوز ہوتے تھے جو ایک مصنف کے استحقاق کے مثل ہوتا تھا۔ لفظ آزادی کی تعریف کرنے میں ایک گھنٹہ کا وقت صرف ہوگیا مگر اس بافراغ کارروائی کی علمی قدر و قیمت بھی بہت ہی اعلیٰ تھی"

جن مباحث کا یہ خاکہ دیا گیا ہے ان کی تکرار سال بہ سال طلبہ کی نئی جماعتوں سے ہفتہ وار ہوا کرتی تھی اس کے ساتھ سیلی کے تشریحی خطبات (کہ وہ بھی ایام میقات میں بالعموم ہفتہ میں ایک مرتبہ ہوا کرتے تھے)، زیادہ تر خاص تاریخی مضامین پر ہوتے تھے اور اس طرح مکالماتی درجے میں جن مسائل سے بحث ہوتی تھی ان سے ان خطبات کا کوئی قریبی تعلق نہیں ہوتا تھا، مگر دو مرتبہ انھوں نے اپنے معمولی طریقہ و عمل سے انحراف کرنا اور علم السیاست پر تشریحی خطبات کے سلسلہ میں بحث کرنا مفید سمجھا۔ اولاً خطبات کے دو سلسلوں میں جو ۸۶-۱۸۸۵ء کے تعلیمی سال میں علی الترتیب میکیلمس اور صوم اکبیر کے میقات میں ہوئے اور اس کے بعد اس سے نصف وسعت کے ایک سلسلے میں جو ۱۸۹۱ء کے میقات میکیلمس میں ہوا[1]

جب بیگم سیلی نے مجھسے اس باب میں مشورہ کیا کہ اُن کے شوہر کے مکمل خطبات کے جو کثیر التعداد مجموعے چھوڑ گئے ہیں ان کا کچھ حصہ دنیا میں شایع کیا جائے تو مجھے صاف یہ نظر آیا کہ ہمارا پہلا انتخاب علم السیاست کے انھیں دو سلسلوں کے مجموعے کے متعلق ہونا چاہیئے کیونکہ اس سے بہ حیثیت معلم کے ان کے کام کے اصولی اہمیت رکھنے والے ایک حصے کا اظہار ہوتا تھا، اور اب تک ان کی جتنی تحریریں شایع ہوئی ہیں ان سب سے زیادہ کامل اور باقاعدہ طور پر تاریخی مطالعے کے صحیح مقاصد و طریق کے متعلق بھی ان کی عام رائے اس سے ظاہر ہوتی تھی لیکن دونوں مذکورہ بالا سلسلوں میں انتخاب کا مسئلہ ایک مشکل مسئلہ تھا، اگر دونوں سلسلے وسعت میں برابر ہوتے تو میں بالطبع دوسرے ہی سلسلے کو منتخب کرتا لیکن

---

[1] زیادہ تغیر کے بغیر اس دوسرے سلسلہ کی تکرار ۱۸۹۲ء میں بھی ہوئی لیکن اب بیماری نے انھیں مجبور کردیا کہ وہ ہر سال خطبات کے ایک نئے مجموعہ مرتب کرنے کے اصول پر استثنا کریں۔

دونوں سلسلوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ عام خیالات جو دونوں سلسلوں میں ظاہر کئے گئے تھے وہ زیادہ تر ایک ہی تھے اور دوسری طرف کل مضمون کو ایک ہی میقات کے خطبات کے اندر سمیٹ دینے کی وجہ سے موخر الذکر سلسلے میں لازماً بعض دلچسپ مباحث کو جن پر سابقہ سلسلے میں پوری پوری بحث ہوئی تھی حذف کرنا پڑا تھا۔ پس فی الجملہ یہی بہتر معلوم ہوا کہ میں سابق اور طویل سلسلے کو شایع کروں مگر اس کے ساتھ ہی حتی الوسع اسی سلسلے میں موخر الذکر سلسلے کے ایسے حصص کو بھی داخل کر دوں جن سے مسائل بحث شدہ یا اُن مسائل کے طریق بحث کے متعلق کسی تغیر رائے کا اظہار ہوتا ہو۔ یہ آمیزش دو طریقوں سے عمل میں آئی ہے موخر سلسلے کے بعض ٹکڑے حواشی یا ضمیمہ جات کی صورت میں بڑھا دیئے گئے ہیں اور بعض صورتوں میں میں نے یہ مناسب سمجھا کہ موخر الذکر ٹکڑوں کو سابق الذکر کے بجائے رکھ دوں تاکہ پریشاں کن تکرار سے نجات ملے۔ مبادلہ کا طریقہ تقریباً تمام تر اس جلد کے سلسلۂ اول کے خطبات ششم و ہفتم میں استعمال کیا گیا ہے۔ درحقیقت ساتواں خطبہ جس طرح یہاں طبع ہوا ہے وہ زیادہ تر سنہ ۱۸۹۱ء کے سلسلے کے خطبہ ششم سے مرکب ہے۔ یہ وسیع تبدیلی مجھے اس لئے ضروری معلوم ہوئی کہ مصنف کی مابعد کی رایوں کا اظہار ہو سکے کیونکہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ جس حالت میں آخری سلسلہ مرتب ہوا ہے اس کی سخت ضیق وسعت کے باوجود اس خطبے میں مسائل زیر نظر پر سنہ ۱۸۸۵ء والے طویل سلسلے کی بہ نسبت زیادہ مکمل بحث کی گئی ہے۔ اس لئے میں نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ سنہ ۱۸۹۱ء میں انھوں نے قوی دلائل کی بنا پر یہ سمجھ لیا ہوگا کہ سابق بحث ضرورت سے زیادہ مختصر ہے۔

اس مبادلہ کی وجہ سے ایک مزید تغیر کی ضرورت لاحق ہوئی کیونکہ پرانے خطبۂ ہفتم کا ایک ٹکڑا ایسا تھا جسے اس اعتبار سے باقی رکھنا ضروری تھا کہ اس میں ایک ایسی بحث شروع کی گئی تھی جس کا سلسلہ خطبۂ ہشتم سے ملا ہوا تھا۔ چونکہ یہ ٹکڑا تنہا موزوں طور پر نہیں رکھا جا سکتا تھا اس لئے میں نے یہ بہتر سمجھا کہ اسے اصل خطبۂ ہشتم سے ملا دوں۔ اس آمیزش کی وجہ سے بعض ٹکڑوں کی قطع وبرید لازم آئی خاصکر ان تکررات کی جو ایک مضمون کو دو خطبوں میں تقسیم کرنے کے باعث پیدا ہوئے تھے اور یہ بھی میرے لئے ضروری ہو گیا کہ نئے خطبۂ ہشتم کے آغاز کے لئے دو نئے جملے لکھدوں کیونکہ سنہ ۱۸۹۱ء کے سلسلے کے خطبۂ ہفتم کے وسیع تغیر وتبدل سے سلسلۂ بیان بالکل ٹوٹ

گیا تھا۔ مزید براں میں نے فقروں کے دو ایک ایسے خفیف الاثر تغیرات سے بھی تامل نہیں کیا جو مجھے ان آمیزشوں کی وجہ سے ضروری معلوم ہوئے جن کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے تاکہ مصنف کے سابق و موخر بیانات میں خفیف سا تضاد بھی نہ پیدا ہونے پائے۔ میں نے جا بجا ایسے مکررات کو بھی حذف کر دیا ہے جو کتاب کی بہ نسبت زبانی خطبے میں زیادہ موزوں تھے اور ایک آدھ جگہ جملوں کا محل بھی بدل دیا ہے اور عام طور پر میں نے ایسی اصلاحیں بھی کر دی ہیں جن کی نسبت میں نے یہ سمجھا کہ باغلب وجوہ ان خطبات کے شایع کرنے کے قبل مصنف خود یہ اصلاحیں کرے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ سیلی اشاعت کے لئے خود جو کتابیں تیار کرتے تھے ان میں وہ ایسے ٹکڑوں کے دوبارہ لکھنے میں جنھیں وہ اپنے منتہائے خیال کے موافق نہیں سمجھتے تھے کوئی دقیقہ محنت کا اُٹھا نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے اس امر کو ان کی یادگار کے منافی سمجھا کہ ان کی اس بعد الممات کتاب کو اس طرح شایع ہونے دوں کہ اس میں ان سہوات کی اصلاح نکروں جو میرے حد امکان میں ہو لیکن کوئی پڑھنے والا مجھ سے زیادہ اس کو محسوس نہ کر سکیگا کہ خود ان کی نظر ثانی کے مقابلے میں یہ میری خامہ فرسائی کس قدر غیر مکتفی ہے ان خطبات کے پڑھنے میں یہ امر ملحوظ رہنا بسا ضروری ہے کہ چونکہ یہ خطبات زبانی بیان کے لئے لکھے گئے تھے اس لئے وہ ایسے طریق پر مرتب ہوئے تھے جو علم السیاست کی کسی ایسی کتاب سے بالکل مختلف ہیں جو پڑھنے کے لئے لکھی گئی ہو۔ ان خطبات کا مقصود کوئی مکمل سلسلہ پیش کرنا نہیں تھا بلکہ ایک مخصوص طرز استدلال کا بتانا اور سامعین کو خود اپنے آزادانہ خیال کو عمل میں لانے پر برانگیختہ کرنا تھا۔ پس مروجہ خیالات اور مسلمہ تعلیمات کے متعلق خطیب کی تیز و تلخ اور بے رو رعایت نکتہ چینی کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے کیونکہ جو لوگ اسے جا بجا یکطرفہ سمجھتے ہوں گے وہ بھی شاید اس نکتہ چینی کے جوش افزا وصف سے انکار نکر سکیں گے میرا یہ مقصود نہیں ہے کہ سیلی کبھی کبھی مصنوعی طور پر اپنے خیالات کو چیستان کی شکل میں پیش کیا کرتے تھے۔ ایسا کرنا ان کی عادتی صداقت اور اُن کی بے مثل علمی فرض شناسی کے منافی ہوتا مگر جن مختلف مضامین پر وہ غور و خوض کرتے ہوتے تھے ان کے متعلق مجھ سے گاہ بگاہ مکالمات کی (جو ہمیشہ دلچسپ ہوتے تھے) جو نوبت آیا کرتی تھی، اس سے مجھے یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اس محال ظاہر کی صورت میں انھیں نفس حقیقت مل جایا کرتی تھی یہ کہ اس جدت پسند اور زود رس ذہانت سے جو نئے خیالات ترقی پاتے تھے ان میں بالکل از خود یہ طبعی میلان ہوتا تھا کہ وہ ایسی شکل اختیار کریں جو اس موضوع کے متعلق

عام اقتا و خیال کے مخالف ہو، اور یہ کہ اس تخالف کو مشروط و کم کرنے کے لئے بعد میں بالارادہ کوشش کی ضرورت پڑتی تھی ۔

ان خطبات میں جس عام رائے پر زور دینا اور اسے واضح کرنا چاہتے ہیں وہ ایک دورخہ مسئلہ ہے یعنی یہ کہ (۱) علم السیاست کے مطالعہ کا صحیح طریقہ اصلاً تاریخی طریقہ ہے اور (۲) سیاسی تاریخ کے مطالعہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کا مطالعہ علم السیاست کے مواد کے طور پر کیا جائے ۔ اس کے متعلق میرے خیال میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مصنف کے نہایت ہی عمیق اور نہایت ہی مستقل معتقدات میں سے ایک عقیدہ تھا ۔ وہ جب کیمبرج میں تاریخ کی معلمی پر فائز ہوئے تو اپنے افتتاحی خطبہ میں اسے بیان کیا اور جسقدر سال زیادہ گزرتے گئے اسیقدر یہ خیال زیادہ مستحکم اور زیادہ صاف ہوتا گیا اور باشقت مطالعہ نے ان کے معلومات کو وسعت دیدی اور نظم ممالک کے تاریخی ارتقا کے متعلق ان کی ذہنیقہ رسی غائر و عمیق ہوگئی ۔ درحقیقت انھوں نے ایک مرتبہ مجھسے یہ کہا تھا کہ ان کی کتاب "توسیع انگلستان" (Expansion of England) کو جو وسیع ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی ہے وہ اس کی قدر صرف ان اثرات ہی کیوجہ سے نہیں کرتے جن سے ان کے ملحوظ خاطر علمی مطالعہ کی ترقی کی توقع ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی اس کی کچھ کم قدر نہیں کرتے کہ یہ کتاب ان کے طریق کی ایک ترغیب دہ مثال ثابت ہوی ہے کیونکہ اس نے تمام شہنشاہی میں انگریزوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ یہ جاننے کے لئے کہ انگلستان کو اب کیا ہونا اور کیا کرنا چاہئے ان لوگوں کو یہ مطالعہ کرنا چاہئے کہ انگلستان پہلے کیا رہا ہے اور اس نے کیا کیا ہے ۔

آخر میں میں مسٹر جے ۔ اے ہمینڈ (رفیق ٹرینٹی کالج) کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کو طبع کے لئے تیار کرنے میں بے تکلف ونکدر مجھے مدد دی ۔ میں مسٹر جے ار ٹینر (رفیق سینٹ جانز کالج) کا بھی شکر گذار ہوں جن سے میں نے ساری کتاب میں تمام اہم لکارتر مشورہ کیا ہے اور جن کی صلاح و مشورت میرے لئے بہت کارآمد ثابت ہوی ہے ۔ مجھے بیگم سیلی کی اس مہربانی کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے کہ جہاں تک ممکن تھا انھوں نے میرے کام کو آسان بنایا اور پروف کی نظر ثانی میں مدد دی ۔

کیمبرج جنوری سنہ ۱۸۹۶ء

ایچ سیجوک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ اوّل

سولہ برس ہوئے کہ میں اس عہدے پر مقرر ہوا تھا۔اس وقت سے میرا طریقہ یہ رہا ہے کہ میں دو مضامین کا درس دیا کرتا ہوں جنھیں بالعموم ایک دوسرے سے بالکلیہ جداگانہ سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تو تاریخ خاص ہے اور دوسرا وہ مضمون ہے جسے ابتک ہمارے "ٹرائیپاس" کے نصاب میں فلسفہ سیاسیہ کہتے رہے ہیں اور اب یہ تجویز ہے کہ اسے "علم السیاست" کہیں مگر میں نے ان دونوں مضامین کی تعلیم میں ایک ہی سا طریقہ نہیں اختیار کیا ہے۔ تاریخ خاص کو میں باقاعدہ عام خطبات میں توضیح و تشریح کے ساتھ بیان کرتا ہوں اور "فلسفہ سیاسیہ" کی تعلیم جماعت مکالمہ کے ذریعہ سے دیتا ہوں۔

میرے لئے مکالمہ کے اس طریقہ کے اختیار کرنے کا باعث یہ ہوا کہ نصاب کی کوئی ایسی قابل اطمینان کتاب موجود نہ تھی جس کی جانب میں طلبہ کو رجوع کرنے کی ہدایت کر سکتا۔ درحقیقت میرا اعتقاد ہے کہ مکالماتی طریقہ ہمیشہ ایسے مضمون کی تعلیم کے لئے مفید ہوتا ہے جس میں صحیح تخیل اور اصطلاحات کے قطعی استعمال کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ طریقہ صرف مفید ہی نہیں ہے بلکہ جب مضمون موجودہ نوعیت کا ہو اور ہنوز نہ اس کی ضبط و ترتیب ہوئی ہو نہ باقاعدہ نصابی کتاب کی صورت میں اسے طلبہ کے سامنے پیش کیا گیا ہو تو میرے نزدیک مکالمہ کا یہ طریقہ لابدی ہو جاتا ہے۔
ہیں
علم السیاست کا تصور جیسا کچھ میرے ذہن میں ہے اس کے بموجب یہ علم اسی حالت

تھا۔ ارسطو کی "سیاسیات" وغیرہ کی ایسی کتابیں میرے خیال میں اس زمانہ کے طلبہ کے ضروریات کے حسب حال نہیں ہیں اور جو کتابیں کہ حال میں شایع ہوئے ہیں وہ یا تو مجھے قابل اطمینان نہیں معلوم ہوتے یا کسی نہ کسی وجہ سے وہ کیمبرج کے طلبہ کی دسترس سے باہر ہیں۔

لیکن مکالماتی طریقہ صرف چھوٹی جماعت کے لئے موزوں ہے اور بعض وجوہ ایسے بھی ہیں جن کی بنا پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گاہ بہ گاہ باقاعدہ خطبہ کی صورت میں بھی اس مضمون کی توضیح و تشریح کی جایا کرے۔ اگرچہ ادھر قریب تر زمانہ میں تو نہیں مگر پچھلے برسوں میں میں نے ایسا کیا ہے اور اس سال بھی میرا انشا یہی ہے مگر اس مرتبہ میں تجربہ کروں گا کہ ایک ہی مضمون پر مکالماتی جماعت میں مکالمے کے طریقے پر بھی گفتگو کروں اور اسی مضمون پر باضابطہ درس کے کمرے میں بھی بحث کروں پس اس سال میرے مکالماتی جماعت کا تعلق اس جماعت سے ایسا ہی ہوگا جیسا تعلق میرے رفقا کے فرائض منصبی کے دائرے میں امتحانی پرچہ جات اور مکالمہ کے ذریعہ کی انفرادی تعلیم کو ان کے عام خطبات سے ہوتا ہے۔

شاید میرے اس اعلان پر تم میں سے بعضوں کے دلوں میں ایک خیال گذرا ہوگا جسے اگر تم الفاظ میں ظاہر کرو تو یوں کہوگے کہ "خوب! آپ تاریخ کے پروفیسر ہیں اور پھر آپ فرماتے یہ ہیں کہ اس سال آپ تاریخ پر درس دینے کا مطلق ارادہ نہیں رکھتے بلکہ ایک دوسرے ہی مضمون علم السیاست یا فلسفۂ سیاسیہ پر کچھ ارشاد فرمانا چاہتے ہیں" لیکن اگر میں تمھاری جانب سے یہ اعتراض سنوں تو میں اسے قوی البنیان تسلیم نہ کروں گا۔ میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ بیشک میں علم السیاست پر درس دینا چاہتا ہوں مگر میں نے یہ کب کہا کہ میں تاریخ پر درس نہیں دوں گا؟ یہ صحیح ہے کہ اس سال میرا یہ ارادہ نہیں ہے کہ کوئی خاص عہد منتخب کروں اور اس عہد میں جو واقعات پیش آئے ہوں ان کی تحقیق و تفتیش کروں یا ان کی داستان سناؤں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ تاریخ پر درس دینے کا ہوگا مگر اس کا ایک دوسرا طریقہ بھی ہے اور میری رائے میں علم السیاست پر درس دینا تاریخ پر درس دینے کے مرادف ہے۔

یہی وہ تناقص (چیستاں) ہے جس کی نسبت میں کئی برس سے یہ کوشش کر رہا ہوں

کہ اسے ان طلبہ کے ذہن نشین کراؤں جو اس جامعہ میں تاریخ کی تعلیم شروع کرنا چاہتے ہوں (میں لفظ تناقض کو اس معنی میں استعمال کرتا ہوں کہ کوئی مسئلہ فی الواقع صحیح ہو مگر بظاہر غلط معلوم ہوتا ہو) جب میرے موضوع بحث کی نوعیت کی وجہ سے مجھے اس کا موقع نہیں ملتا تھا کہ میں اس بحث پر طویل گفتگو کروں اس وقت بھی میں یہ زحمت گوارا کرتا تھا کہ کم از کم ایک مرتبہ ابتدائی خطبہ میں اسے پوری طرح واضح کردوں، لیکن اس سلسلۂ درس میں جو علم السیاست کے لئے وقف ہے میں محض وضوح پر قناعت نہ کروں گا یہی میری بحث کا نقطۂ آغاز ہے جس طریق کے علم السیاست کی میں تمہارے سامنے توضیح وتشریح کرنا چاہتا ہوں اس کا پہلا کلیہ یہی ہے کہ یہ علم تاریخ سے ممیز نہیں بلکہ اس سے غیر منفک ہے۔ اسے تاریخ کا جزو کہنا محاورۂ زبان کی کسیقدر خلاف ورزی ہوگی مگر میں یہ کہنے کی جرات کرسکتا ہوں کہ علم السیاست کے بغیر تاریخ کا مطالعہ نامکمل وناقص ہے اور علی ہذا تاریخ کے بغیر سیاسیات بے مغز ہے۔ ایک شعر میں یوں کہئے ؎

بے اثر علم السیاست ہے بجز تاریخ کے
بے ثمر تاریخ ہے علم السیاست کے بغیر

اسی کلیئے کی صحت کا ثابت کرنا موجودہ خطبہ کا مقصد ہوگا۔ اس امر کے ظاہر کرنے کے لئے مجھے کسی طویل تمہید کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو نہایت اہم ہے۔ عام طور پر تاریخ کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا تعلق محض واقعات سے ہے۔ پس صاف عیاں ہے کہ اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ تاریخ سے جو واقعات ثابت ہوتے ہیں وہ مواد خام تھے جن سے آیندہ ایک علم بننے والا تھا تو پھر حالت بالکلیہ بدل جائیگی۔ اس قسم کی رائے ایک طرف تو تاریخی تحقیق وتدقیق میں بہت ہی نمایاں قسم کی دلچسپی پیدا کردیگی اور دوسری طرف غالباً تمہارا یہ خیال ہوگا کہ اس سے بڑی حد تک تاریخ کی وہ خاص دلفریبی زایل ہوجائیگی جو ابتک اس کا حصۂ خاص رہی ہے۔ اس وقت تک تاریخ کے مطالعہ میں فراغت و دلبستگی کی ایک خوش کیف حالت پائی جاتی تھی اس میں فسانہ کا جدت وشاعری کا خوشگوار ذایقہ موجود تھا مگر افسوس کہ اب اس کے بجائے ہم علم کا کرخت، دتلخ وبے مزہ ذایقہ محسوس کریں گے۔ آیا اس نفع سے اس نقصان کی تلافی پوری پوری ہوجائے گی یا نہیں یہ ایک مزید سوال ہے۔ بہرحال اس مطالعہ میں جو انقلاب پیدا ہوگا

وہ اہمیت سے خالی نہو گا اور تمھارے لئے جو اس مطالعہ کی دہلیز پر قدم رکھنا چاہتے ہو یہ نہایت اہم ہے کہ تم یہ فیصلہ کر لو کہ تم کس خیال کے ساتھ اس مطالعہ میں مشغول ہونا چاہتے ہو۔

مجھے یقین ہے کہ تاریخ کے متعلق تم نے ہمیشہ ہی سنا ہو گا کہ اس کا مطالعہ غور طلب ہے لیکن مطالعہ تاریخ کسقدر مسرت انگیز ہے ممکن ہے کہ اس خیال کا اظہار نسبۃً کثرت سے ہوتا ہو کیونکہ اول الذکر خیال پوری طرح نمایاں نہیں ہے۔ یہ کہ دنیا میں جو عظیم الشان واقعات پیش آئے ہیں ان کا علم بالضرور نہایت درجہ سودمند سبق آموز ہو گا اسے کھلے ہوئے الفاظ میں شاید اس وجہ سے بہت ہی کم بیان کیا جاتا ہے کہ شاید ہی کبھی اس سے انکار یا اس میں شک کیا جاتا ہو، پس یہ عیاں ہے کہ ہم تاریخی واقعات کی ہو بہو تحقیق خود ان واقعات کی غرض سے نہیں کرتے۔ ہمارا دعوے یہ ہوتا ہے کہ ان واقعات کا علم سودمند ہے۔ یعنی یہ علم کسی غایت کا وسیلہ ہے مگر سوال یہ ہے کہ کس طریق پر سودمند ہے؟ جواب یہ ملیگا کہ سیکڑوں طریق پر لیکن جب ہم زیادہ قطعی جواب پر زور دیں گے تو ہمیں یہ معلوم ہو گا کہ تاریخ کی سودمندی کی کم و بیش فوری بنا اس اصول پر ہے کہ جو امر ایک مرتبہ واقع ہوا ہے وہ دوبارہ بھی واقع ہو سکتا ہے انسانی معاملات میں ایک طرح کا انضباط ہوتا ہے۔ ایک ہی سے اسباب سے ہمیشہ زیادہ تر ایک ہی نتائج پیدا ہوں گے پس ظاہر ہے کہ جو شخص دانشمند بننا چاہتا ہے اس کے لئے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ وہ بنی نوع انسان کے گزشتہ تجربات کی تحقیق یا بالفاظ دیگر یہ کہ تاریخ کا مطالعہ کرے کیونکہ دانشمندی اسی کا نام ہے کہ اسباب و نتائج کے تعلق کو سمجھا جائے۔

یہ استدلال بجائے خود بہت صاف ہے مگر میں تم سے جس امر کے ملحوظ رکھنے کا خواہاں ہوں وہ یہ ہے کہ اس کا اعلان کسی نہج سے وہیں تک محدود نہیں ہے جسے ہم خاص طور پر تاریخ کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا بنیادی استدلال ہے جو تمام علم پر منطبق ہوتا ہے جو علم کو ایک مفید و لابدی شے بنا دیتا اور دانائے قدیم کے اس مقولہ کو صحیح ثابت کرتا ہے کہ "دانائی اصل شے ہے پس دانائی حاصل کر اور اپنے جملہ اصول کے ساتھ فہم و ادراک بھی حاصل کر"۔ ہم ایک ایسے عالم میں رہتے ہیں جو منضبط قوانین کے موافق

چلتا ہے۔ ایک ہی اسباب ایک ہی نتائج پیدا کرتے ہیں اس لئے اگر ہم صراط مستقیم پر چلنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم جو کچھ مشاہدہ کریں اس کا اندراج کریں پھر اپنے مشاہدات کا باہم مقابلہ کر کے ان سے نتائج عام اخذ کریں اس سے ہمیں عمومی قوانین ہاتھ آئینگے اور اس طرح ہمیں گزشتہ کے علم سے آیندہ کے علم کی طرف رہبری ہوگی۔

میں اس موقع پر تصورات باطنی، صداقت ہائے استدلال، صداقت ہائے ارادی اور ان کے مثل دیگر مختلف فیہ مسائل میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اتنا کافی ہے کہ ہمارے علم کا حصۂ کثیر استدلالی ہے یعنی مشاہدۂ واقعات پر مبنی ہے پس اگر ہم تاریخ کا مفہوم یہ قرار دیں کہ جو کچھ واقع ہوا ہے تاریخ اس کا "مجموعہ" ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علم کا حصۂ کثیر تاریخ پر مبنی ہے۔ اس سے بحث نہیں ہے کہ تم کس استدلالی علم کو منتخب کرتے ہو۔ کسی علم کو منتخب کرو، اس کے نتائج تاریخ ہی پر مبنی پائے جائینگے۔ ہیئت کے متعلق ہمارے علم کی بنیاد ان واقعات پر ہے جنھیں کسی خاص وقت و محل پر کسی نہ کسی ہیئت داں نے افلاک پر واقع ہوتے دیکھا تھا۔ قوانین حیات کے متعلق تمہارا علم اگرچہ اب ایک عام صورت اختیار کر لے مگر اس کی بنیاد انجام کار میں کسی نہ کسی نبات یا حیوان کی تاریخ کے ان واقعات پر مبنی ہوگی جنھیں کسی عالم الحیات یعنی مورخ طبعی نے درج کیا ہوگا۔

لیکن رفتہ رفتہ یہ عادت پیدا ہو گئی ہے کہ تاریخ کے لفظ کو واقعات کے ایک خاص نوع کے "مجموعہ" کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے مگر یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس لفظ کو اس طرح مخصوص کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ابتداءً ایسا تھا اور نیز یہ کہ فی الجملہ تمام اقسام واقعات کا اندراج ایک ہی طریق پر اور ایک ہی مقصد سے ہوا کرتا ہے۔ ہم جس موقع پر علم طبعی کا لفظ استعمال کریں گے افلاطون اس موقع پر "تاریخ طبعی" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ پلینی نے حیرت انگیز اور عجیب و غریب طبعی واقعات کا جو عظیم الشان مجموعہ جمع کیا ہے وہ "تاریخ طبعی" کہلاتا ہے اور ابھی بالکل حال کے زمانہ تک یہ عام عادت تھی کہ حیوانیات کو "تاریخ طبعی" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اب یہ رواج ہو گیا ہے کہ جن کتابوں کو تاریخی کہا جاتا ہے ان میں سے واقعات کی بہت بڑی تعداد اس بنا پر خارج کر دی جاتی ہے کہ وہ زیادہ موزوں طور پر سائنس (علمیات) کی کتابوں میں درج ہو چکے ہیں، حالانکہ فی نفسہ یہ واقعات قابل یادگار ونادر ہوتے ہیں۔ ہم

انگلستان کی کسی تاریخ میں علم الجو یا حیاتیات کے ان مظاہر قدرت کے اندراج کی جستجو نہیں کرتے جو انگلستان میں واقع ہوئے ہوں۔ ہم یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ اس قسم کے واقعات کا تعلق تاریخ سے نہیں ہے اور اگر تاریخ واقعات کا اندراج اس غرض سے کرتی ہے کہ ان سے قوانین کا پتہ چلے اور اس طرح انسان کی زندگی کی رہبری ہو تو اسے بالیقین ان واقعات کو بھی درج کرنا چاہیے کیونکہ یہ قطعی ہے کہ اس قسم کے واقعات نے علم طبعی میں بہت عظیم الشان انکشافات کی جانب رہبری کی ہے اور تاریخ کے عہد طفولیت میں اس قسم کے واقعات نے بڑی جگہیں لی ہیں۔ لیوی کی ابتدائی کتابوں میں جہاں اس نے اپنی حد رسائی کے اندر نہایت ہی قدیم وسائل سے استفادہ کیا ہے اکثر ایسے ٹکڑے ملتے ہیں جن میں اس نے ان عجیب وغریب طبعی وقوعات کا خلاصہ دیا ہے جو کسی خاص سنہ میں مذکور ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ پری درنخم میں ایک بیل کو گفتگو کرتے سنا گیا یا یہ کہ کاریولی میں پانی کے بجائے خون برسا۔ یہ تو یقینی ہے کہ مشاہدۂ فطرت کے متعلق ان ابتدائی وقایع نگاروں کی بہ نسبت ہماری استعجاب آمیز جستجو میں کسی طرح کمی نہیں آئی ہے بلکہ بے انتہا زیادتی ہوگئی ہے۔ ہم ان کی سادہ دلی پر ہنسیں گے مگر ہم اس معاملے میں نہایت ہی صدق دل سے ان کی وقعت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے خیال کے موافق جن واقعات طبعیہ کا عالم شہود میں آنا متصور کیا انھیں درج کر دیا، پس اب سوال یہ ہے کہ زمانۂ جدید کے مورخ اس قسم کے واقعات کے اندراج سے باز کیوں رہتے ہیں؟

جواب صاف ہے۔ اس قسم کے واقعات کی چھان بین ان کا اندراج اب جس احتیاط سے ہوتا ہے قدیم زمانہ میں اس کا کہیں نام ونشان بھی نہیں تھا مگر یہ اندراج مورخین کے ہاتھوں سے نہیں ہوتا۔ دنیا میں جو مظاہر قدرت واقع ہوتے ہیں وہ مختلف اصناف میں تقسیم کر دئے گئے ہیں اور ہر صنف کے لئے تحقیقات کرنیوالوں اور روایت کرنیوالوں کی ایک خاص جماعت مختص کر دی گئی ہے۔ جس قسم کے واقعات کی میں نے ابھی ابھی مثال دی ہے ان میں سے ایک عالم جویات اور دوسرا عالم حیاتیات کے حصہ میں آئے گا۔ عادت ودستور کے اس طریقہ کے ساتھ ساتھ الفاظ ”تاریخ“ و ”تاریخی“ کے باب میں بھی ایک خاص تبدل پیدا ہو گیا ہے

یہ واقعات جو ابتداً تاریخی یا تاریخ سے تعلق رکھنے والے سمجھے جاتے تھے وہ صحیح معنوں میں اس وجہ سے تاریخ سے خارج نہیں ہو جاتے کہ اب وہ ایک خاص عنوان کے تحت میں ماہرین کی جماعت کے ہاتھوں سے مندرج ہوتے ہیں اور پھر بھی ہم انھیں تاریخی نہیں کہتے۔ ہم اب انھیں اس علم کے نام کے ساتھ معنون کرتے ہیں جو ان سے بحث کرتا ہے۔ ان کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ تاریخ کی حد سے نکل گئے ہیں اور سائنس (حکمیات) نے انھیں اپنے حیطۂ اقتدار میں لے لیا ہے۔ ہم اب ان کا ذکر جویاتی یا حیاتیاتی واقعات کے طور پر کرتے ہیں اور اس حیثیت سے ان کا ذکر نہیں کرتے کہ وہ تاریخی واقعات ہیں جن کا تعلق علم الجویا علم الحیات سے ہے۔

پس تاریخ کا لفظ اب جس طرح استعمال ہوتا ہے وہ اس ماقبی حصے کا نام ہے جو ایک ایک کرکے مجموعۂ واقعات پر کسی نہ کسی "علم" کے قبضہ کر لینے کے بعد باقی رہ گیا ہے۔ ہم اب یہ خیال کرنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ تاریخ میں ان واقعات کا اندراج ہوتا ہے جن کا واسطہ نوع انسان سے ہے اور سرسری طور پر یہ صحیح ہے مگر یہ صحیح صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم جس شے کو "علم طبعی" کہتے ہیں اسے انسان سے متعلقہ علوم کی بہ نسبت جلد تر کامیابی ہو گئی اور اس نے ان علوم سے پیشتر خود کو استقرائی بنیاد پر قایم کر لیا۔ اب بھی انسان سے متعلق کثیر التعداد واقعات ایسے ہیں جن کی نسبت ہم یہ خیال نہیں کرتے کہ وہ مورخ کے حدود کے اندر داخل ہیں مثلاً عضویات اور علم تشخیص الامراض کے مسائل اسی زمرے میں ہیں۔ ہم کسی مرض کے واقعات کے متعلق کسی مورخ سے اطلاع کے متوقع نہیں ہوتے بجز اس کے کوئی دبا ایسی وسعت کے ساتھ پھیل جائے کہ اس سے معاشری و سیاسی اثرات رونما ہو جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عضویات اور علم تشخیص الامراض نے انسان سے متعلقہ بعض اقسام واقعات پر کامیابی سے قبضہ جما لیا ہے۔ ان کے علاوہ اور دوسرے علوم دوسرے نوامیس انسانی کو اپنے ساتھ مختص کرتے جاتے ہیں۔ اب فرض کرو کہ یہ علوم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر میں تاریخ یعنی "تاریخ عام" یا تاریخ حقیقی یا تاریخ خالص ومحض کا

کیا حشر ہوگا[1]۔ جب انسان سے متعلق ہر ایک جدید علم اپنے لئے ایک قطعہ علیحدہ کرے گا تو پھر کیا آخر میں یہ باقی حصہ بالکلیہ غایب نہ ہو جائے گا؟ اقتصادیات صنعت وحرفت کے مسائل سے بحث کر رہی ہے۔ اصول" قانون" قانون کے مسائل کو زیر بحث لا رہا ہے اس وقت بھی مورخ محسوس کرنے لگے ہیں کہ (مثلاً) مسائل اقتصادیات پر انہیں ایجاز و اختصار سے کام لینا چاہئے کیونکہ وہ اپنے ناظرین کو مبسوط اطلاع کے لئے اقتصادیات کی مستند کتابوں کا حوالہ دے سکتے ہیں۔ یہ خیال کرنا بالکل ہی قرین قیاس ہے کہ یہ تمام علوم بہت سرعت کے ساتھ ترقی کر جائینگے پس کیا جلد تر ایک دن ایسا نہ آجائیگا جب تقریباً ہر ایک مضمون کے متعلق مورخ کسی ایسے امام فن کی طرف رجوع کریگا اشارہ کر سکیگا جس نے مورخ کو جزوی تصریحات کی زحمت سے بچا دیا ہو یعنی حقیقت میں اس نے اس داستان کو خود مورخ سے بہتر طریق پر بیان کر دیا ہو۔ جب یہ دن آجائے گا تو پھر سوال یہ ہے کہ آیا یہ دن اس دوسرے دن کا پیشرو نہ سمجھا جائیگا جب مورخ اپنے کو بالکل ایک مد زائد سمجھنے لگیگا۔ جب ہم انسانی تاریخ کا نام زبان پر لانا اسی طرح ترک کر دیں گے جیسے ہم نے طبعی تاریخ کا نام ترک کر دیا ہے۔ اُسوقت وہی پرانا قصہ گویا پھر دوہرایا جائے گا اور حکمیات (سائنس) کے دائرے میں تاریخ کا علم بھی ضم ہو جائے گا۔

اس وقت قدیم اور حد درجہ طویل داستان کا خاتمہ ہو چکے گا اور تاریخ سائنس

[1] تاریخ کے دو مختلف اقسام میں فرق کرنا ضروری ہے جن میں سے ایک کو تاریخ خاص اور دوسرے کو تاریخ علم کہہ سکتے ہیں انسان کے عمل کے اندر شاید کوئی شاخ بھی ایسی نہیں ہے جسے مخصوص مفہوم میں تاریخ کا موضوع نہ بنایا جا سکے۔ ہمارے پاس علوم، فنون، ایجادات، انکشافات سب کی تاریخیں موجود ہیں ہم خود تاریخ کی تاریخ بھی بخوبی بنا سکتے ہیں۔ تاریخ کی اس مخصوص نوع کی کوئی انتہا نہیں ہے، نہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے یا یہ کہ اس سے نہایت ہی اہم نتائج نہیں پیدا ہو سکتے پھر بھی اس قسم کی تاریخ کو کوئی شخص محض تاریخ کے نام سے یاد نہیں کرتا۔ تاریخ حقیقی سے مراد تاریخ علم ہوتی ہے۔ تم بہت اچھی طرح یہ جانتے ہو کہ میں علم تاریخ کی حیثیت سے یہ اعلان نہیں کر سکتا کہ میں فن کشتی کی تصویر کشی تاریخ پر خطبات کا سلسلہ جاری کروں گا۔

(ماخوذ از خطبہ اول ۱۸۹۱ء)

(حکمیات) میں ہضم ہو جائے گی۔ میں جب تاریخ کے اس طرح فنا ہو جانے کی تصویر کھینچتا ہوں تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ میری اوصرف اس تاریخ سے ہے جس کے مطالعہ کے لئے رقت طلبی اور بالغ نظری کی ضرورت سمجھی جاتی ہے یعنی جسے سن رسیدہ اشخاص مطالعہ کرتے ہیں بعض مصنفین نے حال میں یہ اعتراض کیا ہے کہ تاریخ کو کسی قسم کے سائنس (حکمیات) سے کسی حیثیت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس لئے سائنس کی جسقدر ترقی بھی ذہن میں آسکتی ہے اس کا کوئی اثر تاریخ پر نہیں پڑتا کلیو ایک میوز ہے یعنی انسان کو جلیل القدر افعال اور عظیم الشان واقعات سے ایک طبعی مسرت ہوتی ہے اور تاریخ صرف اسی مسرت کا ایک طبعی اظہار علمی ہے۔ اس رائے کے مطابق مورخ صرف ایک فصیح البیان وہمدرد داستان گو ہے اور جبتک لوگوں میں احساس ومسرت کی کیفیتیں باقی رہیں گی وہ اپنا فرض ادا کرتا رہے گا شاعری کے مانند تاریخ بھی اسوقت تک باقی رہے گی جب تک بنی نوع انسان کا وجود دنیا میں ہے۔ ان معترضین میں سے مسٹر برل نے از راہ عزت افزائی مجھے خاص طور پر اپنے سہام اعتراض کا ہدف بنایا ہے۔

میں اس امر کو زیر بحث لانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا اور مجھ سے یہ بہت بعید ہے کہ میں ادب وشاعری کی قدر وقیمت کو گھٹا کر دکھاؤں۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ لوگوں کو مشہور واقعات کے دلچسپ بیانات سے ہمیشہ مسرت ہوتی رہے گی مگر میرا خیال یہ ہے کہ محض ادب کی ایک شاخ کی حیثیت سے بھی تاریخ کو بلند درجہ نہیں حاصل ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ زمانۂ قدیم کے جلیل القدر مورخین کی ثنا وصفت ان کی صداقت اور غایر نظری کی وجہ سے ہے یعنی نفس الامر میں یہ لوگ ایک طرف ادیب تھے اور دوسری طرف اہل حکمیات سے تھے۔ میں نے جس ارتقا کی توضیح کی ہے وہ انہیں موخرالذکر وصف سے محروم کر دے گا اور صرف مقدم الذکر وصف ان میں باقی رکھے گا۔ اگر ماہران خصوصی ان کے کام کا تمام اہم حصہ یعنی تحقیق وتصحیح کا کام ان کے ہاتھ سے نکال لیں اور سوائے داستان گوئی میں جوہر فصاحت دکھانے کے اور کوئی کام ان کے پاس باقی نہ چھوڑیں تو ان کی اہمیت بہت ہی گھٹ جائے گی۔ ان کی تصانیف میں کوئی وزن دار اطلاع ایسی باقی نہ رہے گی جو ماہران خصوص کی تصانیف میں زیادہ وسعت وقطعیت کے ساتھ نہ پائی جاتی ہو اور ادبی صنعت گری کی حیثیت میں

وہ قافیہ سنجوں اور فسانہ نویسوں کے مقابلہ میں بہت گھاٹے میں رہیں گے کیونکہ وہ طبعزاد مضامین پیدا کرنے اور انھیں زیب و زینت دینے کے مجاز نہوں گے۔ وہ سختی کے ساتھ واقعات کی زنجیروں میں جکڑے ہوں گے اور یہ ایسی حالت نہیں ہے جس میں جودت صناعی اپنا جوہر دکھا سکے۔ وہ محض نگارندگان عام پسند ہوں گے اور ان کی داستانوں کی طلب زیادہ تر نوجوانوں میں ہوگی۔ تاریخ کا مفہوم جب یہ ہو تو پھر یہ یقین ہے کہ کسی جامعہ میں اسے کوئی جگہ نہ ملے گی تاہم مجھے برکل صاحب سے اس امر میں اتفاق کامل ہے کہ قدیم طرز کی تاریخ علم ادب کی کسی قدر پست تر شاخ کی حیثیت سے غالباً ہمیشہ برقرار رہے گی۔

اس وقت دانائی کی معلم اعظم مدبروں کی ہادی اکبر تاریخ کا خیال میرے پیش نظر ہے اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے دائرے میں جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ بھی وہی راہ اختیار کرنے والا ہے جو اس کے دیگر حصص اختیار کر چکے ہیں اور اب وہ وقت دور نہیں ہے کہ کوئی سائنس ان واقعات پر قابض ہو جائے جو اب تک مورخ کی غیر متنازعہ ملک ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی میرا خیال یہ بھی ہے کہ تغیر اتنا وسیع نہیں ہوگا جتنا خیال کیا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ واقعات کا جو مجموعہ اب باقی رہ گیا ہے وہ آہستہ آہستہ غائب نہیں ہوگا نہ وہ متعدد علموں میں منقسم ہوگا بلکہ وہ کل کا کل ایک واحد علم کی ملک ہو جائے گا۔ وہ علم کونسا ہے؟ یہی علم السیاست۔

اب تم سمجھے ہوگے کہ میرے اس کہنے کا مطلب کیا تھا کہ علم السیاست پر درس دینا تاریخ پر درس دینا ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ مدت دراز سے ایک علم غیر محسوس طور پر تاریخ کے پہلو بہپلو نشو و نما پا رہا تھا اور ہر شخص نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اسے تاریخ کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق ہے اور اسے اپنے مواد کا بہت بڑا حصہ تاریخ سے لینا ہے۔ یہی علم علم السیاست ہے۔ دوسری طرف خود تاریخ کے حدود کے اندر روز بروز یہ محسوس ہوتا جاتا تھا کہ واقعات کے اجتماع سے ایک علم کے امکان کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ اگر ایسے تعمیمات ممکن نہیں ہیں جن سے ان واقعات کو ترتیب میں لایا جا سکے تو پھر ان کا نفع ہی کیا ہے مگر اس تمام دوران میں یہ امر نظر انداز ہوتا رہا کہ مورخین جس علم کے لئے صدائیں بلند کر رہے تھے وہ

وہی علم تھا جو خود تاریخ سے اسقدر قریب واقع تھا۔

اب میں تمہیں زیادہ وضوح کے ساتھ بتاوں گا کہ علم السیاست سے میری مراد کیا ہے۔

ہم اس امر سے آغاز کرتے ہیں کہ انسان ایک مدنی الطبع یا جماعت پسند حیوان ہے مگر ہم انسان کی مدنیت پسندی محض سے بحث نہیں کرتے بلکہ اس سے متعلق صرف ایک مظہر خاص سے بحث کرتے ہیں کیونکہ انسان کی مدنیت پسندی کی متعدد ہئیتیں ہیں اور ان سے متعدد علوم وجود میں آتے ہیں۔ مثلاً لسانیات و معاشیات وغیرہ مظہر زیر بحث یہ ہے کہ دیگر حیوانات کیطرح انسان بھی بالطبع خاندانوں میں باہم متحد ہوتا ہے اور یہیں یہ دیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ انسان کا خاندانی رابطہ دوسرے پست درجہ حیوانات کی بہ نسبت زیادہ مضبوط اور اس کا خاندانی نظم کسی قدر زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے مگر اس کے سواہم کچھ اور بھی مشاہدہ کرتے ہیں اور جب ہم اس شے زائد پر فلسفیانہ نظر سے غور کرتے ہیں یعنی اس کے تصور کے وقت یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم خود زندگی بھر اس سے مانوس نہیں ہوئے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت ہی حیرت انگیز اور غیر متوقع شے ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خاندانی رابطہ اتحاد کے علاوہ انسان میں ایک اور رابطۂ اتحاد اور ایک دوسری بلند تر تنظیم بھی موجود ہے

فطرت میں انقطاع تسلسل بہت کم واقع ہوتا ہے اور اس لئے یہ اعلیٰ نظم شاذ و نادر ہی خاندان کے نظم سے ممیز معلوم ہوتا ہے اور بعض وقت تو اس کی توضیح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ قطعاً خاندانی نظم سے ممیز نہ معلوم ہو لیکن علی العموم یہ خاندانی نظم سے ایک معقول حد تک ممیز ہوتا ہے۔ تقریباً تمام ہی جگہ اور تمام ہی حالات میں جہاں کوئی انسان مل سکتا ہے اگر تم اس سے سوال کرو تو تمہیں یہ پتہ چلے گا کہ وہ خود کو کسی بڑی جماعت سے متعلق سمجھتا ہے جو اس پر فرایض عائد کرتی اور اسے حقوق عطا کرتی ہے ہر شخص کا ایک نام ہوتا ہے جو خود اس سے مخصوص ہوتا ہے اور ایک دوسرا نام ہوتا ہے جس میں وہ اپنے خاندان کے دوسرے ارکان کے ساتھ شریک ہوتا ہے لیکن اگر تم اس کی حالت کی توضیح کرو اور کافی طور پر اس کے اصناف قرار دو تو تمہیں اس کے

قرار پاتے ہیں کیونکہ یہاں انسانوں کی صف بندی مملکتوں کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ مملکتوں کے اعتبار سے بنی نوع انسان کی تقسیم وسیع اہمیت رکھتی ہے اولاً اس وجہ سے کہ اس میں ہمہ گیر وصف موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ تقسیم نہایت پائدار اور اہم نتائج سے مملو ہے اس موقع پر جب میں ہمہ گیر کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ لفظ مملکت کے جو معنی لئے جاتے ہیں اسے میں ایک بڑی حد تک وسعت دے رہا ہوں۔ اس لفظ کے یونانی و رومانی یا یورپی مفہوم میں مملکت کسی حیثیت سے نہ ہمہ گیر ہوئی ہے اور نہ ہے بلکہ اس کے برعکس مملکت بنی نوع انسان میں گو نہ نادرات سے ہے لیکن ہمیں کسی ایسے لفظ کی ضرورت ہے جو اس وسیع جماعت پر دلالت کرتی ہو جو خاندان سے وسیع تر ہو اور پھر بھی علی العموم خاندان ہی سے تعلق رکھتی ہو خواہ اسکی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو اور اس مقصد کے پورا کرنے کے لئے صرف یہی ایک لفظ مملکت ہے۔ بعض وقت اسے قبیلہ یا شعب کہنا بعض وقت ملت یا مذہب کہنا زیادہ مناسب ہوگا مگر ہم اسے جو کچھ چاہیں کہیں یہ مظہر نہایت درجہ ہمہ گیر ہے تقریباً ہر جگہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی وسیع جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔

لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مملکت سے ان کا تعلق حیات و ممات کا تعلق ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ضرورت کے وقت یہ جماعت ان سے غیر محدود مطالبات کر سکتی ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اگر ان سے چاہا جائے تو وہ اس کے لئے جان دیدینے کے پابند ہیں۔

لہٰذا ان جماعتوں کے وجود سے نہایت دلچسپ یادگار زمانہ نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اول تو خود ان جماعتوں کا نشو و نما، ان کا ارتقا، ان کا مختلف صورتیں اختیار کرنا اور ان کا مختلف ہیئتوں سے ہو کر گزرنا ہی ایک دلچسپ امر ہے۔ اس کے بعد ان جماعتوں کا ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل، ان کی باہمی لڑائیاں، ان کے معاہدات، اور فتح و اتحاد کے تمام مظاہر ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ غیر متناہی اثرات ہیں جو اس قسم کی کسی جماعت سے تعلق رکھنے سے افراد پر پڑتے ہیں اور جنھیں ہم مجموعۃً ایک لفظ "تمدن" سے ظاہر کرتے ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ یہاں قیاسات کے لئے تقریباً لامحدود میدان پڑا ہوا ہے کیونکہ اس میں کم و بیش وہ سب کچھ داخل ہے جو انسان کی تاریخ میں یاد رکھنے کے قابل ہے

اور پھر یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس امر واقعہ کا کہ تقریباً ہر جگہ بنی نوع انسان کا تعلق مملکتوں سے ہے۔ پس انسان سے متعلق یہی مخصوص مظہر یعنی لفظ کے وسیع ترین مفہوم میں مملکت، علم السیاست کا موضوع ہے جو خاندان سے ممیز ہے مگر پھر بھی اس سے غیر متعلق نہیں ہے، قوم سے بھی ممیز ہے بعض وقت سرسری طور پر اس سے متحد و محدود بھی ہو جاتی ہے۔ اس مطلب کو یوں ادا کر سکتے ہیں کہ مملکت کی ممیز خصوصیت چونکہ یہ ہے کہ وہ اس انتظام یا تدبیر سے کام لیتی ہے جو حکومت کے نام سے موسوم ہے اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ علم حکومت سے اسی طرح بحث کرتا ہے جس طرح اقتصادیات دولت سے یا حیاتیات زندگی سے یا جبر و مقابلہ، اعداد سے یا ہندسہ، وسعت و مقدار سے بحث کرتا ہے۔

اس علم کا موضوع یہ ہے کہ یہ علم جن مسائل کو بحث کرتا ہے وہ بظاہر دو عنوانات کے تحت میں ترتیب پائیں گے اول وہ مسائل ہوں گے جو خود مملکت کی اندرونی ہیئت وارتقا سے پیش نظر ہوتے ہیں، یعنی جس طریق پر حکومت، مملکت میں داخل ہوتی ہے اور جس آلہ کے ذریعہ سے حکومت عمل کرتی ہے۔ اس کے بعد مملکتوں کے تفاعل باہمی کے مسائل پیش آئینگے، یعنی مملکت کا فعل خارجی کس طرح ہوتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان مسائل کو زیر بحث لانے کے لئے ہمارا طریق کار کیا ہوگا؟ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ علمی تحقیقات میں طریق کار پر کس قدر انحصار ہوتا ہے اور پھر خاصکر جب ہم انسانی مظاہر کی تحقیقات کریں تو اس میں اور بھی خصوصیت کے ساتھ دشواری پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اس موقع پر ہم اپنے اس میلان کو روکنے سے تقریباً مجبور ہو جاتے ہیں کہ جو ہونا چاہئے اور جو فی الواقع ہے ان دونوں کو ملا دیں۔ چونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ امر بدرجۂ اتم اہم ہے کہ ہمیں اپنے سیاسی افعال میں صحیح راستہ پر چلنا چاہئے اس لئے ہم اس خیال کی طرف مائل ہو جاتے ہیں کہ علم السیاست اگر کسی مصرف کا علم ہو سکتا ہے تو اسی طرح کہ وہ ہمیں یہ بتائے کہ صحیح طریقہ کیا ہے اور اس سابق الوجود رجحان قویہ کی وجہ سے ہم اس تحقیقات کی طرف یہی خیال لئے ہوئے متوجہ ہوتے ہیں کہ صواب کیا ہے اور خطا کیا ہے اگر ہم اس طریقے سے ابتدا کرینگے تو ہم اپنا مطمح نظر یہ بنا لینگے کہ ہم مثالی یا تصوری مملکت کا پتا چلائیں۔ ہمارا پہلا کام یہ ہوگا کہ ہم یہ سوال کریں کہ مملکت کا وجود کس غرض سے ہے اور اسے اپنے حد اطمینان تک متعین کر کے ہم آگے بڑھ کر یہ تحقیقات

کریں گے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے کون سے ادارات، قوانین اور دساتیر بہترین طور پر موزوں واقع ہوئے ہیں. علم السیاست پر بحث کرنے کا یہ وہی پرانا طریقہ ہے جس کی مثالیں افلاطون وارسطو ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں۔

لیکن ہم اس سے ایک بالکل ہی مختلف طریقہ بھی اختیار کر سکتے اور مملکتوں کے متعلق اس طرح بحث کر سکتے ہیں گویا ان کی نشو ونما بالکل فطری ہے گویا وہ بعینہ درخت یا حیوان ہیں۔ وہ جس حال میں ہوں ہم اس حال میں انھیں خارج سے دیکھیں اور جو کچھ دیکھیں اس کا بے لوثی سے اندراج کریں، گویا ہمیں خود ان سے کوئی ذاتی تعلق نہیں ہے۔ میں نے جس طریق کو ابھی ابھی اوپر بیان کیا ہے ماہر طبیعیات اس طریق پر نہیں چلتا ہے۔ اشجار پر غور کرتے وقت وہ یہ سوال نہیں کرتا کہ اس شجر کا وجود کس ضرورت سے ہے اور پھر اس کے بعد یہ نتیجہ نہیں نکالتا کہ مکمل درخت کے خصوصیات کیا ہونے چاہئیں بلکہ وہ تو اتنا بھی اظہار نہیں کرنا چاہتا کہ آیا وہ یہ جانتا ہے یا نہیں کہ اشجار کا کوئی مقصد بھی ہے یا نہیں اور یہ تو یقینی ہے کہ وہ اس فیصلہ کا دعوے نہیں کرتا کہ ایک شجر دوسرے شجر سے بہتر ہے۔ اسے خطا وصواب کے صفات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اسی پر قناعت کرتا ہے کہ (۱) جن اشجار کا وہ مشاہدہ کرے ان کے اصناف قائم کر دے (۲) اشجار کی ساخت کا تجزیہ کر دے اور ان کے مختلف اعضا کے فرائض کو ایک دوسرے سے ممیز کر دے۔ (۳) ان کے نمو وارتقا کا پتہ چلائے اور جن اثرات کا ان پر مضر اثر پڑتا ہو ان کو قلمبند کر دے (۴) اشجار کے مختلف انواع کے آغاز پر اور نباتی زندگی کی مجموعی کیفیت پر غور کرے۔

اب میرا خیال ہے کہ تم معاً یہ سمجھ گئے ہو گے کہ مملکتوں کا مطالعہ بھی بعینہ اسی صورت سے ممکن ہے۔ ان مملکتوں کے بھی اصناف قرار دئے جا سکتے ہیں۔ مملکتوں کے مختلف اعضا کا بیان ہو سکتا اور ان کے فرائض قلمبند کئے جا سکتے ہیں۔ نشو ونما کی ہیئتیں اور مضر حالات مملکت میں بھی پیش آتے ہیں اور نظریۂ ارتقا کا اطلاق مملکتوں پر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن تم یہ کہو گے کہ اس طریقے پر چلنا بہت ہی عجیب اور غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی مملکت محض فطری پیداوار نہیں ہے بلکہ وہ انسانی ارادہ اختراع اور طباعی کا نتیجہ ہے؛ اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی مملکتیں خطا وصواب کی صفت

کے تحت میں آتی ہیں بعض ادارات اور بعض قوانین اچھے ہوتے ہیں اور بعض برے اگر ایسا نہ ہوتا تو سیاسیات کے متعلق ہم جو کچھ مشقتیں برداشت کرتے ہیں اور جس قدر اضطرابات میں مبتلا ہوتے ہیں سب عبث ہوتے) اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر تمامتر اہم مسئلہ یہ ہے کہ صواب کو خطا سے ممیز کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں جملہ تقسیم و تجزیہ غیر متعلق و غیر اہم ہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ مملکتیں ایک حد تک ارادی ترتیب و ترکیب کے نتائج یا ایک لفظ میں یہ کہ کلیں ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ محض کل نہیں ہیں۔ یہ ایک سیاسی مسلمہ ہوگیا ہے کہ مملکتیں بنائی نہیں جاتیں بلکہ خود نمو حاصل کرتی ہیں۔ ان کی اصل فطرت انسانی کے ادراک کے غیر آزاد حصہ میں پیوست ہوتی ہے اور اس لئے اگرچہ ان پر بالکلیہ فطری پیداوار کی حیثیت سے بحث نہ کرنا چاہئے پھر بھی اس حیثیت سے اُن پر بحث ہونا چاہئے۔

علاوہ بریں، فکر و خیال کے تقریباً ہر شعبہ میں تجربہ نے ہمیں زاید از ضرورت تعجیل اور جن مسائل کا حل کرنا عملاً اشد ضروری ہو ان پر حد سے زیادہ راست و پرازشوق ایراد کے خطرے سے آگاہ کردیا ہے چنانچہ ادویات کے اولین ارباب نظر اکسیر اعظم کے خواہاں تھے اور اولیں کیمیادان ہر شے کو سونا بنا لینا چاہتے تھے۔ ہم جب علم السیاست سے متعلق زمانۂ جدید کے اولین مقالات پر نظر کرتے ہیں یعنی معاہدۂ ابتدائی کے نظریات اور ابویت کے نظریے کو دیکھتے ہیں تو بعینہ اسی قسم کی نمایاں مثالیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ بہرحال یہ جو کچھ ہو میری فوری ضرورت کے لئے اتنا کافی ہے کہ ہم مملکتوں کو اسی طریق پر زیر بحث لا سکتے ہیں جس طریق سے اشجار و حیوانات پر بحث ہوتی ہے۔

اب ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ ہمارا یہ علم اگر اس روش کی پیروی کرے تو وہ کیا ہئیت اختیار کرے گا۔ اگر استقرائی طریق پر چلا جائے تو علم السیاست تاریخی واقعات کے اندر ہی زندہ و قایم رہے گا اور اسی کے اندر اپنی حرکت کو جاری رکھے گا۔ اس کا آغاز اس طرح ہوگا کہ وہ ان واقعات کو بہت ہی شفقت سے جمع کرنے اور انہیں غایت دقیقہ رسی کے ساتھ ترتیب دینے لگیگا کیونکہ اسے بشدت تمام اس خطرے کا ادراک ہوگا کہ وہ محض افواہ، فسانہ یا فریقانہ بیان کو ان واقعات سے مخلوط کر دے جنھیں سائنس تسلیم کر سکتا ہو۔

اس کا دوسرا کام یہ ہوگا کہ وہ سعی کرے گا کہ اس طرح پر جو واقعات ہاتھ آئیں انہیں کسی سابق انخیالی نظریہ کا سہارا نہ لگا دے۔ اس قسم کے تمام نظریات کو وہ ایک طرف رکھدیگا اور دیانت داری کے ساتھ یہ دیکھنے کا منتظر رہیگا کہ خود ان واقعات سے بالطبع کیا نظریات برآمد ہوتے ہیں، اس مقصد کے حصول کے لئے وہ واقعات کی گروہ بندی اور تقسیم و ترتیب سے آغاز کرے گا، مثلاً جن واقعات کا اثر مملکتوں کے داخلی نشو و نما پر پڑتا ہے انھیں ایک جگہ رکھے گا اور جو واقعات اُن کے خارجی افعال میں ان کے تفاعل باہمی سے تعلق رکھتے ہیں، انھیں دوسرے زمرے میں رکھے گا۔ اس بحث کی پیچیدگی پر نظر کرتے ہوئے یہ امر کچھ قابل استعجاب نہ ہوگا کہ ترتیب و تقسیم کا یہ کام نہایت سنگلاخ و جانفرسا ثابت ہو جیسا کہ دوسرے علوم خاصکر نباتیات و حیوانیات میں ثابت ہو چکا ہے۔

مگر اس کے علاوہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ استقرائی علوم میں واقعات دو مختلف طریقوں سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ بعض صورتوں میں یہ واقعات تجربے سے حاصل ہوتے ہیں یعنی مشاہدہ کرنیوالا جن واقعات کو دیکھنا چاہتا ہے وہ انھیں مصنوعی طور پر پیدا کر لیتا ہے، مگر دوسری صورتیں ایسی بھی ہیں کہ واقعات کی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے اس قسم کا تجربہ غیر ممکن ہوتا ہے مثلاً علم کیمیا میں تجربہ ممکن ہے چنانچہ اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ کسی دو قسم کی مادی چیزوں میں کیا مماثلت ہے، تو ہم ان دونوں کو یکجا کر دیتے اور نتیجہ کا مشاہدہ کر لیتے ہیں مگر علم ہیئت میں تجربہ ناممکن ہے۔ آفتاب و ماہتاب ہمارے تابع فرمان نہیں ہیں۔ ہمیں ان کے حضور میں حاضر ہونا ہے وہ ہمارے حضور میں حاضر نہیں ہوں گے۔ پس علوم کی اس دوسری صنف میں چونکہ مشاہدہ ہی ایک ذریعہ ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ نہایت ہی محنت و توجہ کے ساتھ اس کی پیروی کی جائے۔ یہاں ہر امر کا انحصار واقعات کی کثیر فراہمی پر ہے جن کا مشاہدہ بہت غور و فکر کے ساتھ کیا گیا ہو اور قطعی صحت کے ساتھ ان کا اندراج ہوا ہو۔ اس موقع پر صرف واقعات نہیں بلکہ تاریخی واقعات کہنے چاہئیں۔ پس یہ رائے قایم کر کے کہ ہمارا علم السیاست استقرائی ہے، ہمیں اب یہ تحقیق کرنا ہے کہ آیا اس کا کام تجربہ سے چل سکتا ہے یا اسے مشاہدہ پر انحصار کرنا پڑیگا۔ یہاں معاً یہ عیاں ہو جائیگا

کہ اس اعتبار میں یہ علم کیمیا کے بہ نسبت ہیئت سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے مثلاً اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ کسی ملک میں دفعتاً عمومی ادارات کے رائج کر دینے سے کیا اثر مترتب ہوگا تو ہم یہ نہیں کر سکتے کہ ایک مملکت کو لے لیں، حسب حاجت ایک قانون اصلاح منظور کرا دیں اور پھر الگ کھڑے ہو کر اس کے نتائج کو دیکھتے رہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہ کہ جو مملکتیں ہمارے سامنے ہیں یا جو گزشتہ زمانہ سے اپنے حالات چھوڑ گئی ہیں ان کا مطالعہ کریں۔ صرف اسی طرح ہم ان واقعات کو حاصل کر سکتے ہیں جو ہمارے علم کے لئے شرط لازمی ہیں۔ ہیئت کے مانند علم السیاست کو بھی قابل اعتماد و مندرج واقعات کی کثیر مقدار کی ضرورت ہوگی مگر مملکت چاند سورج کی طرح محض ایک مادی مجموعہ نہیں ہے بلکہ مادی ہونے سے زیادہ اخلاقی ہے، وہ مجسماً آنکھ کو نظر نہیں آتی، نہ دوربین کے ذریعہ سے دکھائی دیتی ہے مملکت جو کچھ کرتی ہے وہ تمیری ذریعہ سے کرتی ہے یعنی دراصل وہ کام مملکت نہیں کرتی بلکہ کوئی نہ کوئی فرد کرتا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سا کام خفیہ طور پر ہوتا ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو کام انجام پاتا ہے بالارادہ اس کے غلط بیانات عوام کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں لہذا علم السیاست جن واقعات سے بحث کرتا ہے ان کی صحت دوسرے علوم کے واقعات کی بہ نسبت بہت زیادہ محنت طلب ہوتی ہے۔ بہت سے اور دوسرے اسباب بھی اس نتیجہ کے پیدا کرنے میں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں خاص کر یہ کہ ہمارے سامنے مشاہدات کا ایک وسیع انبار ہوتا ہے جنھیں مختلف مبصر ایک دوسرے سے بہت ہی مختلف اوقات میں قلمبند کرتے رہے ہیں اور یہ مشاہدات بھی بوجہ چند در چند صرف جزوی طور پر قابل اعتماد ہوتے ہیں۔ بعض مرتبہ مبصرین علمی نقطۂ نظر سے کام نہیں لیتے۔ بعض مرتبہ ان میں پہلے سے کوئی تعصب موجود ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ ان کے مشاہدات کسی سنجیدہ مقصد کے بجائے زیادہ تر دلچسپی کے لئے ہوتے ہیں۔ بعض حالتوں میں وہ اس زمانہ کے رہنے والے ہوتے ہیں جب فن تحریر نامعلوم تھا یا بہت کم استعمال ہوتا تھا۔ ہم یہ نہیں کر سکتے کہ مشاہدات کے ان تمام انبار کو برطرف کر دیں اور پھر اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی

ہم یہ بھی

نہیں کر سکتے کہ ان واقعات پر ایسی آزمائشیں عائد کئے بغیر ان سے کام لیں جن کی دوسرے علوم میں ضرورت نہیں ہے اور جنھیں اس موقع کے لئے ایجاد کرنا ہے۔

تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ شاہدات کے جس انبار کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ بس یہی تاریخ ہے، نہ اس سے کم ہے نہ زیادہ۔ مورخین کو اپنی محنتوں کے مقصود کے متعلق جو کچھ اضطراب و پریشانی لاحق حال تھی، جو لوگ علم السیاست کی تکوین کیا چاہتے تھے، وہ اپنے طریقے کے متعلق جس شش و پنج میں پڑے ہوتے تھے وہ سب یکقلم ہوا ہو جاتے ہیں اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ تاریخ ان واقعات کا مجموعہ ہے جن سے مملکتوں کا ایک استقرائی علم بننے والا تھا اور جنھیں ان مبصروں نے یکجا کیا تھا جنھیں اس امر کا کچھ یوں ہی سا ادراک تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

میں یہ کہتا ہوں کہ ان مبصرین کا ادراک صرف نیم بیدار سا تھا، یہ نہیں کہتا کہ انھیں بالکل ہی ادراک نہیں تھا۔ تاریخ جیسی کچھ ہے اور جیسی کچھ کہ مدتوں سے رہی ہے، اگر تم اس کا امتحان کرو تو تمھیں یہ نظر آئے گا کہ وہ جو کچھ درج کرتی ہے اور جو کچھ حذف کرتی ہے دونوں اعتبار سے وہ بالشعور اس امر سے آگاہ ہے کہ اس کا واسطہ مملکت سے ہے۔ میں نے واقعات کے ان وسیع اصناف کا ذکر کیا ہے جنھیں کسی زمانے میں تاریخ درج کرتی تھی مگر اب بالارادہ انھیں حذف کر دیتی ہے۔ واقعات کے ایسے اصناف بھی ہیں جنھیں تاریخ بالارادہ نہیں بلکہ بالشعور یا حذف کر دیتی ہے یا ان پر سرسری نظر ڈالتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ یہ واقعات بسا اوقات نہایت درجہ اہمیت رکھنے والے ہوتے ہیں۔ جیمز اول کے عہد کا مورخ شیکسپیر کے کھیلوں کا ذکر احیاناً کر دیتا ہے مگر رابرٹ کار کے عروج و زوال کے متعلق وہ بہت کچھ خامہ فرسائی کرتا ہے۔ ولیم سوم کا مورخ نیوٹن کے انکشافات کے متعلق بہت ہی کم کچھ کہتا ہے، مگر فنوک کی سازش کے متعلق بہت زیادہ سامعہ نوازی کرتا ہے۔ اب بتاؤ کہ زیادہ اہم کون تھا شیکسپیر یا کار نیوٹن یا فنوک؟ مگر کار کے اثر سے سلطنت متاثر ہوتی تھی اور فنوک کی سازش سے سلطنت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ برخلاف ازیں شیکسپیر اور نیوٹن کسی دوسرے ہی عالم میں کام کر رہے تھے اور مورخین بالشعور اس امر سے

آگاہ ہیں کہ یہ عالم ان کے قلمرو میں داخل نہیں ہے۔ وہ اس قسم کے مظاہر کو نظر انداز کر جاتے ہیں یا انھیں کسی ضمنی باب کے تحت میں ڈال دیتے ہیں، اور بعض وقت وہ خود اپنے شعور صحیحہ کو اسقدر کم سمجھتے ہیں کہ اس امر پر اظہار تاسف کرتے ہیں کہ وہ بادشاہوں کی شان وشکوہ اور اولوالعزم جنگجویوں کے جرایم کا ذکر کرنے پر مجبور ہیں اور ان سے زیادہ حقیقی عظمت کو، ان ایسے زیادہ شاندار پر امن فتحمندیوں کو ترک کر جاتے ہیں لیکن فی الواقع اس میں تاسف کی کوئی وجہ نہیں۔ سوال شان وشوکت یا عظمت وسطوت کا نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ جس عضویت کو مملکت کہتے ہیں اس پر جن قوانین کی حکمرانی ہے انھیں صحیح طور پر معلوم کیا جائے۔ اب دیکھو کہ حکومت و وضع قوانین اور جنگ و مخالفہ کا تعلق سلطنت سے ہوتا ہے مگر علمی تحقیقات اور ادبی نادر الکلامی کا تعلق سلطنت سے نہیں ہوتا۔

بیس برس قبل جب مسٹر بکل کو اس امر میں کامیابی ہو گئی کہ انھوں نے تاریخ کے ایک علمی تصور سے انگریزوں کے دلوں کو جگمگا دیا تو انھوں نے ہمیں ڈرا دیا کہ تاریخی تحریروں میں ایک انقلاب برپا ہو جائیگا۔ یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اب ہم حکومتوں، پارلیمنٹوں اور لڑائیوں کے بارے میں نسبتاً بہت کم کچھ پڑھیں گے۔ تاریخ کا کام اب یہ ہو جائے گا کہ وہ قوم کے طبعی ماحول، آب و ہوا جغرافیہ اور غذا کے متعلق بحث کرے مگر تم دیکھتے ہو کہ میں تاریخ کا جو منظر پیش کرتا ہوں وہ اس سے مختلف ہے اور مطلقاً انقلابی نہیں ہے۔ میں ان طبعی تحقیقاتوں کی اہمیت میں کلام نہیں کرتا اور مورخ کو چاہئے کہ ان کے نتائج سے کام لے مگر میری رائے کے بموجب خود مورخ کا حیطۂ عمل اس سے جداگانہ ہے وہ کوئی ماہر انسیات یا ماہر نسلیات نہیں ہے بلکہ اگر میں ایک لفظ وضع کر سکوں تو میں کہوں گا کہ وہ "سیاس" ہے۔ سیاسی جماعت یا عضویت یعنی مملکت اس کا موضوع مطالعہ ہے۔ اس اصول سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ مورخین اس وقت تک بیشتر غلطی پر ہونیکے بجائے بیشتر صحت پر تھے۔ توضیع قوانین اور نشو ونمائے ادارات سے متعلق ان کی جستجو نے علم السیاست کے حصۂ اولین کے لئے مستحکم بنیاد قایم کر دی ہے جس کا تعلق مملکتوں کی تقسیم و ترتیب اور ان کے تجزیہ سے ہے۔ محاربات، فتوحات،

مخالفات، وفاقیات سے متعلق ان کی تحقیقات نے اس دوسرے حصہ کی بنیاد رکھدی ہے جس کا تعلق مملکتوں کے تعامل باہمی سے ہے۔

ضرورت جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ جس راستہ پر وہ پہلے سے گامزن ہیں اس پر زیادہ واضح مقصود کے ساتھ وہ چلتے رہیں، وہ بالجملہ صحت پر تھے مگر تذبذب میں پڑے ہوئے تھے اور اس لئے کسی قدر بے ربط سے تھے۔ ان پر یہ خیال مسلط تھا کہ کسی خاص ملک میں جتنے قابل اہمیت امور واقع ہوے ہوں ان سب کا درج کرنا ان پر لازم ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ اپنا موضوع بحث ملک کو سمجھتے تھے حالانکہ فی الاصل مملکت ان کا موضوع بحث تھی، نہ کہ ملک۔ انھیں یہ وہم بھی گھیرے ہوے تھا کہ وہ اہل "علم" نہیں بلکہ اہل "ادب" ہیں یعنی ان کا کام شاعروں کے مشابہ ہے جو فوق العادت واقعات کو بیان کر کے جذبات پر اثر ڈالتے ہیں، اس میں کوئی عیب نہیں ہے کہ جلیل القدر واقعات کو شاندار طرز بیان میں ادا کیا جائے مگر یہ خیال کہ یہ کام غیر منفک طور پر مملکتوں کے تحقیقات کنندہ کے کام کے ساتھ اس طرح وابستہ تھا کہ دستاویزوں کو کام میں لانے والا، شہادتوں کی جانچ کرنے والا، سیاسی مظاہر کا ماہر، تاریخی علل و نتائج کا مبصر، لازماً اپنی ذات سے ایک فصیح البیان داستان گو یعنی نثر کا مثنوی نگار اور رزم نویس بھی ہو، یہ خیال اس امر کو فراموش کر دیتا ہے کہ ہم ہیروڈوٹس تھوسیڈائڈس یا لیوی کے زمانہ میں نہیں رہتے بلکہ ہم مطالعات خصوصی کے دور میں رہتے ہیں۔ ان قدیم مورخوں میں ایک عام پسند عنصر تھا اور ایک علمی عنصر تھا۔ ان کے بعد سے ان دونوں عناصر میں تفریق و تمیز کر دیگئی ہے۔ ہم میں اب بھی ایسے فصیح البیان داستان گو موجود ہیں جو گاہ بگاہ رزم نگاروں کے پایۂ عالی کے قریب پہونچ جاتے ہیں، چنانچہ کارلائل نے اپنے "انقلاب فرانس" میں یہ اعجاز دکھا دیا ہے۔ ہم میں علمی مورخین بھی موجود ہیں مگر ایسا کمتر ہوتا ہے کہ یہ دونوں وصف ایک ہی شخص میں جمع ہو جائیں۔ یہ مورخین مملکت کے مطالعہ کنندہ ہوتے ہیں مگر وہ اس کا مطالعہ استقرائی حیثیت سے یعنی تاریخ کی مدد سے کرتے ہیں۔

میں خود اسی کام کی کوشش کرنی چاہتا اور تمھیں بھی اسی راستہ پر لگانا چاہتا ہوں۔

اگر ہم اس میں کامیابی چاہتے ہیں تو ہمیں دو طریقوں کو ایک ساتھ چلانا پڑے گا۔ ہمیں تفکر، استدلال، تعمیم، تحدید اور تجزیہ سے کام لینا پڑے گا اور اس کے ساتھ ہی ہمیں واقعات کے اجتماع، تصدیق و تحقیق سے بھی کام لینا ہوگا۔ اگر ہم اول الذکر کی طرف سے غفلت برتیں گے تو ہمارا واقعات کو جمع کر لینا کچھ ایسا سود مند نہ ہوگا کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسا معیار نہ ہوگا جس سے ہم یہ جانچ سکیں کہ کونسے واقعات اہم ہیں اور کونسے غیر اہم ہیں۔ علیٰ ہذا اگر ہم دوسرے عمل میں تسامح سے کام لیں گے تو ہمارا استدلال بے بنیاد ہو جائے گا اور ہم علمائے متکلمین کی طرح تانا بانا بنتے رہیں گے۔

مگر خطبات کے اس سلسلے میں میں طریق اول کی طرف تمہاری رہبری کرنا چاہتا ہوں۔ میں مملکت کا ذکر عمومی حیثیت سے کرتا ہوں کسی خاص مملکت کا ذکر نہیں کرتا اور میرا خیال ہے کہ اس وقت تک تم یہ سمجھ گئے ہوگے کہ کیوں تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے ایسا کرنا میری غرض سے تعلق رکھتا ہے۔

(ذیل کا ٹکڑا جو ۱۸۹۱ء کے سلسلہ کے خطبۂ اول کا آخری حصہ ہے اسے خطبۂ ہذا کے ضمیمے کے طور پر لگا دینا نہایت برمحل ہوگا)

جب سابق مواقع پر میں نے تاریخ کی نسبت یہ عام رائے اپنے طلبہ کے سامنے پیش کی تو بعض اوقات خود میرے دل میں یہ خدشہ وارد ہوا کہ اگر میرے حسب خیال واقعاً یہ ممکن ہوتا کہ تاریخ کے واقعات کو ایسا استقرائی مواد بنایا جائے جس سے کوئی علم السیاست وجود پذیر ہو سکے تو یہ کام مدتوں پہلے تکمیل کو پہونچ چکا ہوتا۔ اٹھارھویں صدی میں مونٹسکیو کے ایسے سیاسی متخیلین موجود تھے اور سترہویں صدی میں لاک اور ہابس ہو گزرے ہیں۔ پس جب کہ دوسرے علوم مستحکم بنیاد پر قایم ہو چکے تھے تو ایک ایسا اہم علم کیوں حالت منتظرہ میں رہا؟ لیکن اس کے ساتھ ہی اس خدشے کا جواب بھی میرے دل میں آ گیا۔ وہ جواب یہ تھا کہ اس کے لئے استقرائی بنیاد ناپید تھی۔ کوئی مونٹسکیو یا کوئی لاک دنیا کی تاریخ کو نہ جانتا تھا اور نہ جان سکتا تھا۔ یہ جو کچھ میں نے کہا ہے اُسے بالکل قطعی سمجھو۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ اب سے سو یا ڈیڑھ سو برس قبل خالص تاریخی واقعات کا صحیح علم کس قدر کم حاصل تھا، اس کا

گو نہ اندازہ ان گاہ بگاہ کی تاریخی تشریحات سے ہو سکتا ہے جو مذکورۂ بالا مصنفین اپنے کلام میں لائے ہیں۔ یہ تشریحات علی العموم بالکل ناکارہ ہیں اور ان سے صاف طور پر تاریخی تنقید کی طفولیت، اسناد سے کام لینے کے عدم تیقن اور کل مضمون کے حادث وخام ہونے کا پتا چلتا ہے۔ حقیقت ہے کہ جسے ہم اب تاریخ کہتے ہیں اس کا تقریباً کل حصہ اس زمانے کے بعد سے پیدا ہوا ہے۔

اگر ایسا ہی ہو یعنی اگر تاریخ خود ایسے جدید زمانے کی پیداوار ہو تو پھر اس میں کوئی امر قابل استعجاب نہیں ہے کہ تاریخ سے کسی مخصوص علم کا جزاً و کلاً پیدا کرنا، ابھی بڑی حد تک زمانہ آئندہ کے لئے محفوظ رہنا چاہئے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں جسے تاریخ کہتے تھے وہ ابھی اسقدر زیادہ غیر مستند تھی کہ اس سے کسی شے کی بنیاد نہیں قایم ہو سکتی تھی۔ موجودہ نسل کے ہاتھ میں تاریخی معلومات کا ایک ایسا وسیع خزانہ ہے جس پر اعتماد ہو سکتا اور جو کسی مخصوص علم کے اغراض کے لئے قابل حصول ہے۔

خطبۂ دوم

میں اپنے آخری خطبہ میں کافی طور پر واضح کر چکا ہوں کہ جن کیفیات کی ہمیں تحقیق و تفتیش کرنا ہے وہ کیا ہیں؟ جیسے کہ ہم اپنے گرد و پیش میں دیکھتے ہیں تمام بنی نوع انسان مختلف وسیع جماعات کے اندر منتظم و منضبط پائے جاتے ہیں جنکی تنظیم و ترتیب ایک خاص طور وطریق کی ہوتی ہے اور جن کا ارتباط باہمی اس ترکیب عملیہ کے ذریعہ سے قایم رہتا ہے جو حکومت کے نام سے مشہور ہے۔ یہی جماعتیں مملکت کہلاتی ہیں۔ اس انیسویں صدی اور یہاں یورپ کے اندر اس وقت تو یہ حالت موجود ہی ہے مگر جب ہم شاہدات کے انبار پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اب سے صدیوں پیشتر بھی یہی حال تھا بلکہ جب ہم مردہ زبانوں کے ذریعہ سے انسانوں کی دو ہزار برس قبل کی زندگی کو اپنے سامنے لاتے ہیں تو باوجود بہت سے فرقوں کے اس اعتبار خاص میں ہم یہی دیکھتے ہیں کہ انسان اس وقت بھی وہی تھا جو اب ہے۔ قدیم زمانے کے لوگ بھی مملکتوں کے اندر رہتے اور حکومت کے تابع فرمان ہوتے تھے اور اگر ہم یورپ سے دور دراز ممالک مثلاً چین یا ہندوستان پر نگاہ دوڑائیں جن میں سے اول الذکر مغربی تمدن سے ہمیشہ غیر متاثر اور ثانی الذکر علی العموم اس اثر سے پاک رہا ہے تو وہاں بھی ہمیں مملکتیں اور حکومتیں نظر آتی ہیں۔ بیشک یہ قدیمی و بعیدی مملکتیں ان مملکتوں سے بہت کچھ مغایر تھیں جن سے ہم مالوف و مانوس ہیں بلکہ حقیقت میں یہ اختلاف اس سے بدرجہا زیادہ ہے جتنا فوری طور پر ہمارے ذہن میں آتا ہے لیکن مبصرین و طلبہ مشابہات پر متعجب ہونے کے بجائے ان مشابہات کو مبالغہ سے دکھانے کی جانب مائل رہے ہیں۔ انھوں نے اسے ایک امر مسلمہ قرار دے دیا ہے کہ انسان جہاں کہیں بھی پایا جاتا ہے وہاں یورپ کے مانند بادشاہوں کی امیروں اور

حکومتوں کا موجود ہونا ضروری ہے اور شاید اسی وجہ سے تاریخ کے اندر بعض مغالطے داخل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ حال میں یہ دعوے کیا گیا ہے کہ میکسیکو کے قدیمی ادارات کے ہسپانوی بیانات میں ہسپانویوں کے سابقہ خیالات نے بہت رنگ آمیزی کر دی ہے غلطی کے اس سبب پر کافی لحاظ کرنے کے بعد بھی سلطنتیں مختلف ہی طرز کی ہی مگر ملتی اسی طرح ہیں جس طرح زبانیں ہر جگہ ملتی ہیں خواہ یونانی یا جرمانی زبانوں کے ساتھ بنتو یا چینی زبانوں کا عدم تشابہ اس سے بہت بڑھا ہوا ہو جتنا بادی النظر میں خیال میں آنا ممکن ہے تاہم کرۂ ارض کی وسعت کے اندر خاص کر ان مقامات میں جہاں کی زمین عرب اور وسط ایشیا کے صحراؤں کے مانند غیر معمولی طور پر بے ثمر ہو اور نیز بعض پہاڑی مقامات میں سے ایسے اقطاع بھی ملتے ہیں جہاں دیگر ممالک کی بہ نسبت اس قسم کی تنظیم کم پائی جاتی ہے ان مقامات کے متعلق معمولاً یہ کہدیا جاتا ہے کہ وہاں مملکتوں کا وجود نہیں پایا جاتا کیونکہ عرب کے قبایل اور اسکاٹلینڈ کے کوہستانی قبائل پر مملکت کے نام کا اطلاق غیر موزوں معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں موضوع کے آغاز کار ہی میں یہ طے کر لینا بس ضروری ہے کہ آیا ہم اپنی تحقیقات میں اس رواج سے مطابقت کریں گے یا نہیں، آیا ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ علم السیاست کو محض متمدن مملکتوں سے واسطہ ہے اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ جس قسم کی جماعتوں میں وحشی یا کم از کم نیم وحشی انسان زندگی بسر کرتے ہیں وہ ان وحشت زا اور پریشان جماعتوں پر نظر ڈالے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم السیاست کی کتابوں میں بالعموم یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ وہ تمام ترتیب و تقسیم جن سے ہم اس قدر مانوس ہیں، وہ تمام قیل و قال جو ملوکیت و جمہوریت، اعیانیت و عمومیت کے متعلق ہوتی ہے اس کا اطلاق قدیمی قبایل اور ان وحشی جماعتوں پر نہیں ہوتا جن کی زندگی کے طریقے عجیب و غریب جوش سے مملو ہوتے ہیں۔ نہیں بلکہ اگر تم اس کتاب کو نظر غور سے دیکھو جس نے بیشتر سیاسی ارباب تخیل کے لئے نمونہ کا کام دیا ہے (یعنی ارسطو کی سیاسیات کو پڑھو) تو تم یہ دیکھو گے کہ اس نے مملکت کی اُس خاص صنف کے سوا جو خود اس کے ملک میں رونق پر تھی تقریباً اور تمام اصناف کو اپنی تحقیقات سے خارج کر دیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ نیم وحشی اجنبی جماعتوں کے متعلق قریب قریب بالکل ہی خاموش ہے

بلکہ وہ ان تمام مملکتوں کے متعلق بھی ساکت ہے جن میں ساتھ ہی ساتھ شہری کیفیت نہیں پائی جاتی۔ شاید ہمیں یہ خیال کرنا پڑے گا کہ وہ لفظ سیاسیات، (politics) کے معنی اس سے زیادہ محدود سمجھتا تھا جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں اور اس حیثیت سے اس لفظ کا ترجمہ "علم الممالک" نہیں بلکہ "علم البلاد" ہونا چاہیئے۔

مگر میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کو اس طرح مجرداً زیر بحث لانے کا طریقہ اور جن ادارات کو ہم ناپسند کرتے ہوں یا جو ہمارے لئے باعث تنفر ہوں، انہیں اس ناروادارانہ طریق پر برطرف کر دینے کا طور، اس استقرائی مسلک کے حسب حال نہیں ہے جسے اختیار کرنے کا ہم نے تصفیہ کیا ہے۔ یہ طریقہ انہیں لوگوں کے لئے حسب حال و موزوں ہے جو کمل مملکت کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں کیونکہ یہ عیاں ہے کہ یہ لوگ جس معیار کے متلاشی ہیں اعلیٰ سے اعلیٰ متمدن مملکتیں بھی اس معیار سے پست ہی رہتی ہیں اور اس لئے غیر متمدن مملکتوں پر نظر ڈالنا بھی محض تضیع اوقات ہوگا مگر ہم نے تو کم از کم سر دست کمل مملکت کے درپے ہونے سے دست برداری کر لی ہے بلکہ اپنی اس ابتدائی منزل میں تو ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ہم جن سلطنتوں کا مطالعہ کریں ان پر کسی قسم کا حکم لگائیں۔ ہم خود اس پر قانع ہیں کہ ہم مملکتوں کے مختلف اقسام کے امتیاز باہمی و ترتیب میں اسی خالص مبصرانہ انداز سے کام لیں جس انداز سے کوئی بی نیوس اشجار کے متعلق اور کوئی کووئے حیوانات کے متعلق کام لیتا ہو۔ ایک مرتبہ اس طریق کو اختیار کر لینے کے بعد پھر ہم یہ خیال دل میں نہیں لا سکتے کہ کسی مملکت کو اس وجہ سے خارج کر دیں کہ ہم اسے پسند نہیں کرتے۔ ایسا کرنا اس سے کم نہیں کہ کوئی عالم نباتات یا حیوانات بعض نباتات کو گھانس کا حقیر نام دیکر خارج کر دے یا بعض حیوانات کو حشرات الارض کے تحت میں رکھکر حذف کر دے۔ پس ہمیں یہ چاہئیے کہ اپنی ترتیب و تقسیم کا دروازہ ایسے سیاسی ادارات کے لئے وا کر دیں جو خود ہماری مملکتوں سے نہایت درجہ غیر مشابہ اور ہماری پسندیدہ مملکتوں سے نہایت مغایر ہوں۔ نباتات و حیوانات کا تشابہ ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کرے گا کہ ادارات ادنیٰ بھی ہیں اور اعلیٰ بھی۔ عالم حیوانات کی تقسیم و ترتیب پر نظر ڈالو تو معلوم ہو کہ جب ہم "حیوان" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اگرچہ ہم مبہم طور پر اس سے آگاہ ہوتے ہیں کہ

پست درجے کے بھی ایسے جاندار ہیں جو قطعی معنی میں لفظ حیوان میں داخل ہیں اِلّا عام طور پر اس لفظ سے ہمارے ذہن میں کسی نہ کسی اعلیٰ حیوان مثلاً کتے یا گھوڑے یا شیر کا خیال آتا ہے مگر جب صحت کے ساتھ حاوی اصول پر تقسیم و ترتیب ہوتی ہے، اس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تمام حیوانات جن سے ہم آگاہ ہیں یعنی وہ تمام جاندار جو صحیح طور پر حیوان کے نام کے مستحق ہیں چار عالموں میں سے ایک عالم کے تحت میں محدود کر دیئے جاتے ہیں۔ واقعاً ہوتا ہے یہ کہ چار حصوں میں تین حصے ان عجیب و غریب بعید الوقوع جانداروں کے حق میں آجاتے ہیں جن میں اصول حیاتی نے یا تو بہت کم ترقی کی ہوتی ہے یا ایسے طریق پر ترقی کی ہوتی ہے کہ جسے عام طور پر حیوان کہا جاتا ہے اس سے اس کی خارجی مشابہت بہت ہی کم ہوتی ہے۔ عجیب الخلقت کیڑے، پھولوں کے مانند حیوانات سفصلہ وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ ہمیں اپنے ذہن میں یہ تصور قائم کرنا چاہیئے کہ سیاسی ادارات بھی اسی طرح زیر بحث لائے جائیں۔ اس صورت میں پھر اس میں کوئی استعجاب باقی نہ رہے گا کہ ارسطو نے جتنی مملکتوں کا ذکر کیا ہے نہ صرف وہ بلکہ ان کے سوا یورپ جدید کی تمام مملکتوں کو بھی ملا کر یہ سب مملکتوں کے انواع و اقسام کی جملہ تعداد کا ایک جزو قلیل ہوں گی۔ دوسری طرف وہ مملکتیں جن سے ہم کمتر مانوس ہیں اور جنھیں ہماری کتابوں میں نیم وحشی قرار دیکر خاموشی کے ساتھ ترک کر دیا جاتا ہے، ان کی تعداد مذکورہ بالا مملکتوں سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہوگی۔

یہ استقرائی طریقہ اگرچہ رواداری میں گھٹا ہوا ہو مگر سختی میں اسے دوسرے طریقے سے کم نہ ہونا چاہیئے۔ یہ طریقہ کسی صنف کو ناقص یا قابل حقارت قرار دیکر خارج نہیں کرے گا لیکن اس نہایت ہی خوشگوار نمونہ کو خارج کر دے گا جسے فی الحقیقت زیر تحقیقات مظہر قدرت سے تعلق نہ ہو۔ ایک عالم حیوانیات تمام حیوانات کو پیش نظر رکھتا ہے مگر جو مخلوقات صحیح معنوں میں حیوان نہیں ہیں انھیں خارج کر دیتا ہے۔ اس اصول پر نہایت ہی قدیم زمانے کی آبادی کا بہت ہی غیر متمدن قبیلہ یا شعب ہماری توجہ کا وہی استحقاق رکھتا ہے جو قدیم روما یا جدید انگلستان کو ہے، شرط صرف اتنی ہے کہ وہ فی الواقع اس قسم میں داخل ہو۔ شاید ایک لمحہ کے لئے ہم اس شک میں پڑ جائیں کہ آیا انسانوں کے ان اجڈ جرگوں اور متمدن مملکتوں کے

درمیان کچھ قدر مشترک ہے بھی یا نہیں۔ کوئی شخص بھی ان کی نسبت "مملکت" کا لفظ استعمال کرنے کا خیال ذہن میں نہیں لاتا۔ شاید اس کی سرسری وجہ یہ ہے کہ وہ کسی مفہوم میں مملکت نہیں ہیں اور مملکت میں اور ان میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ ہمیں ایک لمحہ کے لئے اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے۔

اپنے آخری خطبے میں جس اساسی امر کے متعلق میں نے اشارہ کیا تھا اور جو اسقدر تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے اور اس قدر وسیع النظر مطالعہ کا سزاوار ہے وہ یہ ہے کہ آدمیوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک ایسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو محض ان کا خاندان نہیں ہے اور یہ تعلق نہایت عمیق واہم اتحاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ زمانۂ جدیدہ کے انگریزوں پر نظر ڈالو، ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کسی شخص کی رگوں میں انگریزی خون کا ایک قطرہ بھی نہو اور پھر بھی ہم یہ دعوے کرتے ہیں کہ فی الواقع کوئی قربانی ایسی نہیں ہوسکتی کہ وقت ضرورت انگلستان اس شخص سے اس کا مطالبہ نہ کرسکے۔ اسی کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اگرچہ یہ رابطہ محض قرابتداری کا نہیں ہے اور مخصوص صورتوں میں مطلقاً ایسا نہ ہو، پھر بھی یہ رابطہ قرابت داری سے بالکل ممیز بھی نہیں ہے اور انگریز عام طور پر اپنے کو ایک دوسرے کا قرابت دار سمجھتے ہیں۔ انگریزی سلطنت کسی حدتک غرض مشترک کے وسیلے سے باہم متحد رکھی جاسکتی ہے، تاہم اس میں محض بخوشی حصہ داری کی شرکت کی کیفیت نہیں پائی جاتی بلکہ یہ ایک ایسا اتحاد ہے جس کی بنیاد خاندان کے اندر مستحکم ہے اور وہ جو کچھ بھی ہے یہ حالت اسے نشو ونما سے حاصل ہوئی ہے محض کسی ترتیب کا نتیجہ نہیں ہے۔

اب یہ تسلیم نہ کرنا قطعاً ناممکن ہے کہ یہ کیفیت جو اب اس درجہ وسیع اور ایسے اعلیٰ مدارج پر پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے وہ اپنے خد وخال میں نہایت ہی قدیمی وحشی قبیلہ کے ہم مثل نہیں ہے، یہ بھی ایک وسیع انجمن ہے جس کے ارکان اس کے ساتھ زندگی اور موت کے واسطہ سے مربوط ہیں۔ اس کے لیے بھی اس کے ارکان جنگ کرتے اور اس کے اغراض ومقاصد کے لئے مباحثہ کرتے ہیں۔ قبیلہ میں ہمیں اکثر یہ پتہ چل سکتا ہے کہ بعض افراد کل مجموعہ کے ساتھ قرابتداری کا کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ غلام بن کر آئے ہوں اور پھر ان کو آزادی مل گئی ہو، یا وہ غیر ملکی ہوں اور

انھیں قبیلہ میں داخل کر لیا گیا ہو اور پھر بھی اکثر اً وکلاً قبیلہ بڑے پیمانے پر گویا ایک خاندان ہے
مختصر آیہ کہ نہایت ہی ترقی یافتہ قدیم قبیلہ سے مقابلہ کرو تو تمھیں دونوں جگہ ایک ہی سے خد وخال نظر آئیں گے، البتہ تناسب میں فرق ہوگا۔ مملکت میں دماغ کا حصہ زیادہ ہوتا ہے اور قبیلہ میں خطرت کا۔ اول الذکر میں آزادانہ مرضی اور طباعانہ تدابیر کا دخل زیادہ ہوتا ہے اور ثانی الذکر میں خون و قرابت کی حکمرانی ہوتی ہے باایں ہمہ مملکت اپنے وجود سے قبیلے کو فنا نہیں کر دیتی ہے، اب بھی قرابتداری کا اقتضا بہت کچھ ہوتا ہے چنانچہ موجودہ صدی کی تحریک قومیت نے نہایت ہی نمایاں طور پر اسے ثابت کر دکھایا ہے۔ دوسری طرف جہاں کہیں بھی ہم کو قبیلے کا پتا چلتا ہے وہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ایک حد تک مملکت کا رنگ بھی لئے ہوتا ہے۔ شدید خاندانی تنظیم ہمیشہ غیر مکتفی ثابت ہوتی ہے اور ضرورت داعی ہوتی ہے کہ اس میں مصنوعی ادارات کا ضمیمہ لگایا جائے۔ پس خود قرابت سے علٰحدہ ایک مشترک خصوصیت ایسی ہے جو ان جماعات میں سے نہایت ہی قدیمی اور نہایت ہی ترقی یافتہ جماعتوں کو باہم ملا دیتی ہے۔ اس سے میری مراد اصُول حکومت ہے یہاں بھی تناسب میں اختلاف ہو سکتا ہے اور یہی باعث ہوتا ہے تنوّع کا، مگر وہ خصوصیت مشترک ہوتی ضرور ہے اور اسی پر اس صنف کے توحد کا انحصار ہے۔ رات دن کی موانست کی وجہ سے فرمان واطاعت کا آلہ ہماری نظروں میں ایسا خفیف ہوگیا ہے کہ وہ جس توجہ کا سزاوار ہے ہم اکثر اسے نظر انداز کر جاتے ہیں لیکن یہی سادہ انتظام جس کے وسیلے سے ایک فرد واحد کی مرضی نہ صرف اپنے بلکہ ایک گروہ وجماعت کے افعال کا تعین کرتی ہے اسی سادے انتظام پر تاریخ کے تقریباً ہر ایک اہم معاملہ کا انحصار ہوتا ہے اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ علم السیاست کو ہم وہ علم کہہ سکتے ہیں جو اس مظہر قدرت یعنی حکومت کی تحقیقات کرتا ہے۔

پس یہیں سے علم السیاست کے سلسلہ کی وہ اولین خصوصیت معلوم ہوتی ہے جو صریحاً و بدیہاً استقرائی ہے۔ یہ آغاز ہی میں متمدن و غیر متمدن کے امتیاز کو غیر متعلق قرار و یکسر برطرف کر دیتی اور ان تمام سیاسی اجتماعات اور نظمہائے معاشرت کو جو اصول حکومت سے مربوط ہوتے ہیں بے لوث غور وفکر کے لئے قبول کر لیتی ہے

مگر تاریخی ارباب تخیل جو غایت وسیع النظری سے کام لیتے ہیں وہ بہت ہی کم مسلسل اور یکساں طور پر ایسا کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر قدیم اعتقادی طریقے کو صرف جزوی طور پر ترک کرتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اٹھارھویں صدی کے اہل طریق کے بہ نسبت کم تعزو پسند ہوں وہ ازمنہ وسطیٰ کے اچھے رخ کے دیکھنے کے لئے تیار ہوں سیاسی زندگی کی بعض ایسی شکلوں کو جنھیں حقارت سے دیکھا جاتا تھا ان کی قدر کرتے بلکہ زاید از ضرورت قدر کرنے کے لئے بھی آمادہ ہوں مگر جو نظم میں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں وہ اس سے بہت آگے بڑھا ہوا ہے کیونکہ اس میں یہ سوال ہی نہیں آنے پاتا کہ جن کیفیات کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں وہ اعلیٰ و شریفانہ ہیں یا نہیں۔ اس نظم کی خواہش صرف یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے مملکتوں کی نوعیت اور ان کے نشو و نما کے قوانین کی بابت مشاہدے اور استقرا کے ذریعہ سے واقفیت حاصل کرے۔ اس غرض سے وہ تمام واقعات کو مرحبا کہتا ہے اور اگر فاسد و ناقص مظاہر قدرت ظاہر ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ حقیقتاً اس دلچسپی کا اظہار نہیں ہوتا جو کیفیات صحت کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ ان کے ساتھ دوسری قسم کی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے (اس نظم میں) غیر اہم واقعات صرف وہ ہوتے ہیں جن سے کسی نئی بات کا انکشاف نہ ہوتا ہو بلکہ جو کچھ پہلے سے معلوم ہے سطحی طور پر صرف اسی کی تائید ہوتی ہو

جب ہم ایک مرتبہ اس خیال سے نجات حاصل کر لیتے ہیں کہ غیر متمدن زمانہ کے قبایل و شعوب سزاوار تحقیر و ناقابل توجہ ہیں تو پھر مملکت کا کچھ اور ہی تصور ہمارے ذہن میں قایم ہو جاتا ہے۔ پہلے چونکہ مملکتیں متمدن قوموں سے مخصوص سمجھی جاتی تھیں، اس لیے اس وقت ہم بالطبع یہ سمجھتے تھے کہ وہ تحریر کے فن کی طرح کم و بیش ایجادات کی نوعیت کی ہیں مگر اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ زیادہ تر خود زبان کے مثل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اگرچہ اپنے اظہار خیال میں نا متناہی حد تک متغائر ہوں مگر انسان جہاں کہیں بھی ہوتا ہے وہاں مملکتوں کا وجود بھی یکساں و ہمہ گیر طور پر یا قریب قریب اسی حد تک پایا جاتا ہے۔ ہر جگہ بنی نوع انسان کا تعلق کسی نہ کسی شے کے تابع ہوتا ہے جسے حکومت کہہ سکتے ہیں۔ پس سوال یہ ہے کہ اس ہمہ گیر کیفیت کے متعلق ہم کس طرح بحث کریں اور اس کی تحقیقات کا آغاز کس طریق پر کریں۔ کیا ہم اس کا

آغاز اس طور سے کریں کہ مملکت کا وجود جس مقصد کے لئے ہو اس کے متعلق کوئی عظیم الشان دعوئے قرار دیں۔ مُدت تک یہی دستور رہا ہے۔ (کہا جاتا تھا کہ) مملکت کا وجود اس لئے ہے کہ وہ زیادتی کو فرو اور قوی کے مقابلہ میں ضعیف کی حفاظت کرے، اس کا وجود اس لئے ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان انصاف کرے اور اختلافات کو رفع کرے، اس کا وجود اس لئے ہے کہ وہ غیر ملکی حملہ کے مقابلہ میں ملک کی حفاظت کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ مملکت کو جس امر کے درپے ہم دیکھیں اسی کو ہم ہستی کا مقصد قرار دے سکتے ہیں۔ ایک طریق والے بالتخصیص اس امر پر زور دیتے ہیں کہ مملکت کے فرایض کا ایک اعلیٰ و شریفانہ تخیل پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کا وجود نکوئی کی غرض سے ہے یعنی اسے انسان کی بہترین بہبود کے ہر ایک ممکن التصور صورت کو اپنا مقصود بنانا چاہئے۔ دوسرے طریق والوں نے زیادہ معتدل روش اختیار کی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مملکت کو بس اس پر قانع رہنا چاہئے کہ وہ نظم و امن کو قایم رکھے اور ملک کی حفاظت کرے اور نکوکرداری کی ترقی کو دوسرے کارکنوں پر چھوڑ دینا چاہئے۔

منجملہ اور مثالوں کے یہ بھی ایک مثال ہے کہ اعلیٰ و اہم مضامین کی بحث کیونکر ایسے سہل رفتار میں پڑ جاتی ہے جس میں وہ برابر بہتی ہی چلی جاتی ہے اور زر نقاً بیابیا ت کے ساتھ اِدھر اُدھر مُڑتی رہتی اور ان مباحث کو وہ عظمت عطا کرتی ہے جس کے وہ سخت محتاج ہوتے ہیں مگر کسی امر کا فیصلہ نہیں کرتی کیونکہ وہ کسی قطعی سوال کو پیش نظر نہیں رکھتی۔ کیا ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ مملکت کو کس امر کو اپنا مطمح نظر بنانا چاہئے یا یہ کہ کونسا امر اس کا مطمح نظر ہے۔ سوال اول بالکل واجب و درست اور بغایت اہم ہے مگر وہ سوال دوم سے بالکل ممیز ہے اور ہم اس پر یہ اضافہ کر سکتے ہیں کہ ایسے سوال کے کسی عام جواب یعنی ایسے جواب کی جو مملکت کے تخیل مجرد سے براہ راست حاصل ہوا ہو توقع کرنا دشوار ہے۔ اس وقت مملکت کا مطمح نظر کیا ہونا چاہئے یہ سوال اغلباً اس سے بہت مختلف ہے کہ قدیم روما اسپارٹا ایران یا ہندوستان میں مملکت کا مقصد کیا تھا یا کیا ہو سکتا تھا۔

میری تجویز یہ ہے کہ ہم سردست اس فیصلہ کی اولوالعزمی کو چھوڑ دیں کہ

مملکت کو کیا ہونا اور کس امر کی سعی کرنا چاہئے، اور محض مشاہدات کے ذریعہ سے اس امر پر غور کریں کہ مملکت واقعاً کیا رہی ہے۔ جب ہم ایسا کریں گے اور خاص کر جب ہم مملکت کی زیادہ قدیم ترشکلوں پر نظر ڈالیں گے تو ہمیں یقیناً اس امر پر شک ہوگا کہ آیا مملکت کے مقصد پر ہم اس بے فکری سے گفتگو کر بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ ہم کسی درخت یا کسی حیوان کے مقصد کے متعلق کچھ گفتگو نہیں کرتے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی یقینی ہے کہ مملکت ایسے خالص طور پر طبعی پیداوار نہیں جیسے درخت یا جانور ہیں، تاہم ایک حد تک یہ بھی طبعی پیداوار ہے اور جس حد تک یہ طبعی پیداوار ہے اس کی نسبت بھی یہ کہنا چاہئے کہ وہ صحیح مفہوم میں بغیر کسی مقصد کے ہے۔ نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ مملکت کے ارتقا پر انسانی اثر پڑنے کے مدتوں بعد تک بھی اس میں ارادی احساس وادراک کا فقدان جاری رہا ہے۔ مملکت کے اندر جو انسانی مرضی اپنا عمل کرتی رہی ہے وہ محض فطری شعور رہا۔ پس جو مملکتیں بہت اعلیٰ مدارج پر ترقی کر گئی ہیں اور جو زمانۂ جدید کے لوگوں سے مرکب ہیں، صرف انھیں کی نسبت مجردانہ طریقے پر بحث ہو سکتی ہے اور نظری معیار انھیں پر عائد ہو سکتا اور اس معیار سے انھیں کا فیصلہ ہو سکتا ہے لیکن اگر یہ طریقہ قابل اطمینان نہیں ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ ہم کونسا طریقہ اختیار کریں۔ تاریخ اور مشاہدۂ واقعات کا جو انبار ہمارے پیش نظر ہے اسے ہم کس طرح پر کس نظم کے تحت میں لا سکتے ہیں۔

جن مضامین پر ہم اس وجہ سے سکون قلب کے ساتھ غور کر سکتے ہیں کہ ان سے ہمارے اغراض پر فوری اثر نہیں پڑتا یا وہ ہمارے جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتے ان میں سائنس پہلا قدم یہ اٹھاتا ہے کہ ان کے مختلف کیفیات کو اصناف میں ترتیب دیتا ہے۔ ہر سائنس کے ابتدائے کار میں کچھ تھوڑی بہت ترتیب وتقسیم کرنا ہوتی ہے۔ اقلیدس کو جن خطوط، مثلث مربع وغیرہ کے مانند سادی شکلوں اور مخروطی شکلوں سے بحث کرنا ہے وہ اپنے مبحث کا آغاز انھیں کی ترتیب سے کرتا ہے۔ عالم ہیئت، ثوابت، سیارات، توابع، ستارہائے دمدار وغیرہ اجرام فلکی کے مختصر التعداد اقسام میں تمیز قایم کرتا ہے۔ پس اس سے یہ ظاہر ہے کہ علم السیاست کو بھی ترتیب وتقسیم کا کام ہاتھ میں لینا پڑیگا۔ سیاسی ترتیب وتقسیم کے بعض اصطلاحی الفاظ نہایت مشہور ہیں۔ ملوکیت، اعیانیت،

عمومیت وغیرہ ایسے نام ہیں کہ ہم میں سے اکثر علم السیاست کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں وہ بیشتر ان ہی پر مشتمل ہے۔
مگر بعض علوم ایسے بھی ہیں جن میں ترتیب و تقسیم کا ابتدائی کام اس سہولت سے طے نہیں ہو جاتا جس سہولت سے ہیئت یا علم مساحت ارض میں طے ہو جاتا ہے۔ نباتات و حیوانات سے بحث کرنے میں یہ کام اس قدر دشوار اور اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ اس کے لئے بجائے خود ایک جداگانہ علم کی کم و بیش ضرورت پڑ گئی ہے، چنانچہ نباتی علم الاجسام جو نباتات کا تجربہ کرتا اور اشکال نباتی کے قوانین حیات سے بحث کرتا ہے اس کے پہلو بہ پہلو ایک علم النبات پیدا ہو گیا ہے، جس کا کام کلیۃً یہ ہے کہ وہ اشجار کی تعریف و تقسیم کرے۔ جب لی نیوسی نظام نے ترقی کی ایک زمانہ اس کی قبولیت کا رہا اور پھر ژیوسیو وغیرہ کے جاری کئے ہوئے طبعی نظم نے اس کی جگہ لے لی اس وقت اٹھارھویں صدی میں یہ معلوم ہوا کہ محض ترتیب و تقسیم میں بھی اسی قدر دشواریاں پیش آسکتیں، غلطیاں سرزد ہو سکتیں اور ذہن کے اعلیٰ قویٰ اس میں بھی اپنا رنگ دکھا سکتے ہیں جس قدر قوانین کے انکشاف و دریافت میں ہوتا ہے۔ حیوانیات کا تعلق حیوانی علم الاجسام کے ساتھ بالکلیہ اسی نوعیت کا ہے مگر یہ صورت صرف بعض ہی علوم میں واقع ہوئی ہے۔ پس یہ سوال از خود ذہن میں آتا ہے کہ آیا علم الممالک میں ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ترتیب و تقسیم عجلت و سہولت کے ساتھ عمل میں آجائے گی یا ہمیں شدید مشکلات پر غالب آنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔
تقسیم و ترتیب کے ان دونوں علوم پر نظر کرو، تم معاً یہ دیکھو گے کہ وہ دونوں ایک ہی قسم کے کیفیات یعنی ذی حیات عضویات سے بحث کرتے ہیں۔ اس سے یہ خیال ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ ذی حیات عضویات کی ترتیب و تقسیم خصوصیت کے ساتھ مشکل کام ہے، اور اس خیال کے ذہن میں آتے ہی ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ درست ہے کیونکہ زندگی کا عمل جہاں کہیں بھی ہوتا ہے اس کا ظہور کثیر التعداد عضویات میں ہوتا ہے جن میں حیرت انگیز تشابہات پائے جاتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی نامتناہی اور تقریباً ناقابل بیان اختلافات بھی موجود ہوتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ کوئی دو آدمی ایک سے نہیں ہوتے، یہ صحیح ہے مگر اس کے ساتھ ہی اسا

یہ بھی ہے کہ کوئی دو شخص بہت ہی مختلف بھی نہیں ہوتے، اور جو امر انسان کے بارے میں صحیح ہے وہی دوسرے حیوانات اور نیز اشجار کے بارے میں بھی صحیح ہے تشابہات و تخالفات کا یہ نامحدود امتزاج ذی حیات عضویات کے ساتھ مخصوص ہے۔ غیر نامیاتی کیمیا میں جن اشیاء سے کام لیا جاتا ہے اس میں اس قسم کی کوئی شئے نہیں پائی جاتی اور ریاضیات میں جس قسم کے مجردات سے بحث کی جاتی ہے اس میں تو یہ خصوصیت اور بھی کم ہے۔ پس ان علوم میں ترتیب و تقسیم کی اس قسم کی دشواری نہیں پیش آتی وجہ یہ ہے کہ تقسیم و ترتیب کی دشواری وہیں لاحق ہوتی ہے جہاں مرکب القوی افراد کی نامحدود تعداد کا ظہور قلیل التعداد طرزوں میں ہوتا ہے۔ پس ہمیں متوقع رہنا چاہئے کہ جس علم کو ذی حیات عضویات سے بحث کرنا پڑتی ہے اس میں ترتیب و تقسیم کی شدید دشواریوں سے سابقہ پڑے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا مملکتیں ذی حیات عضویات نہیں ہیں۔

ہمیں یہ غور کرنا چاہئے کہ (Organism) "عضویت" سے مراد کیا ہے (Organism) ایک یونانی لفظ سے ماخوذ ہے جس کے معنی آلے کے ہیں اور لغوی حیثیت سے اس کے معنی بہت کچھ وہی ہوں گے جو مشین (کل) یعنی آلۂ مرکب کے ہیں مگر انگریزی زبان میں لفظ (Organ) اور (Organism) دونوں بالعموم مصنوعی آلات کے لئے نہیں بلکہ زندہ آلات کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ چمٹا کسی چیز کی گرفت کے لئے ایک آلہ یا کل ہے مگر ہاتھ جو یہی کام انجام دیتا ہے لیکن ذی حیات ہے، اسے گرفت کا عضو کہہ سکتے ہیں، حیات جسے زمانۂ حال کے سائنس میں بہت بلند رتبہ حاصل ہو گیا ہے اسکی یہ تخصیص ہے کہ جن اشیا میں وہ دایر و سایر ہوتی ہے انھیں تنظیم یا عضویت کا نام عطا کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے مختلف حصے مختلف قابلیت پیدا کر لیتے اور مختلف فرائض کے انجام دینے کے لئے خود کو موزوں بنا لیتے ہیں۔ یہ حصہ کم و بیش ایک زندہ آلہ یا عضو ہو جاتا ہے۔

کسی غیر ذی حیات شئے مثلاً ایک پتھر کو لو، اس کا ایک جزو دوسرے جزو کے مانند ہوتا ہے یا اگر احیاناً ان کی شکلوں میں فرق ہوتا ہے تو ان کی قابلیت میں فرق نہیں ہوتا لیکن ذی حیات شئے مثلاً حیوان ایک مرکب شئے ہے اور

یہ ترکیب بعض حصص کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کے اعضا کی وجہ سے ہے یعنی ان آلات کی وجہ سے جو خصوصیت کے ساتھ ایسے کاموں کے لئے موزوں ہیں جو کل جسم کی بہبود کے واسطے ضروری و نافع ہیں۔ آنکھ دیکھنے کے لئے ہے۔ پاؤں چلنے کے لئے ہیں وقس علیٰ ہذا البواقی لیکن یہ بعینہ وہی صورت ہے جو مملکت کی خصوصیت خاص ہے۔ مملکت بنی نوع انسان کے ایک ایسے اجتماع کا نام ہے جو محض ایک انبوہ یا اژدحام کی صورت سے جمع نہیں ہو گئے ہیں بلکہ وہ منتظم بھی ہیں۔ یہ اس قدر حیرت انگیز طور پر صحیح ہے کہ تمام اصطلاحات جو طبیعاتی اور سیاسی تنظیم میں استعمال ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے سے تبدیل کئے جا سکتے ہیں اور خود لفظ عضویت دونوں شعبوں میں بلا کسی استعارے کے استعمال ہو سکتا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ آدمی مملکت کا رکن ہے لفظ "رکن" کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی ہیں "عضو"۔ ہم کہتے ہیں کہ آنکھ یا کان ایک فرض انجام دیتے ہیں۔ لفظ "فرض" کے کیا معنی ہیں؟۔ یہ ایک سیاسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں کسی عہدۂ سرکاری کے کام کا انجام دینا۔ ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس تفریق کی وجہ سے طبعی جسم میں اعضا پیدا ہوتے ہیں اور جس انتخاب کی وجہ سے مملکت میں خاص فرایض خاص اشخاص یا خاص طبقات کو تفویض کئے جاتے ہیں ان دونوں میں مشابہت کا احساس کس قدر قدیم زمانے میں اور کس قدر طبعی طور پر ہو گیا تھا۔ معدے اور اعضا کے قدیم قصے سے بھی یہی امر ظاہر ہوتا ہے۔ اس قصے کو تم لیوی یا شیکسپیر میں پڑھ سکتے ہو اور فلاطون کی "جمہوریہ" اور سنٹ پال کے خطوط کے مشہور عام فقروں سے بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ سنٹ پال فرماتے ہیں کہ جسم میں تفرقہ نہ ہونا چاہئے اور افلاطون کہتا ہے کہ یہ نہ کہو کہ ایک انگلی میں درد ہے بلکہ یہ کہو کہ انسان کی ایک انگلی میں درد ہے۔ اسی طرح مملکت میں ہمیں یہ نہ کہنا چاہئے کہ فلاں شخص کو تکلیف ہے، بلکہ کہنا یہ چاہئے کہ سلطنت کو تکلیف ہے جس کا اظہار فلاں شخص کی تکلیف کی شکل میں ہوتا ہے۔

بہر نوع اس تشابہ کو ضرورت سے زیادہ طول بھی نہ دینا چاہئے۔ طبعی و سیاسی تنظیم میں تشابہ کے پہلو بھی ہیں اور تخالف کے بھی ہیں۔ پھر بھی یہ محض خیالی یا شاعرانہ

تشابہ نہیں ہے بلکہ اس میں حقیقی اہمیت ہے۔ ہر صورت میں تشابہ اتنا قریبی ہے کہ اس سے ہم پہلے سے یہ فرض کر لینے میں حق بجانب ہوں گے کہ علم الاجسام کی ترتیب وتقسیم میں جو دشواری پیش آتی ہے وہی دشواری علم السیاست میں بھی پیش آئے گی۔ جو مملکتیں ہم اس وقت کرۂ ارض پر پھیلی ہوی دیکھتے ہیں یا جنھیں تاریخ کے وسیع میدان میں مشاہدہ کرتے ہیں وہ اپنے تخالفات وتشابہات کے باعث ایسی ہی حیرت انگیز ہیں جیسے وہ نباتات وحیوانات ہیں جن کی تقسیم وترتیب کے لئے لی نیوس اور کو وے کی ذہانت کی ضرورت ہوئی تھی۔ نباتات وحیوانات کی طرح یہاں بھی بعض نقوش آنکھوں میں کھپ جاتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ہر مملکت اس قدر پیچیدہ ہے، اس کے اعضا اس قدر کثیر التعداد ہیں اور ان میں خفیف اختلافات کی اتنی گنجائش ہے کہ ہمیں مجبور ہو کر تقسیم در تقسیم کرنا پڑتی ہے اور اکثر یہ یقین نہیں ہوتا کہ بعض افراد کو کس تحت میں رکھا جائے! مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ارسطو کے وقت سے جو تقسیم وترتیب چلی آرہی ہے اور جو اب بھی تقریباً ہر طرف مختار ومقبول ہے وہ مجھے مطلق قابل اطمینان نہیں معلوم ہوتی ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے۔ یہ تقسیم ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حکومت جن اشخاص سے مرکب ہوتی ہے انھیں کی تعداد کے بموجب مملکت میں فرق ہوتا ہے۔ مملکت ایک شخص یا چند افراد یا کثیر التعداد اشخاص پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ اس سے ہمیں تین اقسام حاصل ہوتے ہیں جنھیں اب عام طور پر ملوکیت اعیانیت اور عمومیت کہتے ہیں۔ تم یہ جانتے ہو کہ ارسطو نے ایک مزید امتیاز بھی پیدا کیا تھا؛ وہ ان تینوں اصناف کو شاہی، اعیانیت، اور دولت عامہ (Polity) کے قانون سے جائز قرار دیکر، ہر ایک کے پہلو میں اسی کی ایک فاسد قسم بھی رکھدی تھی۔ وہ فاسد ملوکیت کو خودسری فاسد اعیانیت کو عدیدیت اور فاسد دولت عامہ کو عمومیت لکھتا ہے۔ مجھے یہ امر تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کے بعد سے سیاسیات میں اگرچہ ہر شئے بدل گئی ہے اور جن مملکتوں سے ہم بحث کرتے ہیں وہ حیرت انگیز طور پر اس کے پیش نظر شہری جماعتوں سے مغایر ہیں اس پر بھی ہم اس وقت تک اس قسم کی تقسیم کو کافی سمجھتے ہیں۔ مجھے یہ نظر آتا ہے کہ ہم اپنے تمام سیاسی مباحث میں اب بھی انھیں سادے اوصاف کو استعمال کرتے اور خود کو انھیں تک محدود رکھتے ہیں مختلف

فریق اب بھی ملوکیت اور غیر ملوکیت پر (جسے وہ جمہوریت کہتے ہیں) اور اعیانیت وعمومیت پر بحث کرتے ہیں اور برابر ارسطو ہی کے نقش قدم پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ البتہ اتنا فرق کرتے ہیں کہ ارسطو (باقتضائے صورت حال اعیانیت کو بہترین شکل قرار دیتا تھا اور عمومیت کو فاسدات میں داخل کرتا تھا اور ہم اب عمومیت کو ایک قسم کا انتہائے خیال سمجھتے ہیں اور خود ارسطو کے مفہوم میں اعیانیت کا لفظ مدت سے خارج از بحث ہو گیا ہے۔

ارسطو کو یہ ترتیب وتقسیم تقریباً لابدی طور پر نظر آئی کیونکہ اس نے اپنے ایک طرف ایران ومقدونیہ کو دیکھا جنھیں، تحکمانہ شکل میں وہ بادشاہی رائج تھی جس کا ذکر اس نے ہومر میں بھی پڑھا تھا۔ دوسری طرف خود یونان میں ہمعصر عمومیت اور ہمعصر عدیدیت میں سخت تنازع برپا تھا۔ جدید یورپ میں مملکتوں کے طرز، سادگی وامتیاز میں اس سے بہت گھٹے ہوئے ہیں۔ جب ہم کسی جدید سلطنت کو لیتے ہیں اور اس میں یہ تحقیق کرتے ہیں کہ آیا شخص واحد اس پر حکمراں ہے یا متعدد اشخاص یا کثیر التعداد اشخاص اس پر حکمرانی کرتے ہیں تو ہمیں بالعموم یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی قابل اطمینان یا صاف جواب مل سکے کیونکہ جب ہم یہ دیکھیں کہ حکومت کے فرایض ایک بادشاہ اور ایک یا متعدد مجلسوں کے درمیان منقسم ہیں تو ہم اس کی نسبت کیا خیال کریں گے۔ ایران میں شہنشاہ اور مقدونیہ میں فیلقوس یا سکندر کے اختیارات میں کوئی مجلس موثر طور پر شریک وسہیم نہیں تھی۔ ایتھنز میں کوئی فرد واحد یا کوئی چھوٹی مجلس وسیع التعداد عمومی اکلیزیا کے مقابلے میں نہیں آسکتی تھی لیکن جدید دنیا میں تقریباً ہر جگہ صورت معاملات اس کے برعکس ہے چنانچہ انگلستان کے دستور پسندوں کو فی الواقع اس پر فخر وناز تھا کہ انگریزی دستور حکومت کی تینوں شکلوں کا ایک خوشنما امتزاج ہے اور اسمیں ملوکیت اعیانیت اور عمومیت تینوں کے محاسن موجود ہیں اور ان کے معائب سے یہ کلیتہً پاک ہے۔ چونکہ موجودہ صدی کے اثنا میں براعظم یورپ کے تقریباً ہر ملک میں عمومی ادارت رائج کردئے گئے ہیں اس لئے فرانس، جرمانیہ، اطالیہ اور اسپین اگر چاہیں تو وہ بھی اسی قسم کا فخر کر سکتے ہیں۔ ہر جگہ بلکہ ممالک متحدہ امریکہ میں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ

حکومت واحد، متعدد اور کثیر کے درمیان منقسم ہے۔ انگلستان شاہی کہلاتا ہے اور بادشاہ کے پہلو میں ایک دارالامرا اور ایک دارالعوام بھی موجود ہیں یہی حال اطالیہ کا ہے۔ یہی حال پروشیا، بلجیم، ہالینڈ، اسپین اور پرتگال کا ہے۔ فرانس اور امریکہ کا ظاہری دعویٰ یہ ہے کہ وہ جمہوری ہیں مگر دونوں میں عمومی مجلس کے پہلو بہ پہلو ایک قلیل التعداد مجلس سنیات اور ایک اعلیٰ صدر بھی موجود ہوتا ہے۔ امریکہ کے مجلس سنیات کو قطعی طور پر ہمارے دارالامرا سے زیادہ قوت حاصل ہے اور امریکہ کے رئیس کو قطعی ہمارے بادشاہ سے زیادہ قوت حاصل ہے

پس ان مملکتوں کو ہم کس قسم میں قرار دیں گے۔ یہ عام دستور ہے کہ انگلستان کو شاہی کہا جاتا ہے اور امریکہ کو عمومی جمہوریت۔ اس سے کم از کم یہ معنی تو ضرور لئے جائیں گے کہ انگلستان میں اگر فرد واحد تنہا حکمراں نہیں ہے تو بھی متعدد و کثیر کے مقابلے میں اور نیز یہ کہ امریکی جمہوریت کے کسی فرد واحد کے مقابلہ میں اسے زیادہ اختیار حاصل ہے مگر صورت معاملات اس کے برعکس ہے۔ یہاں "فرد واحد" کا اختیار کثیر سے بہت کم ہے اور امریکہ کے "فرد واحد" (رئیس) کے مقابلے میں تو قطعاً اس کا اختیار کم ہے۔ پس میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمہ تقسیم ہمیں کچھ نہیں بتاتی بلکہ کہتا یہ ہوں کہ وہ صحت کے برعکس بتاتی ہے۔ [ملہ]

حق یہ ہے کہ اگرچہ ہم قدیم الفاظ برابر استعمال کرتے جا رہے ہیں مگر ہم ان الفاظ کو قدیم مفہوم میں استعمال نہیں کرتے بلکہ استعارے کے طور پر انھیں استعمال کرتے ہیں جو ایسے مبحث میں قابل قبول نہیں ہو سکتے جس میں قطعیت کا دعویٰ کیا جاتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قرار دینا ممکن ہے کہ کسی خاص مملکت میں ضابطہ کے

ملہ ۱۸۹۱ء کے سلسلے کے متوازی خطبہ میں، اس نام نہاد انگریزی بادشاہی کے مقدر کثیر التعداد کی نمائندہ مجلس کا غلبہ ظاہر کرنے کے بعد مصنف ارسطو کی دہری تقسیم کا حوالہ دیتے ہوئے یہ اضافہ کرتا ہے کہ اگر ہم سے یہ پوچھا جائے کہ آیا مجلس کل کی بہبود کے لئے ایمانداری سے حکمرانی کرتی ہے یا فاسدانہ طور پر خود اپنے نفع کے لئے حکومت کرتی ہے تو میں نہیں جانتا کہ سوا اس غیر طمانیت بخش جواب کے ہم اس کا کیا جواب دے سکتے کہ کچھ اپنے نفع کے لئے اور کچھ دوسروں کے لئے۔

ادارات جو کچھ بھی ہوں مگر حاوی و غالب اقتدار شاید قوم کے ہاتھ میں ہو یا ایک طبقے کے ہاتھ میں ہو یا کسی ذی اثر فرد کے ہاتھ میں ہو۔ ہم عمومیت و اختصار کے ساتھ اس قسم کی مملکت کو عمومی، اعیانی یا ملوکی ہی کہہ سکتے ہیں مگر ہمیں یہ خواب نہ دیکھنا چاہئے کہ ان الفاظ کو اس طرز استعارہ میں استعمال کرنے سے ہم قدیم ترتیب و تقسیم کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس تقسیم سے مقصود یہ تھا کہ اس کے لفظی معنی لئے جائیں اور اس کا اشارہ مملکت کے مسلمہ ادارات کی طرف تھا، کسی ایسے پوشیدہ اثر کی طرف نہیں تھا جس کا پتا چلانا سطح کی تہ میں نظر دوڑانے سے ہو سکتا تھا۔ اگر ہم اس قسم کے اثرات کے منکشف کرنے کے درپے ہوں اور انھیں کے تحت مملکت کی نوعیت کا یقین کرنا چاہیں تو اس طرح ہم ایک بالکل ہی نیا اور بہت ہی عجیب و غریب اصول تقسیم اختیار کریں گے، خواہ ہم قدیم اصطلاحات ہی کے پابند کیوں نہ رہیں۔

لیکن جیسا کہ چاہئے اگر ہم ان اصطلاحات کو ہمیشہ ان کے لفظی مفہوم میں لیں تو پھر میرا خیال ہے کہ اس قدیم تقسیم کو ہم بہت ہی کم کار آمد پائیں گے۔ مثلاً کہتا ہوں کہ روما کی صورت تقریباً ویسی ہی پیچیدہ نظر آتی ہے جیسی انگلستان کی ہے۔ مجلس قبایل جو ایک عمومی مجلس تھی کبھی کبھی وہ بالکلیہ حاوی معلوم ہوتی ہے مگر زیادہ عام طور پر سینات حاوی نظر آتی ہے جو ایک اعیانی مجلس تھی لیکن کسی وقت میں بھی سینات کو غیر منقسم اختیار نہیں حاصل ہوا کیونکہ اصول کثرت جس کی نمایندگی مجلس قبایلی کرتی تھی اور اصول فرد واحد جس کی نمایندگی قناصل کرتے تھے، یہ دونوں بھی ہمیشہ وسیع اثر و اہلیت رکھتے تھے اور جب ہم قدیم شہری مملکتوں سے آگے قدم بڑھاتے اور ازمنۂ وسطیٰ اور زمانۂ جدید کی مملکتوں تک پہنچتے ہیں تو پھر ایسی مثالیں کم ملتی ہیں کہ حکومت کسی فرد واحد یا چند افراد یا کثیر التعداد اشخاص کے ہاتھ میں ہو۔ دو ایک صورتوں میں کل اختیار مستثنیٰ اسباب سے کسی فرد واحد کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور بعض مختصر و مفلوک قوموں میں جو ویران پہاڑوں کے اندر نظروں سے پوشیدہ ہوتی ہیں جس تھوڑی بہت حکومت کی ضرورت ہوتی ہے اسے کثیر التعداد افراد انجام دیتے نظر آجاتے ہیں ورنہ اور طرح حکومت ایک پیچیدہ شے بن جاتی اور اس کی تقسیم چند افراد اور مجلسوں کے درمیان ہو جاتی ہے۔ تقریباً ہر جگہ

بعض فرایض فرد واحد کے تفویض ہوتے اور دیگر فرایض بہت سے لوگوں کے سپرد ہوتے ہیں۔ نیز تقریباً ہر جگہ منتخب مجالس کے مواقع بھی آجاتے ہیں جن میں ان قابل قدر اوصاف کی نمایندگی ہوتی ہے جو چند افراد میں پائے جاتے ہیں۔

لیکن اگرچہ یہ قدیم تقسیم قابل قدر بھی ہو تب بھی کون شخص ہے جو ایک لمحہ کے لئے اسے کافی خیال کرے گا؟ کیا سلطنتوں کا فرق محض یا بیشتر حکمرانوں کی تعداد ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ یونان و روما کی قدیم تاریخوں کے مصنفین جمہوری آزادی کے خیال میں اس درجہ سرشار معلوم ہوتے ہیں کہ وہ ان قدیم سلطنتوں کی ایک ایسی خصوصیت کو بالکلیہ نظر انداز کر جاتے ہیں جو اس خیال آزادی سے بھی زیادہ دلچسپ وبدیہی معلوم ہوگی۔ بظاہر وہ اس امر کا بہت ہی کم لحاظ کرتے ہیں کہ یہ مملکتیں شہروں پر مشتمل ہیں ملکوں پر مشتمل نہیں ہیں۔ یہ کتنا عظیم الشان اور کتنا معنی خیز فرق ہے۔ کیا اس فرق کو ہماری تقسیم میں داخل نہ ہونا چاہئے کیا ہمیں یہ نہ کہنا چاہئے کہ (دونیا میں) صرف اعیانیات اور عمومیات ہی نہیں ہیں بلکہ شہری مملکتیں اور ملکی مملکتیں بھی ہیں۔ اول الذکر صنف سے قدامت کی مشہور مملکتوں یعنی ان مملکتوں کا تعلق ہے جن کا مطالعہ ارسطو نے کیا تھا اور آخر الذکر صنف سے جدید یورپ کی تقریباً تمام مملکتیں متعلق ہیں۔ علم السیاست کے جلیل القدر اساسی امتیازات میں سے اب یہ ایک امتیاز ہو گیا ہے مگر اسے اٹھارھویں صدی کے تخیلات میں تقریباً بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا تھا، بجز اس کے کہ روسو نے اسے مبالغہ کی حد تک پہنچا دیا۔

ماسوا اس کے اس قسم کی کسی حکومت کو جیسی کہ پوپ کی وہ دنیاوی سلطنت تھی جو ۱۸۷۰ء میں اس سے لے لی گئی۔ ایک کارآمد تقسیم اس حاوی خصوصیت پر پنجہ جما دے گی اور اسے ان دوسری حکومتوں کے ساتھ جو فی الواقع اسی نوع کی ہیں داخل کر دے گی، مگر کوئی ایسی ترتیب و تقسیم جو صرف حکمرانوں کی تعداد کی تحقیق و تفتیش کرتی ہو وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے؟ وہ صرف یہ معلوم کر سکتی ہے کہ حکومت زیر بحث ملوکی ہے اور اس لئے اسے لوئی چہاردہم یا ملکہ وکٹوریا کی حکومت کی صنف میں داخل کر دے گی۔ یہ یقینی ہے کہ اس قسم کی ترتیب سے ہمیں زیادہ مدد نہیں ملیگی۔ یہ صاف عیاں ہے کہ اس قسم کی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسیی

حکومت ہے۔ کیا ہم تاریخ میں کہیں دوسری جگہ بھی اس قسم کی حکومتیں پاتے ہیں؟ ضرور پاتے ہیں۔ یہود جب قید سے رہا ہو کر آئے اور ربی اعظم نے حکمران کی حیثیت حاصل کر لی اسوقت ان کی حکومت بھی اسی طرح کی تھی۔ اسی کے قریب قریب اولین اسلامی خلفاء حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ وغیرہ کی حکومتیں بھی تھیں اور تاریخ ہر جگہ اس کی تصدیق کرتی ہے کہ قسیسی اقتدار کا میلان یہ ہوتا ہے کہ وہ سیاسی اقتدار میں بدل جائے اور جب حالات موافق آجاتے ہیں تو ایسا ہی ہو جاتا ہے، لیکن اگر ایسا ہے تو کیا اس قسم کی حکومت کو ہماری تقسیم میں کوئی جگہ نہ ملنا چاہئے۔ سچ یہ ہے کہ تاریخ کے دفتر میں مذہبی حکومت ایک ایسی صورت ہے جسے وہی نمود حاصل ہے جو اعیانیت یا عمومیت کو حاصل ہے۔ اس پر بھی ارسطو نے اسے تقریباً نظر انداز کر دیا ہے اور علم السیاست کے بہت ہی جدید مصنفین نے بھی اس طرف بہت ہی خفیف سا اشارہ کیا ہے۔

پس نتیجہ یہ ہے کہ علم السیاست میں ترتیب و تقسیم کے متعلق یہ توقع کرنا چاہئے کہ وہ نہایت درجہ اہم و صعب کام ہوگا اور نیز یہ کہ وہ مسلمہ ترتیب و تقسیم جو اولاً یونانی فلاسفہ کے نہایت جانبدارانہ مختصر تحریر سے بروئے کار آئی، اس کا اطلاق ان سلطنتوں پر مشکل ہے جن سے ہمیں خاص طور پر بحث کرنا ہے اور یہ ترتیب و تقسیم کافی بھی نہیں ہے۔

خطبۂ سوم

میں نے اپنے آخری خطبے میں متمدن مملکتوں اور اکثر قدیم جماعتوں کو (جن کے لئے بالعموم مملکت کے نام سے انکار کیا جاتا ہے) یکجا کر دیا تھا اور دعویٰ یہ کیا تھا کہ ان کا باہمی تعلق ویسا ہی ہے جیسے کیڑوں اور گھونگوں کا تعلق چڑیوں اور چوپایوں سے ہے ۔ میں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ علم السیاست کو چاہئے کہ وہ ان اکثر جماعتوں کے لئے کوئی جگہ نکالے نہ کہ انھیں غیر متمدن ہونے کی بنا پر نظر انداز کر کے اپنی تحقیقات کو صرف انھیں مملکتوں تک محدود رکھے جنھیں وہ متمدن کے معزز لقب سے سرفراز کرتی ہے ۔ بایں ہمہ تمدن ایک بڑی چیز ہے اور اگر ہم اس لفظ "تمدن" کے اشتقاق پر اعتماد کریں تو یہ ایسی چیز ہے جو علم السیاست میں خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مانند و بود اور تخیل کا وہ طرز ہے جو خصوصیت کے ساتھ مدینہ یعنی شہر یا مملکت کے لئے موزوں ہے ۔ جب میں یہ قرار دیتا ہوں کہ اکثر جماعتوں کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے تو اس کے ساتھ میں یہ قرار نہیں دیتا کہ انھیں متمدن مملکت کے ساتھ ایک ہی صف میں جگہ ملنے کا اس سے کچھ زیادہ استحقاق ہے جتنا حیوانات میں ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے (ذو فقار) جانداروں کی صف میں گھونگوں کو جگہ ملتی ہے اور چونکہ ہمارا خیال ہے کہ ہم مملکتوں کی ترتیب و تقسیم پر غور کریں اور اس کے لئے ہمیں وسیع اختلافات کی جستجو میں پڑنا چاہئے، پس ہم اپنے آغاز کار کے لئے اس سے زیادہ وسیع و نمایاں فرق کوئی اور نہیں پا سکتے ۔ اگر ہمیں اس سوال کا کوئی جواب مل سکے کہ کیوں بعض جماعتیں دوسری جماعتوں سے اسقدر متغایر ہیں کہ ہم ان کے لئے مطلقاً مملکت کے نام ہی سے انکار کر دینے پر مائل ہو جاتے ہیں تو ہمیں جن امتیازات کی حاجت ہے

اس کے جواب سے ایک نہایت ہی اساسی اور نہایت ہی وسیع الاثر امتیاز ہاتھ آجائے گا۔

قدیمی مملکتوں اور متمدن سلطنتوں کے درمیاں نہایت ہی نمایاں نقطۂ اختلافات کو میں نے اپنے آخری خطبے میں خفیف طور پر ظاہر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اولیں "انسان" متمدن "انسان" سے ایک نہیں سیکڑوں طریقوں میں مغایر ہو سکتا ہے مگر جب اولین مملکت" (یعنی قدیم انسان کی سیاسی تنظیم) کا مقابلہ متمدن مملکت سے کیا جائے تو میرے خیال میں ان کا فرق ہمیشہ ایک ہی طور کا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اولین مملکت کا تعلق خاندان کے ساتھ بہت زیادہ قریبی ہوتا ہے۔ قدیم یا جدید تاریخ میں سے کسی اعلیٰ درجے کی متمدن مملکت کو لے لو تو ہمیں اس کی اور اس کے مشمولہ خاندانوں کی تنظیم کے درمیان کچھ یوں ہی سا تعلق یا توافق محسوس ہوگا۔ جدید انگلستان و فرانس یا ڈیموستھینز و سسرو کے زمانے کے یونان و روما میں خاندان کی کوئی سیاسی اہمیت باقی نہیں رہی یہ حالت اس حد کو پہنچ گئی کہ جن لوگوں نے سترھویں صدی میں مملکتوں کے آغاز و ابتدا کے متعلق خیال آرائیاں کی ہیں وہ اکثر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انھیں اس کی بھی خبر نہیں ہے کہ اپنے بدو و آغاز میں مملکتوں کا کوئی تعلق خاندانوں سے تھا بھی یا نہیں۔ اس رابطہ کی رو ہیں تک گم ہوگئی ہیں۔ فرض یہ کیا گیا ہے کہ ابتداً ایک طرح کی غیر معدود جور و زیادتی کی حالت تھی جس میں کمزور زبردست کے رحم و کرم پر ہوتا تھا اور اس حالت کا خاتمہ حکومت کے ایجاد سے ہوا۔ حکومت سے مراد ایک ایسی قرارداد سے لی جاتی ہے جس کے مطابق ہر شخص کو ابتداً جو آزادی حاصل تھی وہ اس نے ایک جزو ذاتی تحفظ کے معاوضہ میں کسی قوی شخص کو حوالہ کر دیا ہو۔ اس نظریئے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مطابق اولیں جماعت کو محض افراد کا ایک غیر منتظم انبوہ تصور کیا جاتا تھا، لیکن قانون نطرت کے مطابق سیاسی تنظیم کی ابتدا تعلقات خاندانی سے رہی ہے۔ بزرگان خاندان کا اقتدار قدیمی و ہمہ گیر ہو یا نہو مگر یہ یقینی ہے کہ جن صورتوں میں ہمیں مملکتوں کی تاریخ کی انتہائی حد تک پتا چلانے کا موقع ملتا ہے وہاں ہمیں نقطۂ آغاز میں ہمہ گیر ابتری کی حالت نہیں ملتی بلکہ وہاں ہمیں

ع۔ یہاں اصل مسودے میں پنسل سے یہ حاشیہ درج ہے کہ "لاک" کے نسبت ہابس کے متعلق یہ زیادہ صحیح ہے۔

ایک پرزور و شدید خاندانی تنظیم ملتی ہے ۔ کمزور زبردست کے رحم و کرم پر نہیں تھے کیوں کہ ہر کمزور شخص اپنے خاندان کا رکن تھا اور خاندان اس شد و مد سے اس کی حفاظت کرتا تھا کہ زمانۂ جدید کا نظم معاشرت اس کا تصور بھی نہیں قایم کر سکتا ۔ ان صورتوں سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مملکت ناقابل برداشت ابتری کے لئے ایک معجز نما تدارک کے طور پر دفعتًہ پیدا نہیں کر دی گئی تھی بلکہ فطرت نے انسان میں تنظیم کا جو تخم ودیعت رکھا تھا اس کو مصنوعی طور پر ترقی دیگئی تھی اور وہ اس طرح کہ خاندان نے محض خاندان ہونے سے کچھ آگے قدم بڑھایا اور بتدریج اتنی ترقی کر گیا اور اس قدر مزید تنظیم پیدا کر لی کہ وہ خالص خاندانوں کی قید و بند سے نکل گیا اور خاندان اب اس تنظیم کے اندر آزادانہ شکل میں دوبارہ نمودار ہوا آخر الامر اس مجازی یا خیالی خاندان کے نے خود اپنی ایک حیثیت پیدا کر لی تا آنکہ فطری خاندان کے تعلق کو اس نے اولاً فراموش کر دیا اور انجام کار میں اس سے منکر و منحرف ہو گیا ۔

یہ ملحوظ رکھو کہ میں یہ دعوی نہیں کرتا کہ تمام صورتوں میں مملکت نے اسی طریقہ سے نشو و نما حاصل کیا ہے ۔ میرا دعوی صرف یہ ہے کہ ان نہایت ہی نمایاں مثالوں میں جہاں مملکت کے نشو و نما کا سراغ نہایت ہی تیقن کے ساتھ لگ سکتا ہے مملکت نے ان مدارج کو طے کیا ہے ۔

مثال کے طور پر میں ایک مملکت کو لونگا جس سے تم بخوبی واقف ہو، یعنی قدیم روما ۔ میں اگر قدیم ایتھنز کو اختیار کروں تو یہ بھی ویسا ہی مناسب ہوگا سسرو کے زمانے میں مملکت کی نوعیت و حیثیت اس قدر ترقی یافتہ و آزاد تھی جس قدر انگلستان یا فرانس میں ہے اور جن لوگوں نے اس کے آغاز پر خیال دوڑایا وہ اسے خاندان سے متعلق کرنا ویسے ہی کامل طور پر بھول گئے جیسے زمانہ جدید میں ہابس و لاک نے اسے فراموش کر دیا ۔ انھوں نے کہا کہ رومیولس نے ایک جائے پناہ بنائی تھی جس میں غارتگر جمع ہو گئے تھے اور غارتگروں کی اس جماعت نے بعد میں دوسروں کی بیویاں چرالیں اور خود کو ایک مملکت میں منتقل کر دیا مگر ہنوز روما میں بعض ایسے ادارات موجود تھے جن کی قدامت ناقابل یاد زمانہ کی تھی اور جو سسرو اور اس کے ہمعصروں کے لئے بالکل ناقابل فہم ہو گئے تھے مگر جب

ان پر زمانۂ جدیدہ کے علما کی روایتی تاریخ کے تحت میں توجہ کے ساتھ نظر کی گئی اوران کا مقابلہ کیا گیا تو ان سے یہ راز کھلا کہ روما کی سلطنت خاندان سے ترقی کر کے بنی تھی۔ ان میں خصوصیت سے ایک ادارہ قبیلہ کا تھا ہر ایک روماتی کے نام کا دوسرا جزو جو ہمیشہ (ius) پر ختم ہوتا تھا جیسے فابیوس (Fhbius) جولیوس (Julius) تولیوس (Fallius) اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ کس قبیلہ سے اس کا تعلق ہے اور اس پر بھی سہروتے قریب قریب یہ اقرار کرلیا ہے کہ قبیلہ (Gens) کے معنی اس کے لئے بالکل ہی تاریک ہیں لیکن ایتھنز میں بھی بالکل ایسا ہی ادارہ موجود تھا اور بعض دوسری اولین جماعتوں کے تشابہ سے ہیں یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک شعب یعنی مجازی خاندان ہے جسے یہ سمجھنا چاہئے کہ مختلف قانونی مفروضات نے خاندان کو وسیع و قوی کر دیا تھا سہرو کو جس امر سے حیرت تھی وہ یہ تھا کہ اس نے اس قبیلہ (Gens) کو جس حالت میں دیکھا اس میں یہ قانونی مفروضات اس قدر نمایاں تھے کہ وہ اسے واقعی طور پر خاندان نہیں خیال کرسکتا تھا مگر ہم جانتے ہیں کہ قانون کے ارتقا میں ایک سابقہ درجہ ایسا بھی ہوتا ہے جب قانونی مفروضات پر بالکل ہی واقعانہ طور پر نظر پڑتی ہے اس لئے ہم بہت آسانی سے یہ تصور قایم کرسکتے ہیں کہ سہرد سے پانچسو برس قبل یہ ادارات (یعنی قبائل) پوری طرح قابل فہم و پر زور تھے اور اس حالت پر پہنچکر جب ہم لیوی کی ابتدائی کتابوں کو دیکھتے اور "پٹریشن" اور پلیب کے درمیان عجیب و غریب ابتدائی تنازعات کا حال پڑھتے ہیں تو ہمیں ابتدائی شعوب یعنی خاندان ہائے پٹریشن میں رومانی جماعت کے اولین جوہر اصلیہ کا پتہ چلتا ہے کیونکہ یہاں ہمیں اس پاربنہ مقولہ کے حوالے ملتے ہیں کہ پلیب کا کوئی قبیلہ نہیں ہے اب چونکہ موخر زمانہ میں اس خیال میں تبدیل ہوگئی تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ جد وجہد صرف عہدوں کے لئے نہیں ہو رہی تھی بلکہ معاشری و سیاسی حیثیت کے لئے بھی تھی۔ مختصر یہ کہ یہ جد وجہد اس توسیع کی کوشش تھی جس سے قدیم خاندانی دمدمہ ٹوٹ گیا اور خالص مملکت نے خود کو شعب سے آزاد کرلیا۔

مزید براں شہر روما کی تاریخ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا جوہر اصلیہ

متعدد قدیمی شعوب سے مرکب تھا جن میں سے ہر ایک اپنے جداگانہ مستقر میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رہتا تھا کیونکہ شہر کے قدیم ترین حصص پرانے پٹرشین کے قبیلہ کے نام پر ہیں مختصر یہ کہ متعدد شہادتوں سے بالاتفاق یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ سیسرو کے زمانہ میں یہ واقعہ بالکل فراموش ہوگیا تھا لیکن روما اولاً بجنس مگر ممیز شعوب کے معاقدے کی شکل میں ظہور پذیر ہوا جس میں سے ہر شعب ایک مجازی خاندان تھا جس میں داخلہ صرف موالات ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا تھا۔

ایتھنز کی تاریخ میں بھی یہ واقعہ تقریباً اتنا ہی بدیہی و نمایاں ہے اور تقریباً ہر ایسی مملکت میں جس کے ارتقا کی کچھ بھی یادداشت موجود ہے اس امر کا اعتراف ممکن ہے کہ اس کے موخر مراحل کی بہ نسبت اس کے مقدم مراحل میں خاندان حد سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور تم اس چشمے پر جتنا ہی اوپر کو چلے جاؤ گے اتنا ہی زیادہ تم یہ دیکھو گے کہ مملکت قبیلہ یا شعب یا قبایل و شعوب کے معاقدے کی شکل اختیار کرتی جاتی ہے۔

پس اس حد پر آکر ہم ایک ایسے شاندار امتیاز پر پہنچ گئے ہیں جو سرسری طور پر متمدن و غیر متمدن مملکتوں کے امتیاز کے متوازی ہے۔ بیشتر ہم یہی دیکھتے ہیں کہ غیر متمدن مملکت ایک قبیلہ یعنی کم و بیش ایک مجازی خاندان ہے۔

مگر کیا یہی سب کچھ ہے؟ نہیں۔ جب میں اپنے دل میں نام نہاد متمدن مملکتوں کا مقابلہ زیادہ قدیمی مملکتوں سے کرتا ہوں تو مجھے ایک دوسرا فرق ملتا ہے جو اتنا ہی معنی خیز ہے۔ میں حیرت سے یہ دیکھتا ہوں کہ قدیمی مملکت میں مذہب کو نہایت درجے اہمیت حاصل ہے۔ میں یہاں مذہب کے لفظ کو بمقبول عام مفہوم میں استعمال کرتا ہوں یعنی واقعی پرستش گاہوں کے اندر مخصوص معبودوں کی پرستش یا سامان پرستش۔ اعلیٰ مفہوم میں مجھے یہ کہنا چاہئے کہ مملکت کے اندر تمدن کی ترقی سے مذہب کو نقصان سے زیادہ نفع پہنچتا ہے مگر میں بجائے خود یہ یقین نہیں کرتا کہ مذہب کو جب اس اعلیٰ مفہوم میں لیا جائے تو مملکت خود کو اس سے آزاد کر سکتی ہے مگر جب مملکت خود کو بتدریج خاندان سے

آزاد کرنے لگتی ہے تو یہ ایک ایسا قانون ہے جس کی تاریخ شاہد ہے کہ مملکت جس قدر ترقی کرتی جاتی ہے اسی قدر اس کا میلان یہ ہوتا جاتا ہے کہ وہ اپنے کو مذہب کی اس مخصوص شکل سے آزاد کرلے جس سے قدیم دور میں وہ تعلق رکھتی تھی اور ابتدائی مرحلے میں نہایت کثرت سے یہی ہوتا ہے کہ مملکت کا مذہب کی کسی ایسے ہی مخصوص شکل کے ساتھ نہایت ہی گہرا تعلق ہوتا ہے۔

یہ امر تاریخ پڑھنے والوں سے کسی قدر پوشیدہ رہا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر مشہور تاریخیں اس زمانے میں لکھی گئی ہیں جب ان کے زیر بحث نظم مذہبی کے متعلق تشکیک پھیلی ہوئی تھی تھیوسیڈائیڈس پولی بیوس، لیوی تاسی اتوس کا اپنے یونان یا روما کے قدیم قومی مذاہب پر اعتقاد نہیں تھا۔ ارسطو کی نسبت بھی یہی حکم لگایا جا سکتا ہے پس یہ تمام مورخین وارباب تخیل کسی حد تک عقلیت سے کام لیتے ہیں اور قدیمی تاریخ کے متعلق ان کے بیانات میں مذہبی رنگ ایک بڑی حد تک ناپید ہوجاتا ہے۔ با ایں ہمہ لیوی کی ابتدائی کتابوں میں یہ صاف طور پر عیاں ہے کہ پٹریشن اور پلیبے طبقوں کی باہمی کشمکش میں پر زور مذہبی جذبہ کو بھی دخل تھا اور یہ کہ اول الذکر اپنی نسبت یہ سمجھتے تھے کہ وہ قدیم مذہبی ادارات یا تبرکات قدیمہ کی حفاظت کر رہے ہیں، اور عام طور پر ہم یہ محسوس کرسکتے ہیں کہ روما و یونان دونوں جگہوں میں بعد کی نسلیں جب پیچھے مڑ کر دیکھتی تھیں تو وہ یہ محسوس کرتی تھیں کہ زمانۂ سابق میں مذہب کو زندگی عامہ میں اس سے بہت زیادہ نمایاں دخل تھا جتنا خود ان کے زمانہ میں ہے۔ یہ ویسا ہی تھا جیسا ہم اس وقت محسوس کرتے ہیں جب ہم جدید سیاسیات کا مقابلہ چارلس اول کے زمانہ کی سیاسیات سے کرتے ہیں کیبو کہتا ہے کہ ہمارے آبا و اجداد کو مذہبی معاملات میں غلو تھا اور سوفوکلس ایتھنز کے متعلق یہ بیان کرتا ہے کہ وہ اپنے انتہائی مذہبی ہونے پر فخر کرتا تھا اور درحقیقت شاعر مذکور اور اسکیلوس نے اس کی جو خیالی تصویر کھینچی ہے اس میں ایسا ہی نظر آتا ہے مثلاً یومینی ڈیس اور اپنی سنیڈیس افسانے، قدیم قسیمت دیوتاؤں العموم خالص دیوتاوی ادارات سے

بہت زیادہ قدیم تھے بہت سے آثار باقیہ جیسے "ہمسایوں کی لیگ" (Amphiatyonic Leapa) اور مجلس کیوریہ (Comitia Curitia)، یونان و روما کی تاریخ میں یہ تمام شواہد اور دوسری مملکتوں کی تاریخ میں اسی قسم کے دوسرے شواہد سب کے سب ہمیں اسی نتیجہ کی طرف لیجاتے ہیں کہ کسی شاعر نے افراد کے متعلق جو کہا ہے وہی حکم مملکتوں کے متعلق بھی لگایا جاسکتا ہے کہ "ان کی طفولیت میں آسمان ان کے گرد و پیش ہوتا ہے" یہ مثالیں قدیم غیر عیسوی مذہبوں سے دی گئی ہیں مگر گزشتہ دو صدیوں کی تاریخ نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ عیسوی سلطنتوں میں بھی ایک زمانہ آتا ہے جب سلطنتیں اپنے کو عیسوی مذہب کی اس مخصوص تنظیم سے جدا کر لینے کی کوشش کرتی ہیں جس کے ساتھ زمانۂ سابق میں وہ وابستہ تھیں۔ ملکہ این کے عہد کے قریب زمانہ تک انگریزی سلطنت ایک مفہوم میں انگریزی کلیسا کے مترادف تھی مگر اس زمانہ کے بعد سے سلطنت ایک اعتبار سے دنیاوی ہو گئی ہے اور وہ بھی ایسی صریحی طور پر کہ اس کی تاریخ کے چہرے کا رنگ تک بدل گیا ہے۔ اسی زمانہ کے قریب اس قسم کا تغیر سربرآوردہ کیتھولک سلطنتوں میں بھی پیش آیا چنانچہ اٹھارھویں صدی میں روحانی اقتدار کی روزافزوں مخاصمت برّاعظم کی تاریخ کی ایک خصوصیت ہوگئی۔

جب ہم مملکتوں پر عمومی طور سے خود اپنے نقطۂ خیال سے (جو ایک حد تک دنیاوارانہ مملکت کا نقطۂ خیال ہے) نظر کرتے ہیں تو ہم اپنی سلطنت برطانیہ کے مثل سلطنتوں اور ان دوسری سلطنتوں کے درمیان جن میں مذہب کے ساتھ سیاسیات کا گہرا تعلق ہے بڑا فرق دیکھتے ہیں۔ جدید یورپ کی سلطنتیں اور نیز ازمنۂ قدیم کے موخر عہدوں کی سلطنتیں مملکت برطانیہ کے مثل ہیں۔ دوسری صنف میں ازمنۂ وسطیٰ کی مملکتیں، مشرقی قوموں کی بیشتر مملکتیں اور ہر وہ مملکت شامل ہیں جو ابھی ابتدائی درجے میں ہیں۔ مذہب کا یہ خاص اثر یعنی سیاسیات پر اس کا دباؤ، کچھ زمانے کے بعد بالکل خاندان ہی کے اثر کی طرح افسردہ ہونے لگتا ہے کیونکہ ایک زمانے کے بعد مملکت آزاد ہو جاتی اور اپنی ذات سے اس قابل ہو جاتی ہے کہ کسی سہارے کے بغیر کھڑی رہ سکے۔ اس لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سیاسی نظریہ جس طرح خاندان کے اثر کو وسیع کر لیتا ہے اسی طرح مذہب کے اثر کو بھی پھیلا دیتا ہے، کیونکہ سیاسی نظریہ کا تعلق عام طور پر

مملکت کے اسی ترقی یافتہ دور کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ آزاد ہو چکتی ہے۔ ارسطو اپنی کتاب "سیاسیات" میں مذہب کی بحث کے متعلق تقریباً بالکل ہی خاموش ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ یہ اعتراف نہیں کرتا کہ حکومت کی ایک نہایت ہی اہم و عام شکل یعنی حکومت مذہبی کلیتہً مذہب پر مبنی ہوتی ہے بلکہ وہ اس کا بھی اعتراف نہیں کرتا ہے کہ ابتدائی دوروں میں مذہب مملکت کے لئے قبیلے کی حد سے نکل کر ترقی کرنے کا ایک ممتاز سبب ہوتا ہے۔ ہم جب علم استقرا اور تاریخ کی بنا پر قایم کریں تو اس خصوص میں ارسطو کی پیروی ہمارے لئے قطعاً ناممکن ہوگی۔ تاریخی اعتبار سے مذہب اکثر و بیشتر مملکتوں کے نشو و نما کے زمانہ میں ان پر حاوی اثر رکھتا ہے۔ بعض نمایاں صورتوں میں تو مذہب ہی سلطنت کا پیدا کرنیوالا معلوم ہوتا ہے اور ان دونوں ادارات کے جداجدا کر دینے کا خیال تو کجا، عام طور پر صدیاں گزر جاتی ہیں کہ مملکت اور مذہب کے دو جداگانہ تصورات میں امتیاز ہو سکے۔ پس جو مملکتیں متمدن کہلاتیں اور جو زیادہ ابتدائی حالت میں ہوتی ہیں ان دونوں کے درمیان یہیں سے ایک اور بھی ممتاز فرق نظر آتا ہے۔ اولین مملکتوں میں نہ صرف خاندان بلکہ مذہب بھی بہت زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور اسے واقعی سیاسی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ اثر کیونکر عمل کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خاندان کے بارے میں تو ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ کیونکر خاندان کے سادے تصور کی تدریجی توسیع سے مملکت آہستہ آہستہ وجود میں آجاتی ہے مگر تاریخی حیثیت سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گاہ بگاہ مملکتیں ایک بالکل ہی جداگانہ دوسرے طریق یعنی مذہب کے توسل سے دفعتہً ظہور پذیر ہو جاتی ہیں۔ اسلام کی عظیم الشان مملکتوں پر نظر کرو۔ ساتویں صدی میں عرب قبایل کے اندر ایک مذہبی عقیدے کا وعظ کہا گیا اور ان ہنوز کمزور و غیر متمدن آبادیوں نے دفعتہً ایک زبردست مملکت کی شکل اختیار کرلی اور ایک صدی کے اندر اندر انھوں نے شہروں کی بنیاد ڈالدی، شہنشاہیوں کو الٹ دیا اور سلطنتوں کی ایک عظیم الشان وفاقیت قایم کرلی، جو کرۂ ارض کے ایک معتد بہ حصے پر وسیع اور ایک مشترک مذہب کے وسیلہ سے باہم متحد تھی یہ اس قسم کے مظاہر قدرت کا سب سے بڑا نمونہ ہے مگر ہم کتاب مقدس میں پڑھتے ہیں کہ دو ہزار برس قبل

ایک دوسرے نبی نے اسی نوع میں کس طرح ایک شرع شایع کی اور اس شرع نے بھی اسی طریقے پر ایک مملکت قایم کر دی ۔ یہ تو مذہب کی قوت تعمیر مملکت کی انتہائی اور محیر العقول مثالیں ہیں کیونکہ ان سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہب نے فی نفسہٖ مملکتوں کو عدم سے وجود میں لا کھڑا کیا مگر مملکت کی بنا کا جہاں کہیں بھی پتا چلتا ہے، وہاں مذہب ایک ہمدوش جزو کی طرح پر ملتا ہے ۔ سامی یا حامی مشرق میں جہاں کہیں بھی کسی غیر متمدن قبیلہ نے خود کو بربریت کی سطح سے بلند کیا اور کسی قسم کا ارتقا حاصل کیا ہے، وہاں بالعموم مذہب اسلام ہی کے اختیار کرنے سے ایسا ہوا ہے (مگر) یورپ میں کلیسا کے ساتھ اتفاق پیدا کرنے سے یہ ہوا کہ جرمانی قومیت نے اول اول پائدار سیاسی ادارات مہیا کئے ۔ اسی طرح پر کلووِس فرینکی شہنشاہی کے قیام کا باعث ہوا اور پے پین نے اسے بحال کیا ۔ انگلستان میں بھی مذہب ہی نے قبیلوں کو اول اول متحد کیا اور انگریزی سلطنت کی بنا ڈالی ۔

یہ کہ خاندان میں یہ اہلیت کیوں ہے کہ وہ ترقی کر کے مملکت کی صورت اختیار کر لے" اس کی وجہ یہ ہے کہ خاندان افراد کے درمیان ایک مضبوط رابطہ پیدا کر دیتا ہے ۔ بیٹا نہایت ہی گہرے مفہوم میں باپ سے متعلق ہوتا ہے اور اسی طرح خاندان کے ارکان ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ایک مرتبہ جب ایسا مستحکم رشتہ ہاتھ آجاتا ہے تو پھر انسانی ترکیب و اختراع درجہ بدرجہ مناسب تنظیم کا اضافہ کر لیتی ہے مگر اس رشتے کا ہونا لابدی ہے ۔ اب وہ دوسرا واحد اثر جو اس قسم کا رشتہ پیدا کر لیتا ہے وہ شاید مذہب ہے ۔ وہ مذہبی جماعتیں قایم کرتا ہے اور جب تک کہ مذہبی اثر حقیقی طور پر باقی رہتا ہے، یہ مذہبی جماعتیں خاندان ہی کے مانند اپنے ارکان کو زندگی اور موت کے لئے متحد کر دیتی ہیں ۔ ممکن ہے کہ یہ اتحادات غیر متمدن ہوں، جس معبود کی پرستش ہوتی ہو، جو رسوم ادا کئے جاتے ہوں، ان میں سے بعض باہر کی دنیا کو نفرت انگیز معلوم ہوں اور بعض شریفانہ و قابل قدر معلوم ہوں، مگر اچھا ہو یا برا، مذہب جو رشتہ پیدا کر دیتا ہے وہ اسی قسم کے مضبوط، فطری، اولین اور شعوری طور کا ہوتا ہے جو صدیوں تک قایم رہتا ہے اور اپنی جماعت کو لاتعداد ترمیمات و ترقیات کا موقع دیتا رہتا ہے اور اسے اس طرح باہم مربوط رکھتا ہے کہ جسم منتشر نہیں ہونے پاتا ۔

پس اب ہم دو طریقے دیکھتے ہیں جن سے سلطنت وجود پذیر ہوتی ہے ممکن ہے کہ اس کی بنا خاندان کے اندر ہو اور ممکن ہے کہ اس کی بنا مذہب کے اندر ہو مگر سوال یہ ہے کہ آیا یہ بنیادیں فی الواقع ایک دوسرے سے ممیز ہیں؟ ہم یہاں خیال آرائی کا ارادہ نہیں رکھتے، ہم واقعہ و تاریخ کے بیانات کی پیروی کرنا چاہتے ہیں تجریدی طور پر جو کچھ بھی ممکن ہو مگر تاریخی تجربے میں یہ دونوں بنیادیں علی العموم ایک ساتھ پائی جاتی ہیں۔ خاندانی اثر اور مذہبی اثر پہلو بہ پہلو عمل کرتے ہیں۔ آنحضرت محمد صلعم نے ایسے افراد کو یکجا نہیں کیا تھا جو متفرق و منفرد رہے ہوں بلکہ آپ نے ان قبیلوں کو یکجا کیا تھا جو ایک دوسرے سے ممیز تھے اور اس سے بڑھکر یہ کہ اپنے اس امتیاز کے باوجود وہ سب یک جدی تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک کلیسا یا ایک مذہبی قوم بنائی مگر یہ مختلف قبائل ہی کے امتزاج سے بنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس قوم کے پس پشت ہم ابوی یا ابراہیمی ملت کو دیکھتے ہیں۔ دوسری مثالیں لو۔ روما کی ابتدائی تاریخ میں ہمیں ایک مذہبی قانون ساز نوما پامپلیس نظر آتا ہے جو اپنی جماعت کو اس کی سیاسی طفولیت ہی میں مذہب کا ایک مشرح و مبسوط نظم عطا کرتا ہے۔ ہم نوما کی شخصیت پر کوئی خاص زور نہیں دے سکتے ہیں مگر یہ صاف عیاں ہے کہ قدیم روما کو شدید مذہبی جذبات کے ایک مرحلے سے گزرنا پڑا تھا کیونکہ تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ روما کے مذہبی ادارات اس کے سیاسی ادارات سے زیادہ قدیم تھے اور یہ کہ جس زمانے میں روما میں شاید ہی کوئی ناظم و حاکم رہا ہو، اس زمانے میں روما میں پجاریوں کے بہت سے سلسلے اور بہت سے بت خانے موجود تھے۔ اس عالمگیر مملکت کا جوہر اصلیہ متبرک عبادت گاہوں کا ایک مجموعہ تھا جن میں ٹائبر کے کنارے آرامیگزما اور پیلیٹائن پر فانس کی عبادت گاہ تھی اور پھر کیپیٹولاین پر جوپیٹر کا عظیم الشان مندر تھا۔ پس کیا اس صورت میں ہمیں یہ کہنا چاہیئے کہ روما ایک قدیمی کلیسائی کیفیت سے ترقی کرکے ایک عظیم الشان مملکت ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایسا کہہ سکتے ہیں مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ بھی اتنا ہی صحیح ہے کہ روما نے قبایل یا شعوب کی ایک لیگ سے ترقی کی۔ اس قدیمی جماعت میں قبایلی خصوصیت ویسی ہی نمایاں ہے

جیسی مذہبی خصوصیت اور اس سے کم نہیں ہے جتنی عبرانی جماعت کے قدیم ترین شکل میں تھی۔ پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی شکل قومی شکل سے مغایر نہیں ہے بلکہ اسے بالائی طور پر عائد کیا جاسکتا ہے ممکن ہے کہ قبیلہ ہی کی حسب معمول ترقی سے وہ خود پیدا ہو جائے۔

بہرحال یہ جو کچھ بھی ہو، یہ یقینی ہے کہ بعض جماعتوں میں مذہبی رنگ بہت زیادہ نمایاں ہے اور بعض جماعتوں میں قبائلی رنگ۔ مزید براں مملکت کے یہ دونوں اصناف ہیں اولین و قدیمی طرز کے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ہم ایک تیسری صنف سے مانوس ہو گئے ہیں جن میں مذہب و خاندان دونوں کے اثرات مملکت پر بہت ناپدید ہو گئے ہیں اور یہاں مملکت نے دونوں سے خلاص حاصل کر لی ہے۔ یہ ایک وسیع تعمیم ہے۔ مگر یہ بعید الفہم نہیں ہے۔ اس میں صرف وہ چند واقعات جمع کئے گئے ہیں جن میں سے اکثر کو اگر نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو یہ صرف اس وجہ سے کہ وہ نہایت وسیع و بدیہی ہوتے ہیں۔ بعض جماعتوں میں مملکت کے تصور کا فقدان نظر آتا ہے مگر ان کی ترقی دوسرے اعتبارات سے بھی ناکمل معلوم ہوتی ہے، لہٰذا وہ سیاسی متخیلین جو کمل مملکتوں کی جستجو میں تھے وہ اس قسم کی جماعتوں کو نظر انداز کر گئے کیونکہ یہ جماعتیں مملکت ہونے کا دعوے تک نہیں کرتیں لیکن چونکہ میرا مقصد یہ ہے کہ ان تمام سیاسی مظاہر قدرت کو جو حقیقت میں ایک ہی نوع کے ہوں یکجا کیا جائے اور چونکہ یہ جماعتیں اگرچہ مملکت کا نام نہیں اختیار کرتیں مگر اسی نوع کی معلوم ہوتی ہیں جس نوع کی مسلمہ مملکتیں ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ شامل ہو جائیں۔ میں ان کی دو وسیع قسمیں پاتا ہوں ایک وہ جس کا اثر میرے دل پر پہلے پڑتا ہے کیونکہ وہ خود نہایت ہی غیر متمدن اور متمدن سلطنتوں سے نہایت درجہ مشابہ ہے اور یہ قبیلہ ہے، جسے میں زیادہ تر دنیا کے وسیع صحرا، شمالی افریقہ عرب اور وسط ایشیا وغیرہ میں پاتا ہوں مگر میں ایک اور قسم بھی پاتا ہوں جسے قبیلہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان میں بالکل دوسرے ہی خصوصیات ہوتے ہیں۔ سلطنت ترکیہ اس کی ایک عظیم الشان مثال ہے۔ یہ نوع اکثر بہت وسیع ہوتی ہے اور اس میں اکثر بہت کچھ تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہمیں اس حالت کی یاد دلاتی ہے

جس حالت میں خود یورپ کی قومیں ازمنۂ وسطیٰ میں تھیں اور ہم اسے غیر متمدن ہونے کے بجائے زیادہ تر ازمنۂ وسطیٰ کی کیفیت کے مطابق سمجھتے ہیں۔ اس کی نمایاں ہئیت خاندان نہیں بلکہ مذہب ہے۔ ترکی شہنشاہی میں کسی شخص کی قومیت کا کوئی سوال نہیں اٹھتا بلکہ صرف اس کے مذہب کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ پیروان حق سب برابر ہیں، اور انسانوں کا فرق صرف اس بنا پر ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم۔

پس اب ہمارے سامنے مملکت کی تین وسیع قسمیں ہیں ایک خالص مملکت ہے دوسری قبیلے کی مملکتیں اور تیسری وہ مذہبی جماعت جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اسے ہم شاید مذہبی حکومت کہہ سکتے ہیں۔

یہ سب کی سب اس مفہوم میں مملکت ہیں کہ وہ سب یکساں طور پر ایسی جماعتیں ہیں جن سے انسان کا تعلق زیست و حیات کا ہوتا ہے مگر یہ جماعتیں محض فطری خاندان سے ممیز اور ان سے وسیع تر ہوتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ کس اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس نیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں جس نیت سے انسان ان کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں جماعت کے ارکان جو اس قدر گہرے طور پر اس سے وابستہ ہوتے ہیں ان کا تصور اس جماعت کی نسبت کیا ہوتا ہے۔ کسی اہل قبیلہ سے یہ سوال کرو کہ کس شے نے اسے اس قبیلے سے وابستہ کر رکھا ہے اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ اس قبیلے سے اس کا تعلق ہے تو اس سے اس کی مراد کیا ہوتی ہے؟ اس کا جواب وہ یہ دے گا کہ "خون پانی سے زیادہ گاڑھا ہے" یعنی وہ قرابت کی وجہ سے اپنے قبیلے سے متعلق ہے۔ وہ ایک میک گریگر یا گارڈن ہے اور سے انہیں کا ساتھ دینا ہے۔ یہی سوال کسی یہودی یا مسلمان سے کرو۔ وہ ذاس کے جواب ہیں) اس خدا کا ذکر کریگا جس پر وہ ایمان لایا ہے اور شاید وہ ختنہ کا بھی تذکرہ کریگا۔ کسی انگریز یا فرانسیسی سے پوچھو تو وہ اس کا کچھ اور ہی جواب دیں گے اور اس جواب کا چند الفاظ میں ادا کرنا ایسا آسان نہیں ہے ان کے جواب کا ماحصل یہ ہوگا کہ ایک عظیم الشان انگلستان یا ذی مرتبہ فرانس ہے

تعلق رکھتا بے انتہا فواید کا باعث ہے۔ پس ان میں سے ایک شخص اتحاد نسل کا ذکر کرتا ہے، دوسرا اتحاد مذہب کا تیسرا اتحاد مقصد کا، مگر اس پر سب متفق ہیں کہ یہ رشتہ جو کچھ بھی ہے مگر ہے نہایت مستحکم واستوار اور یہ کہ جس جماعت سے ان کا تعلق ہے اگر وہ خطرے میں پڑ جائے تو وہ اس کے لئے ہر طرح کی قربانی کرنے کے لئے اخلاقاً پابند ہیں۔

پس مملکتوں کی ترتیب وتقسیم اس نیت کے اعتبار سے ہو سکتی ہے جو انہیں باہم مربوط رکھتی ہے اور غالباً یہ سب سے زیادہ جامع اصول ہے یعنی یہ ایسا ہی اصول ہے جو شکل حکومت کے تمام اختلافات سے پاک ہے اور جو ان ادنٰی سے ادنٰی ترقی یافتہ عضویات پر بھی شامل ہے جنھیں سیاسی ہونے کا دعوٰی ہو۔ یہ اصول اسی طرح مفید ہے جس طرح ترتیب وتقسیم کے وہ تمام اصول مفید ہیں جن کی بناء حقیقی واہم اختلافات پر ہے یعنی یہ منتشر واقعات کی ایک وسیع مقدار کو یکجا کرکے انہیں کام لینے کے لائق بنا دیتا ہے، لیکن اس حد پر پہنچکر ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ سیاسی جماعت ان تین شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں ہمیں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فرض نہ کرنا چاہئے کہ (لفظ نوع جس معنی میں علم خواص الاعضا میں استعمال ہوتا ہے اس معنی میں) ہمیں تین مختلف انواع ہاتھ آ گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایسے اقسام نہیں ہیں جو اس قدر قطعی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہوں کہ وہ یا تو مطلقاً ایک دوسرے میں شامل ہی نہ ہو سکتے ہوں یا اگر ہو بھی سکتے ہوں تو مدت ہائے دراز کے گزرنے پر، (بلکہ) اس کے برخلاف، تمام صور تہائے ظاہری سے یہ عیاں ہے کہ یہ صرف ایک ہی مملکت کے ارتقاء کے تین مختلف مدارج ہیں کیونکہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ ان تینوں مقاصد پر عام طور پر جدا جدا عمل نہیں ہوتا البتہ ان تینوں مقاصد میں سے ایک عام طور پر حاوی ہوتا ہے مگر دوسرے بھی عام طور پر یا تو نہایت ہی ابتدائی حالت یا انحطاط کے عالم میں نظر آ سکتے ہیں۔ اس کی مثال اس سے روشن تر نہیں مل سکتی کہ ہم خود مملکت انگلستان پر اور جس طرح ہم اسے سمجھتے ہیں اس پر لحاظ کریں انگلستان کی مملکت خود مختار ہے۔ ہم ارتقا کے بلند مرتبے پر پہنچے ہوئے ہیں،

ہم اس مملکت سے زیادہ تر اسی وجہ سے تعلق رکھتے ہیں کہ ہم اسے مفید و سود مند پاتے ہیں جو رشتہ ہم سب کو مربوط کئے ہوئے ہے وہ اتحاد مقصد کا رشتہ ہے مگر کیا اس کا یہ منشا ہے کہ دوسرے قدیم تر مقاصد کا وجود بالکلیہ فنا ہو گیا ہے اور یہ قدیم تر روابط بالکلیہ شکست ہو گئے ہیں؟ ہر گز ایسا نہیں ہے۔ ہم سب اب بھی انگریز ہیں۔ جب انگریز اپنے مستعمرات کا ذکر کرتے اور اس خیال سے خوش ہوتے ہیں کہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے کو اُن سے جدا نہ کر سکینگے، تو وہ اب بھی وہی قدیمی فقرہ استعمال کرتے اور کہتے ہیں کہ خون پانی سے زیادہ گاڑھا ہے۔ مذہبی رشتہ بھی کسی جہت سے نہ صرف افراد بلکہ خود مملکت کو باہم مربوط رکھنے سے ساقط نہیں ہو گیا ہے۔ مسلمانوں یا بت پرستوں کی موجودگی میں ہم نہایت ہی صریحی طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں اور جب ہم اطالیہ یا اسپین میں سفر کرتے ہیں تو اسی طرح ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہم پروٹسٹنٹ ہیں۔

پس اس طرح ترقی یافتہ جماعات میں تینوں مقاصد ایک ساتھ عمل کرتے ہیں۔ یہ خالص مملکتیں ہوتی ہیں جو اغراض کے ذریعہ سے مربوط ہوتی ہیں۔ یہ ان کی حاوی خصوصیت ہوتی ہے مگر یہ نہیں ہوتا کہ حکومت ہائے مذہبی جو مذہب کے ذریعہ سے مربوط ہوتی ہیں ان کی نوعیت کو انھوں نے بالکلیہ ترک کر دیا ہو، نہ یہ ہوتا کہ انھوں نے قبایل کی نوعیت کو جو قرابت سے مربوط ہوتے ہیں ساقط کر دیا ہو۔

بہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ مذہبی مملکت میں اگرچہ مذہبی مقصد حاوی ہوتا ہے مگر قبایلی مقصد بھی عام طور پر اپنا عمل کرتا رہتا ہے۔ اس مملکت میں مذہبی ہونے کے ساتھ ہی قبیلہ یا قبیلوں کا معاقدہ بھی ہوتا ہے۔ دوسری جانب یہ بھی گمان نہ کرنا چاہئے کہ قبایلی نیت میں حکومت مذہبی کا تخم نہیں ہوتا۔ میں نے جس شے کو مختصراً قرابت کا مفہوم کہا ہے وہ ان ابتدائی لوگوں کے دلوں میں جہاں یہ سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے کسی حیثیت سے بھی محض ویسا تعقلی امر نہیں ہوتا جیسا ہم لوگوں میں ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں یہ مفہوم

مذہب کے ساتھ قوی طور پر ملا ہوتا ہے۔ یہ اسلاف کی ایک طرح کی پرستش ہوتی ہے اور جس طرح اسلاف دیوتا سمجھے جاتے ہیں اسی طرح دیوتا اسلاف شمار ہوتے ہیں، اس لئے کوئی خط فاصل ایسا نہیں معلوم ہوتا جہاں سے خاندانی احساس ختم ہو کر مذہبی احساس شروع ہوتا ہو۔

اب اور دیکھو کہ قبیلے اور مذہبی حکومت دونوں میں مملکت خالص کے اجزاء بہت ہی صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ درحقیقت اس وقت تک مقصد متحد کا تصور خود کو جدا نہیں کر لیتا اور ہم یہ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ جب یہ حالت پیش آنے لگتی ہے تو جو لوگ قدیمی مقاصد و جذبات کے عادی ہوتے ہیں، انھیں صدمہ پہنچتا ہے وہ افادیت کا شور مچا دیتے اور قوم کے زوال کی پیشین گوئی کرنے لگتے ہیں مگر در پردہ یہ تصور ہمیشہ اپنا کام کرتا ہوتا ہے اور اس کا ظاہری اعتراف کتنا ہی کم کیوں نہ کیا جائے مگر اس کا عمل بہت قوی ہوتا رہتا ہے کیونکہ اس قسم کی ابتدائی جماعتیں ہمیشہ خطرے اور مصیبت کے سخت دباؤ میں پڑی رہتی ہیں۔ دشمن اکثر ان کے دروازے پر ہوتا ہے۔ مرد قتل عام کے اور عورتیں اور بچے غلامی کے خطرے میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان حالات میں اتحاد مقصد اس سے بہت زیادہ محسوس و مرئی اور زیادہ ناقابل انکار ہوتا ہے جتنا متمدن زمانہ کی وسیع قومی مملکتوں اور شہنشاہیوں میں ہوتا ہے، اور اگر اس کا مذکور اس کثرت سے نہیں ہوتا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ قدیمی تصورات بجائے خود اس قدر زیادہ قوی ہوتے ہیں کہ وہ معاشرے کو باہم مربوط اور باشندوں کے دلوں کو مطمئن رکھنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

پس جب ہم متمدن اور غیر متمدن جماعتوں کو ایک جگہ لانے کا تجربہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ فرق جس حد تک مدارج ترقی کا فرق ہے اس حد تک نوع کا فرق نہیں ہے۔ اور "ترقی تمدن" کا مشہور عام فقرہ ہمیں اس کا متوقع بنا دیتا ہے۔ زیادہ تر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت کی غیر متمدن مملکتیں یا وہ جنھیں ہم مشرقی سلطنتیں کہتے ہیں وہ اپنی اصلیت میں ہم سے مختلف نہیں ہیں بلکہ صرف اتنا ہے کہ انھوں نے ترقی کم کی ہے یعنی اس وقت وہ اس حالت میں ہیں جس حالت میں ہم کبھی پہلے تھے۔

میں نے تین مختلف مقاصد مملکت اور انھیں کے تناسب مملکتوں کی تین مختلف شکلوں میں تمیز قایم کی ہے مگر کیا ہم کوئی چوتھا مقصد اور کوئی چوتھی قسم مملکت کی نہیں معلوم کر سکتے۔

میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمھارے دل میں پہلا خیال یہی گزریگا کہ ایسی مملکتوں کا ملنا آسان ہے جو ان تینوں عنوانوں میں سے کسی کے تحت میں بھی نہ آتی ہوں۔ تم مثالاً رومانی شہنشاہی کا حوالہ دوگے جو مختلف نسلوں اور مختلف مذہبوں سے مرکب تھی، اور پھر یہ سوال کروگے کہ وہ کونسا مشترک مقصد تھا جسے رومانی فاتحوں اور ان کے صوبوں کی رعایا کو جنھیں رومانی پروکانسل اور پروپیٹر لوٹتے تھے باہم مربوط کر رکھا تھا اور وہ تمام سلطنتیں جن کی بنا فتح پر ہوتی ہے جہاں ایک حکمراں نسل اپنی تابع نسلوں کے درمیاں رہتی ہے، وہ سب رومانی شہنشاہی کے شکل ہیں۔ تاریخ میں یہ سلطنتیں بھی اسی کثرت سے ملتی ہیں جس کثرت سے وہ سلطنتیں ملتی ہیں جن پر اب تک ہم نے خیال دوڑایا ہے۔ پس یہ صاف عیاں ہے کہ ایک تیسرا مقصد مملکت بھی موجود ہے جو ان تینوں سے زیادہ سادہ ہے، جن کی ہم جانچ کر چکے ہیں اور وہ ان تینوں سے کم زوردار بھی نہیں ہے۔ وہ مقصد، طاقت ہے۔ حکمراں طبقہ کی جانب سے طاقت کا وہ قطعی غلبہ جس سے اولاً ہیبت اور کچھ زمانہ بعد باطنی رضا و تسلیم پیدا ہو جاتی ہے اس سے غالباً دنیا کی نصف سلطنتوں کی توجیہ ہوسکتی ہے۔

یہ امر ہمیں ایک دوسرے امتیاز کی طرف لاتا ہے جو بہت ہی اساسی امتیاز ہے ہم نے ابتدا اسی تعیین سے کی تھی کہ مملکت ایک عضویہ ہے اور جن مدارج عمل سے یہ ترقی حاصل کرتی ہے وہ ان مدارج کے مشابہ ہیں جن سے حیوانی و نباتی عضویات اپنی مخصوص شکل و تنظیم حاصل کرتے ہیں مگر یہ طبعی مدارج عمل ہیں یعنی یہ نتیجہ ہے اس قوت کا جو حیات میں موجود ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے اپنے کو موافق کرلے۔ ہم اسی کے کچھ کچھ مشابہ حالت اس وقت دیکھتے ہیں جب انسانوں کا ایک گروہ جو کسی زندہ بندش سے مربوط ہوتا ہے کسی شکل میں پھنس کر یا کسی بیرونی خطرے میں گھر کر ایک شکل اختیار کر لیتا اور ایسے اعضا پیدا کر لیتا ہے جو اسے اس دباؤ کے مقابلے کے قابل بنا دیتے ہیں یہاں ہمیں مملکت کی طبعی اصل کا مشاہدہ ہوتا ہے مگر

تاریخ ہمارے سامنے مملکتوں کا جو انبوہ پیش کرتی ہے اس میں ہم ایک پوری صنف ایسی دیکھتے ہیں جو مطلقاً اس طریقے سے وجود میں نہیں آئی ہے اگر یہ قرین انصاف نہ معلوم ہو کہ ایسی مملکتوں کے لئے مملکت ہی کے نام سے مطلقاً انکار کر دیا جائے تو پھر اس میں شک نہیں کہ ہم نے جن تین شکلوں کو نمایاں کیا ہے ان کے پہلو بہ پہلو یہ بھی ایک چوتھی شکل ہوگی۔ اس انکار کی وجہ یہ ہے کہ یہ نام نہاد مملکتیں طبعی عضویات نہیں ہیں بلکہ وہ غیر عضوی ہیں۔

چونکہ فطری سلطنتیں پہلو بہ پہلو واقع ہوتی ہیں اور چونکہ اکثر بہت ہی تنگ رقبے میں بھر جاتی ہیں اس لئے ان میں لڑائیاں واقع ہوتی رہیں اور بیشتر یہ لڑائیاں ویسی نہیں ہوتیں جیسی ہم اب یورپی سلطنتوں میں دیکھتے ہیں جو معاہدے اور تاوان پر ختم ہو جاتی ہیں بلکہ یہ لڑائیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں ایک سلطنت دوسرے کو تباہ کر دینے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ تباہی اکثر مکمل ہو جاتی ہے۔ حکومت دریا بُرد ہو جاتی، تنظیم منتشر ہو جاتی، فاتح سلطنت ملک میں داخل ہوتی اور مفتوحہ آبادی کو جواب محض ایک انبوہ رہ جاتی ہے اپنے رحم و کرم پر منحصر پاتی ہے۔ یہ فاتح سلطنت کیا کرتی ہے؟ بعض وقت یہ اس ملک کو خود اپنے ملک میں ملحق کر لیتی ہے۔ اس صورت میں وہ ایک نئی حکومت قایم کرتی ہے جو غیر ملکی عہدہ داروں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے پس پہلے جہاں دو چھوٹی سلطنتیں تھیں وہاں اب اس وقت سے اسمًا ایک بڑی سلطنت ہوتی ہے۔ چونکہ پیشتر ہمعصر سلطنتیں جنگ کرتی رہی ہیں اس لئے دراصل یہ عمل بہت ہی کثرت سے واقع ہوتا رہا ہے، اور اس وقت اکثر سلطنتوں میں کچھ ایسے اقطاع ملک اور کچھ ایسی آبادیاں شامل ہیں جو ابتداءً اسی طرز پر ملحق کی گئی تھیں لیکن ہمارے مقصد کیلئے یہ ایک ضروری شرط ہے کہ ہم اس فطری عضوی اتحاد کے (جس سے ترقی کر کے زندہ سلطنتیں پیدا ہوتی ہیں) اور اس قسم کے جابرانہ الحاق کے درمیان ایک قطعی امتیاز قایم کر دیں۔ یہ اس لئے نہیں کہ ہم اس قسم کی جبر و زیادتی پر ناپسندیدگی کا اظہار کریں (کیونکہ جیسا میں کہہ چکا ہوں ہماری اخلاقی پسندیدگی و ناپسندیدگی ترتیب و تقسیم کے سوال میں بالکل بے ربط ہے) بلکہ اس لئے کہ جو معاشرہ قوت کے ذریعہ سے مربوط ہوتا ہے اس کے اور فطری معاشرے کے درمیان اس قدر زیادہ فرق ہے کہ ان دونوں کو

ایک ہی لفظ سے تعبیر نہ کرنا چاہئے کم از کم یہ کہ اگر ہم رواج کی مطابقت میں اول الذکر کو مملکت کہیں، تو اس میں ہمیں غیر عضوی کا لفظ صفت کے طور پر لگا دینا چاہئے۔

صحیح معنوں میں اس قسم کا معاشرہ ایک دوہری شے ہے۔ فاتح طبقہ یا غول خود اپنے طور پر ایک حقیقی مملکت، ایک پر زور عضویہ ہے چنانچہ میں نے مذہبی حکومت کی مثال کامل کے طور پر ترکی شہنشاہی کا نام لیا تھا، اگر ہم حکمراں مسلمان آبادی کا خیال کریں تو اس کی حالت یہی ہے، مگر اس سے باہر انھیں اقطاع ملک کے اندر محکوم عیسائی آبادیاں بھی ہیں جو صحیح معنوں میں مطلق کوئی مملکت نہیں بناتیں نہ تو بطور خود اور نہ اپنے حکمرانوں سے ملکر، بلکہ وہ ایک غیر عضوی انبوہ ہیں۔

با ایں ہمہ، غیر عضوی نیم مملکت، عضوی مملکت کی نقل کرتی ہے اور مملکت صحیحہ کی ایک خوبی اس میں نہایت اعلیٰ درجے پر ہوتی ہے کیونکہ ہم نے یہ کہا ہے کہ مملکت میں خصوصیت حکومت کی ہے جس کے معنی ہیں قابلیت نفاذ احکام یا داش سزا، پس یہ خصوصیت غیر عضوی نیم مملکت میں موجود ہے اور درحقیقت اس کا انحصار کلی اسی پر ہے۔

اب وقت ہے کہ اس خطبے کے نتائج کا خلاصہ بیان کیا جائے۔ تاریخ اور مشاہدے سے ہمیں یہ واضح ہوتا ہے کہ انسانی آبادیاں اکثر ایک طرح کے عضوی مدارج عمل سے متحد ہوتی ہیں اور یہ مدارج عمل ان مدارج کے مشابہ ہوتے ہیں جن کے باعث فطری اجسام ایک زندہ عضویت میں جمع ہو جاتے ہیں۔ خاندان بیرونی دباؤ کے مقابلے میں پڑکر قانونی حیلوں کے ذریعہ سے اپنی توسیع و ترمیم کرتا ہے، تاآنکہ وہ ایک شعب بن جاتا ہے اور متعدد شعوب خود کو ایک وفاقی معاقدے کے ذریعہ سے متحد کر لیتے ہیں۔ دوسرے، ایک معبود کی پرستش کرنیوالے دوسرے معبود کی پرستش کرنیوالوں سے مذہبی جنگ کرتے ہیں اور جنگ کے دباؤ سے تنظیم پیدا ہوتی ہے اس لئے عضوی محکوم معاشرے کے دو طرز ہمارے سامنے آتے ہیں مگر یہ دونوں طرز عام طور پر ایک دوسرے میں ممزوج ہوتے ہیں جو معاشرہ اس طرح قرابت داری یا مشترک مذہب یا دونوں کی بنا پر قایم ہوتا ہے وہ کچھ زمانہ بعد اس امر کو محسوس

کرنے لگتا ہے کہ اس کا اتحاد خود اس کے لئے ایک قابل قدر شے ہے اور یہ کہ حکومت و تنظیم اور اتحاد باہمی کی زندگی جن افراد کو حاصل ہو وہ فی نفسہ ان کے لئے مفید ہے۔ یہیں سے عام نفع اور عام بہبود کا خیال پیدا ہوتا ہے جو قرابتداری یا مذہب وغیرہ کے خیالات سے آزاد ہوتا ہے۔ بتدریج معاشرہ خود کو ان سہاروں سے علیحدہ کرلیتا ہے اور افادے کو ترجیح دیکر اس پر انحصار کرنے لگتا ہے (اس لفظ افادے کو لازماً کسی مبتذل معنی میں نہ لینا چاہئے)

پس عضوی مملکت کا ظہور تین مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ شعوبی، مذہبی یا خالص سیاسی، مگر ظاہراہر اعتبار سے یہ تینوں شکلیں ایک ہی معتدل ارتقا کے مختلف مدارج ہیں۔

ان عضوی شکلوں کے پہلو بہ پہلو تاریخ ہمارے سامنے معاشرے کی ایک دوسری صورت بھی پیش کرتی ہے اور اگر مملکت واقعاً کوئی عضویت ہو تو اس صورت کو نیم مملکت کہنا چاہئے یہ عضوی نہیں ہے یعنی اس کا نشو ونما داخل سے نہیں ہوا ہے، یہ نتیجہ ہے فتح کا مگر اس کی شکل ظاہری عضوی مملکت ہی کے مشابہ ہوتی ہے کیونکہ یہ اسی کی تنظیم کو اختیار کرتی اور اس کی نقل کرتی ہے لیکن چونکہ تاریخ میں فتوحات کا بہت کثرت سے ذکر ہے اس لئے یہ نیم مملکت بھی اسی کثرت سے وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے جس کثرت سے عضوی مملکت نمایاں ہوتی ہے۔ ان خطبات میں اس مملکت کا ذکر اگر ہم شاذ ونادر کریں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ وہ لایق مطالعہ نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہوگی کہ اسے غور وفکر کے ساتھ ممیز کرکے اس کا جداگانہ مطالعہ کرنا چاہئے اور نیز یہ کہ ہمارے موجودہ کام کا تعلق زیادہ تر عضوی مملکت سے ہے۔

خطبۂ چہارم

میں نے آخری خطبہ میں جو ترتیب و تقسیم تمہارے سامنے پیش کی ہے، اس کا عملی فائدہ یہ ہے کہ اس سے ہمیں اولیں و غیر متمدن ملکتوں کی تاریخ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس سے ہم یہ تصور قائم کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں کہ ظاہری صورت میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو مگر یہ ملکتیں اصلاً ہیں اسی نوعیت کی جس نوعیت کی زمانۂ جدید کی متمدن ملکتیں ہیں۔ میری رائے میں، ان اغراض کے لئے یہ ترتیب و تقسیم نہایت ہی مفید ہے تاریخ میں تصورات عامہ کے نہ ہونے کی وجہ سے عام طالب علم کو ہر جگہ افسوسناک نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ واقعات کے اس سمندر میں کوئی نہ کوئی قطب نما ہمارے پاس ہونا چاہئیے۔ جدید اور حال کے زمانوں میں ہم اس قطب نما سے بالکلیہ محروم نہیں ہیں کیونکہ ہم عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ جس مقصد کی سعی کی جاتی ہے وہ آئینی آزادی ہے اور مطلق العنانی وہ عیب ہے جس کے خلاف جد و جہد کی جاتی ہے مگر اولیں زمانوں کی صورت حالات بالکل مختلف ہے یہاں ہمیں دوسرے ہی اوصاف اور دوسری ہی تعیمات کی ضرورت ہے اور چونکہ اس سے ہم بہت کم آگاہ ہیں اس لئے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اپنے مالوس اوصاف کو یہاں بھی پیش نظر رکھیں مثلاً فی الحقیقت یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ پیٹریشین طبقے کے خلاف پلیب طبقے کی جد و جہد آزادی کی جد و جہد تھی اور "عہد نامۂ قدیم" میں ہم زمانۂ اولیں کی جس طولانی تاریخ سے بہت کچھ واقف ہیں اس پران جدید اصول کا اطلاق مطلق سودمند نہیں ہے۔ تاریخ کے ان تمام حصوں میں ہمیں آزادی دستوریت، اقتدار شاہی کی روک، قانون احضار ملزم اور عمرانی حقوق کے تصورات کو ذہن سے خارج کر دینا چاہئیے۔ یہاں ان تصورات سے بالکل ہی مختلف تصورات کی ضرورت ہے، اور اس کا رشتہ اس وقت

مل جاتا ہے جب تم یہ سمجھو کہ قبائل، حکومت مذہبی سے کشاکش کرتے تھے اور حکومت مذہبی خالص مملکت سے بزرگان مذہب کسی عظیم الشان مذہبی اعلان کے ذریعہ سے قدیم قبائلی تنظیم کو توڑ دیتے تھے۔ اگسٹین، وحشی ہفت سلطنت (انگلستان) کو شکست کر دیتا ہے، یا کلووس مذہب کیتھولک کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔ ملت ایک مذہبی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بعد ازاں، آگے چلکر کسی زمانہ میں یہ حکومت مذہبی بھی مدافعانہ حالت میں آجاتی ہے۔ اب سیاسی خیالات سر اٹھانے لگتے ہیں۔ ایک شاہی خاندان اپنے قدم جما دیتا ہے۔ طبقۂ مذہبی کے نمایندے حضرت سموئیلؑ کو یہ پسند نہیں آتا کہ قوم ادارات شاہی کی طالب ہو۔ یا یہ ہوتا ہے کہ شاہی خاندان خود طبقۂ مذہبی سے متحد ہو جاتا ہے، یا یہ ہوتا ہے کہ کوئی اعیانی حکومت قسیسیت کا جامہ پہن لیتی ہے۔ اس صورت میں سر اٹھانیوالی تحریک اعیانیت یا بادشاہی پر حملہ آور ہوگی۔ مذہبی امتیاز کے احاطہ پر حملہ ہوگا اور لوگ قسیسیت و امامت کے حصار کو توڑ دیں گے۔

یہ ہے اولیں زمانے کی فریقانہ جد وجہد مگر اس اولیں زمانے کو ہم اپنے سے جتنا قریب سمجھتے ہیں وہ اس سے زیادہ قریب ہے۔ (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) تحریر تاریخ کے تقلیلی طریقہ نے قومی زندگی کے مذہبی رنگ کو محو کر دیا ہے، ہم نے ایک صورت یہ نکالی ہے کہ کلیسائی تاریخ کو ملکی تاریخ سے جدا کر کے اسے خاص کتابوں میں درج کرتے اور اس کا درجہ پست کر دیتے ہیں مگر اولیں خیالات جن کے تحت مملکت نے اول اول شکل اختیار کی وہ اسی کلیسائی تاریخ میں محفوظ ہیں چنانچہ شاہان اسٹوائرٹ کے ساتھ انگریز کی کشمکش میں صریحًا و بدیہًا بہت بڑا کلیسائی عنصر موجود ہے مگر اسے جتنا وزن دینا چاہئے اتنا وزن ہم نہیں دیتے اور یہ اس تعصب کی وجہ سے ہے جو ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے کہ اس کا تعلق تاریخ خالص سے نہیں ہے بلکہ صرف کلیسائی تاریخ سے اس کا تعلق ہے۔ اگر ہم اس جد وجہد پر بہ حیثیت مجموعی خیال کرنے کے روادار ہوتے تو ہم یہ دیکھتے کہ صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ بادشاہی سے کشمکش تھی بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ ایک ایسی کوشش تھی جس کے ذریعہ سے مملکت نے خود کو آزاد کر لیا اور اپنے مذہبی مرحلہ سے گذر گئی۔

اب ہم ایک دوسرے وسیع امتیاز کی طرف قدم بڑھا سکتے ہیں جس سے

مملکتیں مختلف اصناف میں تقسیم ہوتی ہیں۔ میں بالارادہ ایسے امتیازات کو لیتا ہوں جو نہایت ہی نمایاں ہیں کیونکہ میں سب سے بڑے اختلافات کو پہلے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

جو لوگ ہمارے اس دور جدید میں یونان و روما کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں وہ غالباً اول اول اس اساسی فرق سے متاثر نہیں ہوتے جو ازمنۂ قدیمہ کی مملکتوں اور جدید یورپ کی سلطنتوں کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ یونان و روما کی مملکتوں کا جب مقابلہ قدیم ترین مملکت بلکہ ازمنۂ وسطیٰ کی مملکتوں سے کیا جائے تو وہ بالکل جدید زمانے کی مملکتیں معلوم ہوتی ہیں۔ والٹیر کے پیرو لوئی چہار دہم کے عہد کو یونان و روما کے عظیم الشان دور کے برابر رکھتے اور دونوں کو یکساں قرار دیتے تھے اور درمیانی زمانے میں جو کچھ واقع ہوا تھا ان سب کو بھول جانے کے قابل سمجھتے تھے۔ والٹیر کے زمانے کے بعد سے مملکتہائے جدیدہ یونانی اور رومانی مملکت سے مشابہت میں اور بھی زیادہ ترقی کر گئی ہیں کیونکہ اس میں آزادی اور عمومی مجلسیں قائم ہو گئی ہیں اور پھر بھی یہ فرق کتنا وسیع ہے! یہ فرق ایسا ہے کہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مملکتوں کا فرق اختلاف محض حکمرانوں کی تعداد پر منحصر ہے وہ اس سے حیرت میں پڑ جائیں گے۔ کچھ زمانہ گزرنے پر ہم پر دفعتہً یہ روشن ہوتا ہے کہ قدما مملکت سے مراد لیتے تھے شہر اور ہم اس سے مراد لیتے ہیں ملک۔

جب میں قدما کا نام لیتا ہوں تو اس سے لامحالہ میری مراد یونانیوں اور رومانیوں سے ہوتی ہے۔ زمانۂ قدامت میں دور قدما سے خارج ہمیں اس قسم کے انتظام کے اور سراغ بھی ملتے ہیں کیونکہ کارتھیج بھی روما یا ایتھنز کے مانند ایک آزاد شہر معلوم ہوتا ہے، مگر زمانۂ قدیمہ میں شاہی متعدد نینوہ، شہنشاہی ایران اولین مصری سلطنت وغیرہ بڑی بڑی ملکی سلطنتیں بھی تھیں۔ اصلاً ہمیں اس امر واقعہ سے بحث کرنا ہے کہ یونان و اطالیہ ان دو ملکوں میں پر زور سیاسی اصول نے آبادی کے چھوٹے چھوٹے گروہوں پر تسلط جما لیا تھا اور انہیں اعلیٰ درجہ کے ترقی یافتہ عضویات میں منتقل کر دیا تھا۔ اس کے برخلاف جدید یورپ و ایشیا اور اب امریکہ میں بھی سیاسی عضویہ کا دائرہ بہت وسیع ہے اور مزید وسعت کی طرف مائل ہے۔

ازمنۂ جدیدہ میں اس عضویہ کا اصل الاصول عام طور پر ایک ایسی آبادی ہوتی ہے جو دو یا تین زبانیں بولتی ہوتی ہے مگر ان میں سے ایک زبان بالعموم غالب ہوتی ہے۔ چنانچہ سوئزرلینڈ میں تین زبانیں بولی جاتی ہیں مگر جرمانی زبان زیادہ حاوی ہے۔

آسٹریا میں متعدد زبانیں ہیں اور بڑی مشکل یہ پیش آرہی ہے کہ اب ان میں سے کوئی زبان قطعی طور پر حاوی نہیں ہے۔ قدیم یونان و اطالیہ میں زبان کا کوئی سیاسی اثر نہیں تھا۔ وہاں کے معاشرۂ سیاسی میں صرف اُن لوگوں کی مختصر تعداد شامل ہوتی تھی جو ایک ہی زبان بولتے تھے۔ یہی حال یونان میں تھا جہاں یہ زبان زیادہ وسیع خطّے پر نہیں پھیلی تھی اور پھر بھی اس خطّے کے اندر درجنوں آزاد مملکتیں تھیں۔ یہی حال اطالیہ کا تھا جہاں قریب المماثلت زبانیں ملک کے ایک وسیع حصّے پر پھیلی ہوئی تھیں اور پھر بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ روما اور ویائی اور لاطینی لیگ کے شہر زیادہ تر اسی طرح سے برسر جنگ رہا کرتے تھے جیسے ایتھنز، مگارا اور کورنتھ۔

دنیائے جدید میں پھر کسی قدر اس سے مشابہ حالت اطالیہ اور نیز سویزرلینڈ میں دیکھی گئی ہے۔ ان دونوں ملکوں میں شہنشاہ کے اقتدار کے زوال کی وجہ سے چودھویں صدی میں شہر، عملی اغراض کے لئے پھر آزاد ہو گئے تھے اور فلورنس اور وینس تو بہت ترقی کر گئے تھے۔ نیز اسی سبب سے جرمانیہ میں بھی نیورمبرگ اور فرانکفورٹ کے ایسے شہر عملی حیثیت سے تقریباً آزاد جمہوریات بن گئے تھے۔ یہ پرانے دورِ قدما کے عالم کی چشم زدن کی جھلک تھی۔ البتہ اطالیہ میں جھلک سے کسی قدر زائد تھی مگر انجام کار میں جدید میلان یوماً فیوماً چھوٹی مملکتوں کے خلاف زیادہ مستحکم ہوتا گیا اور اغلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی بڑی بڑی سلطنتیں اور بھی زیادہ عظیم الشان بن جائیں گی اور دو دو کروڑ نفوس کی سلطنت آٹھ آٹھ کروڑ نفوس کی سلطنت ہو جائے گی۔

اگر تم سونچو گے تو تمھیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ ایسے عظیم الشان فرق کے سبب سے تنظیمی کیفیت میں دوسرے بیشمار اختلافات بھی پیدا ہو جانے لازم ہیں ایک قصباتی مجلس کی حکومت سے ان قواعد پر چلنا ممکن نہیں جن پر ایک بڑے ملک کی حکومت چلتی ہو۔ اس سے ہمیں یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ آخری صدی کے سیاسی نظریات کس قدر کھوکھلے تھے، جو دورِ قدما کی سلطنتوں کی نقل کرنا چاہتے تھے اور ایسے اساسی اختلاف کو اکثر وبیشتر بھول جاتے تھے۔

میں یہاں اس کا ذکر اس وجہ سے کرتا ہوں کہ اس پر ایک تقسیم کی بنا رکھوں

مگر من حیث الواقعہ تاریخ کا ایک بہت بڑا حصہ ان دونوں قسم کی مملکتوں کی کارروائیوں پر اس قدر مشتمل نہیں ہے جس قدر کہ وہ ان دونوں قسم کی مملکتوں کے قیام کی غرض سے بنی نوع انسان کی کشمکش اور ژولیدہ کوششوں پر مشتمل ہے، خاص کر رومانی شہنشاہی کی شکست کے پہلو بہ پہلو وسیع قومی سلطنتوں کی تدریجی ترقی میں بہت وسیع پیمانہ پر متعدد پر از واقعات صدیاں لگ گئی ہیں۔ اگرچہ میرے پاس اتنی گنجایش نہیں ہے کہ میں قدم بقدم اس کا سراغ لگاؤں مگر یہاں میں اتنی گنجایش نکال سکتا ہوں کہ یہ اشارہ کر سکوں کہ کون سے اسباب اس زوردار سیاسی اصول کو اس جانب لے گئے کہ وہ مختلف ممالک میں ان دو مختلف شکلوں میں ہویدا ہو۔

ہم شاید یہ گمان کریں کہ مملکت کے قایم کرنے کا وہ تعقلی طریقہ جو فلسفیوں کو اس قدر گرویدہ کر لیتا ہے، اسی نے زمانۂ جدید کی ملکی مملکت کو تو نہیں مگر قدیم شہری مملکتوں کو واقعاً پیدا کیا ہوگا۔ شہری مملکت اس قدر مربوط تھی اور اس نے اس سرعت سے ترقی حاصل کر لی تھی کہ وہ کسی طباع خیال آرا کے اختراع سے بالکلیہ غیر مشابہ نہیں معلوم ہوتی پھر بھی شہری مملکت کا خاندان اور مذہبی جماعت سے تدریجی نشوونما حاصل کرنا اتنا ہی متیقن ہے جیسا ملکی مملکت کا (اس طرح پر نشوونما حاصل کرنا متیقن ہے)۔ اولین ایتھنز اور روما میں ایک ذرہ برابر بھی اس سے زیادہ فلسفے کا پتہ نہیں ہے جتنا اولیں جرمانیہ و انگلستان میں نظر آیا بلکہ اول الذکر میں ان موخر الذکر کے برابر ہی وثنیات اور مذہب کو دخل ہے اس لئے ہمیں کسی اور توجیہ کی تلاش کرنا چاہیے۔

تم یہ دیکھو گے کہ جس شے کو ہم قرابت کہتے ہیں اس کی کوئی طبعی حد یا انتہا نہیں ہے۔ ہر شخص کے تعلقات قرابت بے حد و غایت ہیں مگر انکی یاد میں ان میں سے صرف معدودے چند افراد ہوتے ہیں۔ ایک قبیلہ قرابت سے باہم مربوط ہوتا ہے مگر قرابت قبیلے کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔ اس حد پر جو کچھ ختم ہو جاتا ہے وہ قرابت کا وقوف ہوتا ہے۔ پس جب ہم اولیں معاشرے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں علی العموم دو قسم کی قرابتوں میں بہت ہی صاف فرق نظر آتا ہے جن میں سے ایک دوسرے کے اندر داخل ہوتا ہے۔ ایک قسم کی قرابت محدود و شعوری ہوتی ہے اور دوسری وسیع و غیر شعوری۔ ایتھنز اور روما کے اصلی قبایل کو اپنی

قرابت کا وقوف تھا مگر وہ ایسے دوسرے قبایل کے درمیان میں رہتے تھے جن کو وہ اپنا ہم نسل سمجھتے تھے۔ یہ آخری قرابتداری ان پر موثر نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ شعوری طور پر ان سے آگاہ بھی نہیں تھے لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ وہ ان سے ناواقف بھی نہیں تھے کیونکہ اہالی ایتھنز میں ہر شخص اپنے کو "ہیلن" سمجھتا تھا اور وہ لامحالہ یہ جانتا تھا کہ اس کی زبان کو تھبز یا کو رنتھ سے آنے والے تو سمجھ سکتے تھے مگر صور اور بابل سے آنیوالے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ تمام یونانیوں کی عام قرابتداری ایک طرح پر ہمیشہ فرض کر لی جاتی تھی مگر پھر بھی اس پر کبھی غور نہیں کیا جاتا تھا، اس سے کوئی نتیجہ نہیں اخذ کیا جاتا تھا اور مملکتوں کی تکوین پر اس کا مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔

طوسی ویدش یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ ہومر کو یونانیوں کے لئے کوئی مجموعی نام نہیں ملا۔ من حیث المجموع قوم کی بابت ہومر کا تصور کچھ ایسا مبہم سا ہے کہ پڑھنے والا کسی طرح یہ نہیں سمجھتا ہے کہ ٹرائے کے رہنے والے یونانیوں سے مختلف قومیت کے تھے یا ایک ہی قومیت کے تھے۔ یہاں یہ دیکھنا بھی تعجب سے خالی نہیں ہے کہ جرمانی قبایل بھی اپنی قومیت کے تصور کے متعلق بالکل اس قسم کی گومگو حالت میں پڑے ہوے تھے ان میں بھی کوئی مجموعی نام نہیں تھا ایسے جرمانی قبایل بھی تھے جو آنکھ بند کر کے یہ سمجھتے تھے کہ ان کا ایک دوسرے سے تعلق ہے اور ان کی ایک جرمانی زبان ہے۔ رومانی مبصرین ان کے اتحاد کو دیکھ سکتے تھے مگر وہ خود اسے نظر انداز کر جاتے تھے اور گیارھویں صدی یعنی ٹیسیٹس کے ایک ہزار برس بعد تک یہ نہ ہو سکا کہ ایک مجموعی نام "تھیوٹسک ——" (Theotisc) یا "ڈوایچ" (Deutsch) ان میں رائج ہو جاتا۔ آنحضرت محمد صلعم کے قبل عربوں کی غالباً یہی کیفیت ہوگی۔ بس اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم معاشرے کے معمولی حالات میں وسیع خاندان یعنی قبیلہ کو تو قوت حاصل ہوتی تھی مگر اس سے بھی وسیع تر مجموعے یعنی قوم کو کچھ براے نام ہی سی اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ اور یہ بالکل ممکن ہے کہ ارتقا کے تمام دور میں قبیلہ اور قوم کے تعلقات باہمی بدستور یہی رہیں۔

یونان و اطالیہ میں بعینہ یہی صورت پیش آئی ان ممالک میں مختلف ہم نسل قبایل ایک دوسرے پر دباؤ ڈالتے اور ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرتے رہے اور

زیادہ تر ایک دوسرے کو دشمن ہی سمجھتے رہے تا آنکہ ہر ایک نے اس باہمی دباؤ کے تحت ہیں جدا جدا یا اپنے چھوٹے چھوٹے معاقدے بنا کر انھیں مدارج کے اندر سے گزر کر ترقی کی جن کی تشریح میں ہفتہ گزشتہ میں کر چکا ہوں ان میں قبائلی کیفیت کی بنا پر مذہبی رنگ پیدا ہو گیا اور پھر مذہبی اثرات سے آزاد ہو کر انھوں نے خالص مملکتیں قایم کر لیں۔ اس اثنا میں قوم نے بحیثیت مجموعی ارتقا نہیں حاصل کی اور جب مقدونیہ کی جانب سے ایک عظیم الشان خطرے کے باعث اتحاد عامہ کا مطالبہ ہوا تو قوم میں کوئی ایسی بنی بنائی تنظیم موجود نہ تھی جس کے ذریعہ سے وہ اس طلب کا جواب دے سکتی۔ ہر قصبہ اپنے ہمسایوں کے خلاف مسلح تھا مگر قوم کسی غیر ملکی دشمن کے خلاف مسلح نہیں تھی۔ قدیم یونان کا یہی حال تھا اور عجیب اتفاق ہے کہ از منۂ وسطی میں جب اطالیہ کے شہروں کو چارلس نے زیر کرنا شروع کیا، اس وقت وہاں بھی یہی کیفیت رونما تھی۔ قدیم اطالیہ میں نشو و نما اسی طور پر ہوا مگر نتیجہ مختلف نکلا وہاں ایک شہر باقی تمام شہروں کو نگل گیا اور جب اہالی کارتھج گال اور جرمانیوں نے اطالیہ کو خطرے میں ڈالا تو وفاقی شہروں کے اتحاد اعظم نے وہی کام کیا جو کوئی ملکی مملکت کرتی۔

لیکن صورت حالات کی ایک دوہری رفتار کا تصور بھی ممکن ہے جس میں ابتدائی مرحلہ کے بعد قبیلہ کو قوت حاصل ہونے کے بجائے ضعف لاحق ہو جائے۔ جس سے وہ مملکت کی حالت تک ترقی نہ کرے اور ابتداءً قوم میں جو دھندلا سا احساس وقوف ہو وہ اس حد تک قوت پکڑ جائے کہ قبیلہ کے وقوف کو ماند کر دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ شہری مملکت کا ارتقا رک جائے اور متعدد شہری مملکتوں کے بجائے ایک وسیع ملکی مملکت وجود میں آ جائے۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یونان، اطالیہ اور سوئزرلینڈ زیادہ تر کوہستانی ممالک ہیں اور کوئی حملہ آور ان کے قلب تک مشکل سے پہنچ سکتا ہے اور ہم نسل قبائل کی چھوٹی چھوٹی دوامی کشاکش میں متعدد زبردست قدرتی قلعے حایل ہو جاتے ہیں۔ متحدہ قبایل کسی دوسرے درے میں جمع ہو جاتے ہیں، جہاں قلعہ اور سمندر پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں اور نیچے کا میدان فورم یا جائے اجتماع کے کام آتا ہے یہاں شہری مملکت کا آغاز ہو جاتا ہے مگر کوہ آلپ کے شمال میں زیادہ تر وسیع میدان پڑے

ہوئے ہیں ، ان میدانوں میں قبایل شدید باہمی دباؤ کے بغیر گھومتے پھرتے ہیں ۔ جرمانیوں کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ شہروں سے نفرت کرتے تھے ۔ پس یہاں قبایلی مرحلہ زیادہ ارتقا کے بغیر بہت زیادہ دنوں تک قایم رہتا ہے ۔ اب فرض کرو کہ اس غیر ارتقا یافتہ قوم پر باہر سے کوئی بہت بڑا حملہ ہو جائے تو اولاً وہ شہری مملکتوں کی بہ نسبت زیادہ بیدست وپا ثابت ہوگی کیونکہ اس کے پاس قلعے نہ ہوں گے ، چنانچہ روم کی یورش اور سلافیوں کے تدریجی اقدام کے سامنے جرمانی قبایل اپنے ممالک کی مدافعت نہ کر سکے بلکہ اسے چھوڑ کر شہنشاہی کی سرحد کو عبور کر کے وہاں ٹڈی دل کی طرح جمع ہو گئے اسی طرح انگلستان میں قبایل اولاً خفیف مقابلے کے بعد ڈنمارک والوں کے مطیع ہو گئے مگر اس قسم کی قوم میں ایک محفوظ ذخیرہ ایسا ہوتا ہے جسے شہری مملکتوں والی قوم زایل کر چکی ہوتی ہے ۔ یونانی جس کام کو اس وجہ سے نہ کر سکے کہ ان کی شہری مملکتوں نے ان کی ساری قوت کو جذب کر لیا تھا ، اس کام کو یہ قوم اب بھی کر سکتی تھی یعنی وہ ایک قومی مملکت بنا سکتی تھی ۔ یہ وہی امر ہے جسے ہم اکثر صورتوں میں واقع ہوتے دیکھتے ہیں ۔ انگلستان کی قومی مملکت اول اول الفرڈ کے تحت میں اس وقت بنی جب ڈنمارک والوں کے خلاف تمام قوم مدافعت کے لئے تیار ہو گئی تھی اسی طرح وہ جرمانی جنھوں نے پانچویں صدی میں ہن قوم کے سامنے سپر ڈال دی تھی دسویں صدی میں ہنری اور اوٹو کے زیر سایہ کامیابی کے ساتھ مجاروں کے خلاف مجتمع ہو گئے ۔ ہنری جرمانیہ کا بانی شہر کہا جاتا ہے کیونکہ اسی نے اول اول ملک کو قابل مدافعت بنایا اور سیکسنی خاندان شاہی کے اسی دور عظمت کے بعد سے ہم جرمانیہ کے قومی احساس و وقوف کی تاریخ مقرر کر سکتے ہیں ۔ اس کے بعد جلد تر "ڈوئچ" کا اجتماعی نام کی صدا ہمارے کانوں میں پڑتی ہے ۔

یہی وہ اسباب معلوم ہوتے ہیں جو اپنا عمل کر رہے تھے ۔ بہر صورت امر زیر بحث نہایت اساسی اور قابل لحاظ ہے ۔ وہ یہ کہ سیاسی اصول اپنے زیادہ ترقی یافتہ مرحلے میں جب وہ اپنی قبایلی اور مذہبی زندگی کو کسی قدر پیچھے چھوڑ دیتا اور مملکت خالص کو وجود میں لاتا ہے تو اس مملکت کو یہ دو مختلف شکلوں سے

پیدا کرتا ہے۔ ایک چھوٹی اور گھٹی ہوئی صورت ہوتی ہے اور دوسری بے انتہا وسیع اور اس لئے ایک مدت دراز تک ڈھیلی سی ہوتی ہے۔ یہ ان واقعات میں سے ایک واقعہ ہے جنھیں مشاہدہ بہت آسانی سے منکشف کردیتا ہے۔ کیونکہ یہ تاریخ کی سطح کے اوپر واقع ہوتا ہے لیکن مملکت کی نوعیت پر ہم کتنی ہی مجردانہ بحث کرتے رہتے پھر بھی غالباً ہم اس نتیجہ پر پہنچتے کہ جس طرح مملکت کی دو شکلیں ہیں اسی طرح ویسے نایدہی بخوبی ہوسکتی ہیں شاید ایسی اور شکلیں بھی تاریخ میں ہمارے سامنے موجود رہی ہوں مگر شہری مملکت اور قومی مملکت کا یہ امتیاز اس وجہ سے خاص طور پر یادگار ہوگیا ہے کہ نشر واشاعت علمی کے دو خاص دور جو تاریخ کو معلوم ہیں یہ ان کے متوازی واقع ہوا ہے۔ یونانیت کا زمانہ شہری مملکت کے فیروزمندی کا زمانہ ہے (اور اس پر ہم اطالوی نشاۃ جدیدہ کا بھی اضافہ کرسکتے ہیں) دوسری طرف قومی مملکت کی یورپی برادری نے ہر قسم کی طاقت، علم کا وہ وسیع نشو ونما مہیا کیا ہے جس نے زمانۂ جدید، کے تمدن کو ممتاز کردیا ہے۔

مگر ہمارا مقصود ترتیب وتقسیم ہے۔ پس ہمیں اس فرق پر ذرا زیادہ قریب سے نظر ڈالنا چاہیئے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ اس میں کیا کچھ شامل ہے کیونکہ پہلی نظر میں یہی معلوم ہوگا کہ قدیم ایتھنز اور جدید انگلستان میں صرف وسعت ملک کا فرق ہے ایتھنز کے قبضہ میں شہر کے گرداگرد زمین کا ایک محدود وتنگ حصہ تھا درانحالیکہ لندن کے گرداگرد ایک بہت وسیع قطعۂ ملک موجود ہے، لیکن یہ عیاں ہے کہ ان دونوں کے مابین محض وسعت ملک کا ہی فرق نہیں ہے۔ ایک جانب جو عضویہ ہے وہ ایتھنز ہے نہ کہ اٹیکا دوسری جانب انگلستان عضویہ ہے نہ کہ لندن۔ وہاں لوگ شہر کی نسبت سے اہل ایتھنز کہلاتے تھے، یہاں وہ ملک کی نسبت سے انگریز کہلاتے ہیں۔

جب ہم اس امر واقعہ کا ارسطو کے تخیلات کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان تخیلات پر اس واقعے کا بہت ہی بڑا اثر تھا۔ پختہ سیاسی جماعت کو جو اصطلاحی نام عطا کرتا ہے وہ "مملکت" کے مانند ایسی اصطلاح نہیں ہے جو اصلاً غیر محدود ہو بلکہ واقعاً وہ اسے "شہر" کا نام عطا کرتا ہے۔ ہم یہ بھی

دیکھ سکتے ہیں کہ مقدونیہ و ایران کی ایسی عظیم الشان ملکی مملکتیں جن کا اسے علم تھا ان کا اثر اس کے دل پر یہ نہیں پڑتا تھا کہ وہ انھیں مظاہر قدرت کی اس صنف میں شمار کرے کیونکہ جب وہ مکمل مملکت کے خصوصیات قرار دیتا ہے تو وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اسے اتنا وسیع نہ ہونا چاہیے کہ کل قوم ایک واحد جمعیت میں جمع نہ ہو سکے۔

سیاسی عمل کا سادہ ترین ابتدائی تصور یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے پر حکم کرتا ہے مگر ابتدائی زمانہ میں یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ دو آدمی یکجا ہوں۔ اب فرض کرو کہ مملکت ایک شہر اور اس کے حوالی کے چند کھیتوں پر مشتمل ہونیکے بجائے ایک ایسے حلقہ پر محیط ہو جس کا نصف قطر دو یا تین سو میل کا ہو۔ اس صورت میں حکومت کا سادہ عمل قطعاً ناممکن ہو جاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ کا تقریباً نصف حصہ اس سے بھرا پڑا ہے کہ اس ابتدائی مشکل کی کشاکشی سے کس طرح عہدہ برا ہو۔

بالطبع یہ آسان ہوگا کہ مملکت کو قابل انتظام اقطاع میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر ایک میں ایک حکمراں متعین کر دیا جائے لیکن اگر بلا قیود و شرائط کے ایسا کیا گیا تو نتیجہ ایک وسیع مملکت کی صورت میں ظاہر نہیں ہوگا بلکہ اتنی ہی مملکتیں بن جائیں گی جتنے اقطاع اور ان کے جداگانہ حکمراں ہوں گے۔ پس لامحالہ کوئی خاص تدبیر درکار ہوگی۔ یہ ایک بہت ہی سادہ تدبیر ہے اور یہ درحقیقت ہر جگہ ایک ہی ہے، خواہ اسے کوئی نام دیا جائے یا کسی لباس میں اسے چھپایا جائے۔

حکومت کی دو قسموں کے درمیان ایک طرح کا فرق قایم کیا گیا ہے۔ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ بعض معاملات کا تعلق مشترکاً تمام آبادی سے ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی بعض معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں کسی خاص جوار یا مقام سے تعلق ہوتا ہے۔ ان آخر الذکر معاملات کا انصرام صدر مقام سے نہایت درجہ دشوار ہے اس لئے یہ ممکن ہے کہ ہر قطعہ میں ایک حکمراں مقرر کر دیا جائے جو بعض معاملات میں آزادانہ احکام صادر کرے۔ مگر زیادہ اہم اور زیادہ عام معاملات کے متعلق اس حاکم الحکام سے ہدایات حاصل کرتا رہے جو مرکز میں قیام پذیر ہو۔

میں سادگی کے خیال سے ہر قطعے کے متعلق "ایک حکمراں" کا لفظ استعمال کرتا ہوں۔ ہر قطعے میں متعدد حکمراں ہو سکتے ہیں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عہدہ داروں اور مجلسوں کی کوئی مرکب تنظیم ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ مرکز میں کوئی مطلق العنان ہو یا کوئی مجلس ہو یا کوئی پارلیمنٹ ہو، یا ان تینوں کا مجموعہ ہو، میں ان تمام اختلافات کو نظر انداز کر کے تمہاری توجہ صرف ایک خصوصیت کی طرف منعطف کرتا ہوں جو تمام وسیع الممالک حکومتوں میں موجود ہے اور موجود ہونا چاہئے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ مقامی اور مرکزی حکومت کے درمیان ایک امتیاز مسلم سمجھنا چاہئے یعنی جن معاملات کا تصفیہ برمحل مقامی حکمراں کر سکتا ہو اور جن معاملات کو صدر تک لیجانا ضروری ہو ان دونوں کے درمیان فرق کرنا چاہئے اس امتیاز کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے البتہ بعض تدابیر سے اسے اقل قلیل حد پر لایا جا سکتا ہے۔ جس تدبیر کو مرکزیت کہتے ہیں اور جس کا رواج مدتوں تک فرانس میں رہا ہے اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مقامی حکومت تاحد امکان معطل ہو جاتی ہے، مرکزیت، مقامی عہدہ داروں بلکہ ان کی خودمختاری تک ساقط نہیں کر سکتی البتہ وہ اس خودمختاری کو نہایت ہی تنگ حدود کے اندر لا سکتی ہے اور اسے بالکلیہ اپنے قبضے میں رکھ سکتی ہے۔ دوسری طرف وسیع شہنشاہیوں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اکثر مرکزی حکومت اسی حد تک معطل ہو جاتی ہے قدیم ایرانی اور مغولی شہنشاہیوں میں "مرزبان" اور "نظام" تقریباً خودمختار فرمانروا ہوتے تھے۔ سوس یا دہلی کی مداخلت محض رسمی مداخلت رہ گئی تھی اور سیاسی دنیا کی دوسری حد پر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے مستعمرات کی حکومت میں ڈاؤننگ اسٹریٹ کا اقتدار ناپدید ہو گیا ہے تو وہاں بھی ہمیں یہی کیفیت نظر آتی ہے۔

لیکن ان انتہائی صورتوں میں حکومت کی دونوں قسمیں پہلو بہ پہلو نمایاں ہوتی ہیں ان دونوں میں سے اگر کوئی نوع تباہ ہونے کے قریب معلوم ہوتی ہو، تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک بڑی مملکت اس کے بغیر کام چلا سکتی ہے بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عنقریب کوئی اہم تغیر ہونیوالا ہے۔ دوسری طرف اگر ہم شہری مملکت کو ایک کافی حد تک چھوٹی اور ہنوز ابتدائی حالت میں فرض کریں

تو اس میں ہم ایک ایسی صورت حالت کا تصور قایم کر سکتے ہیں جس میں حکومت کی اس طرح کی مختلف قسمیں نامعلوم ہوں تمام اختلافات ایک ہی بادشاہ کے سامنے (جو کسی دروازے میں بیٹھتا ہو) پیش ہوتے ہوں۔ ایک شخص، یا متعدد اشخاص بلکہ باری باری سے ہر شخص حکمرانی کرے اور دوسرے اس کی اطاعت کرتے ہوں تاہم تمام حکومت ایک ہی قسم کی ہو، اور مملکت کی نسبت ہمیشہ یہ سمجھا جاتا ہو کہ وہ "ناقابل تقسیم کل" کی حیثیت رکھتی ہے اور ہمیشہ ہر معاملے میں بڑا ہو یا چھوٹا، ایک ساتھ عمل کرتی ہو، وہاں ہنوز ہمارے اس موجودہ زمانے کی طرح سے گویا، دو مملکتیں نہ بنی ہوں جن میں سے بڑی دار الصدر میں مقیم ہو اور اس کا اپنا پادشاہ اور پارلیمنٹ ہو اور چھوٹی گویا خاص ہمارے جوار میں ہو جس میں اس کا صدر بلدہ اس کی مجلس ضلع یا اس کا شیرف (ناظم امن) و عدالت تعزیری کی نشست ہوتی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ شہری مملکت میں بھی کسی حد تک مقامی حکومت کا قیام ممکن ہے۔ اٹیکا میں عظیم الشان "عوام" (Demos) کے پہلو میں دیہات بھی تھے ارسطوفانیس کے نائب "اکارنیاں" کے تماشہ کے ذریعہ سے، ہم ان دونوں کے تعلقات کے سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں پھر بھی ایک "اتھنز" ایک گردن کش، پرشور آمر کل، حاکم کل، "اکلیزیا" نے ہر شے پر اپنا رنگ چڑھا دیا تھا، تا آنکہ ہم ارسطو کی اس رائے سے متفق ہو جاتے ہیں کہ جہاں کل قوم یکجا جمع نہو سکے وہاں کوئی حقیقی "پولیس" (بلدیہ یا مملکت) نہیں ہو سکتی۔

پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہری مملکت اور ملکی مملکت میں بڑا فرق، صرف ان کے اختلاف وسعت ہی کا نہیں ہے بلکہ وہ فرق یہ ہے کہ شہری مملکت میں حکومت ایک بسیط شے ہے اور ملکی مملکت میں حکومت ایک اضافی شے ہے۔ یہاں ایک طرف تو ایک حکومت عظمیٰ ہوتی ہے اور دوسری میں ایک حکومت مختصر ایک "ملک مادری" ہوتا ہے اور ایک "قریہ مادری" کیونکہ ان ملکی مملکتوں میں مختلف قریات وقصبات اکثر سابق بادشاہیوں کی جگہ پر ہوتے ہیں جنھیں ان کی خودمختاری سے محروم کر دیا گیا ہو چنانچہ انگلستان کے بعض صوبے اسی قسم کے ہیں اور انقلاب کے قبل فرانس کے صوبے بھی اسی نوعیت کے تھے۔

ان دونوں کے بین بین ایک طرح کی درمیانی حکومت بھی خیال میں آسکتی ہے اور رومانی شہنشاہی نے اس کی ایک تابناک مثال مہیا کر دی ہے۔ یہ بھی ایک مجموعہ تھا جیسے انگلستان یا فرانس کے مجموعے ہیں، مگر یہاں زیادہ تر ایک شہری مملکت میں دوسری شہری مملکتیں مل گئی تھیں۔ جس طرح انگلستان کا کوئی صوبہ ہفت مملکت میں سے کوئی مملکت رہا ہو اور اسے زیر کر لیا گیا ہو اسی طرح رومانی شہنشاہی کے اندر اطالیہ کے شہر اور تمام عالم یونان، شہری مملکتیں تھیں، جنھیں محض انتظام مقامی کی حالت میں پست کر دیا گیا تھا اور رومانی شہنشاہی اگرچہ اتنے وسیع ممالک پر پھیلی ہوئی تھی مگر اس نے کبھی بھی ملکی مملکتوں کی کامل نوعیت نہیں پیدا کی۔

لیکن شہری مملکت اور قومی مملکت کے درمیان اساسی فرق کا معائنہ کرنے کے بعد ہم اس قسم کے چند کمتر نمایاں فرقوں پر بھی لحاظ کر سکتے ہیں۔ شہری مملکت میں مقامی حکومت بمنزلہ نفی کے ہوتی ہے۔ ملکی مملکت میں وہ معتدبہ طور پر موجود ہوتی ہے اس سے ہمیں دو اصناف حاصل ہوتے ہیں، لیکن آخری صنف جس میں مقامی حکومت ہوتی ہے وہ متعدد تحتانی اصناف میں منقسم ہو جاتی ہے کیونکہ مقامی حکومتیں اہمیت کے اعتبار سے آپس میں بہت کچھ مختلف ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مقامی حکومت موجود ہو مگر نسبتاً حقیر حالت میں ہو، تاہم وہ مرکزی حکومت کی مداخلت کے مقابلہ میں اپنے کو معقول حد تک قایم رکھ سکے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے نہایت درجہ اہمیت حاصل ہو اور اس کے بھی دو درجے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مرکزی حکومت اپنی حیثیت کو قایم رکھے مگر دشواری کے ساتھ اور دوسرے یہ کہ مرکزی حکومت اپنی حیثیت کو قایم رکھنے سے عاجز آجائے اور بالکل بے حقیقت حالت کو پہنچ جائے۔

یہی موقع ہے کہ میں فردیہ اور وفاقیہ کے مانوس امتیاز کو پیش کروں۔ اس امتیاز کے تصور کے عام طریقے کے متعلق مجھے اُسی قسم کا اعتراض ہے، جیسا اعتراض ملوکیت و معدیدیت اور عمومیت کے متعلق ہے۔ یہ امتیاز ضرورت سے زیادہ رسمی اور لفظی امتیاز ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ بعض صورتوں میں مملکتیں خود کو گٹھے میں متحد کر لیتی ہیں اور مملکتوں کے یہ گٹھے عہدیت اور بعض وقت وفاقیہ کہلاتے ہیں (اس سے ہمیں مملکتوں کے دو اصناف حاصل ہوتے ہیں) ایک سادہ دوسرا

مرکب، مگر اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ مملکتیں کس طریقے پر متحد ہوتی ہیں؟ یہ تو یقینی ہیں کہ وہ رستوں سے نہیں بندھی ہوتیں۔ ہم جیوں ہی اس استعارے کی توضیح کرتے ہیں، ہم یہ دیکھ لیتے ہیں کہ سلطنتوں کی آخری قسم مرکب ہوتے ہیں۔ اول الذکر سے ایک ذرہ برابر بھی زیادہ نہیں ہے، کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہر ایک ملکی مملکت اس حد تک مرکب ہوتی ہے کہ اس میں اضلاع کی ایک تعداد شامل ہوتی ہے جن میں ہر ایک کی اپنی حکومت ہوتی ہے جو ایک حد تک خود مختار ہوتی ہے مگر ایک عام مرکزی حکومت کے ذریعے سے وہ سب متحد ہوتی ہیں۔ اس سے ہمیں یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ حکومتوں کے متحد ہونے کی نسبت جو کچھ کہا جاتا ہے وہ کس طریق پر ہوتا ہے جب چند اضلاع بعض اعتبار سے آزاد ہوتے ہیں بعض مسایل مرکزی حکومت کے فیصلے کے لئے محفوظ رکھے جاتے ہیں تو وہ اضلاع سیاسی طور پر متحد ہوتے ہیں۔ اب دیکھو کہ کسی اور طریق پر نہیں بلکہ بالکل اسی طریق پر سلطنتیں عہدیت قایم کرنے کے لئے متحد ہو جاتی ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ کی ریاستوں کے اتحاد کو انگلستان کے قصبوں اور صوبوں کے اتحاد سے یا فرانسیسی سلطنت کے صوبوں کے اتحاد سے مقابلہ کرو۔ مدارج میں بہت بڑا فرق ہے مگر اتحاد کی قسم میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے، امریکہ کی ریاستوں کے اتحاد کی وجہ یہ کہی جاتی ہے کہ ہر ریاست میں کچھ معاملات ایسے ہیں جن کی تعریف دستور مملکت میں قطعی طور پر کر دی گئی ہے اور ان کا فیصلہ ریاستی حکومت نہیں کر سکتی بلکہ ان کا فیصلہ واشنگٹن میں ہوتا ہے۔ انگریزی مملکت کی ترکیب میں جو شہر اور ضلعے متحد ہیں ان کا اتحاد اسی طریقے سے عمل میں آتا ہے۔ صرف اتنا ہے کہ انگلستان میں جو معاملات لندن کو بھیجے جاتے ہیں یا جن کے تصفیے کے لئے لندن سے لوگ آتے ہیں ان کی تعداد ان معاملات سے بہت بڑھی ہوئی ہے جن کے متعلق امریکہ میں واشنگٹن کی دخل ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

پس میں اس امر سے انکار کرتا ہوں کہ فردیہ اور وفاقیہ یا عہدیت میں نوعیت کا کوئی اساسی فرق ہے۔ میں اس سے انکار کرتا ہوں کہ کوئی ایسا مفہوم ہے جس مفہوم میں ایک سلطنت کو مرکب اور دوسرے کو مفرد کہا جا سکتا ہے لیکن میں اس اعتبار سے ان اصطلاحات کو قبول کرتا ہوں کہ ان سے نمایاں سہولت کے ساتھ ایک فرق عظیم معلوم ہو جاتا ہے جو مقامی حکومت کی اہمیت کے لحاظ سے ان مملکتوں کے درمیان قایم

ہوتا ہے۔ ہر ایک ملکی مملکت میں وزن کے اعتبار سے مقامیت اور مجموعیت کے درمیان ایک نہ ایک تناسب ہونا چاہئے مگر ملکی سلطنتیں دو وسیع اصناف میں جا پڑتی ہیں۔ ایک وہ جن میں مقامیت کو اور دوسری وہ جن میں مجموعیت کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اول الذکر میں لازماً بلدیت کا خیال اور ثانی الذکر میں وحدانیت کا خیال شائع ہوگا اور اس لئے ہم فطری طور پر اول الذکر کو وفاقی اور ثانی الذکر کو فردی کہہ سکتے ہیں۔ مگر جب ہم اس معاملے کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملکی مملکت کے دو اصناف کے بجائے تین اصناف ہوتے ہیں۔ کیونکہ فردی مملکتوں میں دو نہایت بیّن قسمیں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے قطعی طور پر ایک ہی امر یعنی مقامی حکومت کی اہمیت میں مختلف ہوتی ہیں اور اسی طرح یہ بھی بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ وفاقیت کی بھی دو قسمیں ہیں ایک قوی۔ دوسری ضعیف۔

بعض ممالک میں اس طرح کی مقامی آزادی موجود ہے اور بعض میں اس کی کمی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ بیان نہایت ہی گمراہ کن ہے چنانچہ جب ہم آزادی کے مبحث پر غور کریں گے اس وقت اسے ظاہر کیا جائے گا، مگر اس سے ایک حقیقی فرق ظاہر ہوتا ہے، جو ان مملکتوں میں نمایاں ہے جن میں مرکزی حکومت مقامی حکومت کے بہ نسبت قطعی طور پر نمایاں ہے اس قسم کی مملکتوں کی ایک صنف میں اقطاع مقامی کو ایک طرح کی معتدل مگر اس کے ساتھ ہی حقیقی و قابل قدر خود مختاری حاصل ہوتی ہے وہ بلا قید کامل طور پر مجاز ہوتی ہے کہ بعض مقتدر معاملات میں خود اپنے طور پر کارروائی کرے اور خارجی مداخلت کے بغیر خود اپنا حکم چلائے۔ دوسری صنف میں ایسا نہیں ہوتا۔ اقطاع مقامی کی خودمختاری کو ایک لابدی مضرت سمجھا جاتا ہے۔ جسے تا حد امکان گھٹانا چاہئے انہیں مقامی حکمران کو ہر امکانی رشتہ سے مرکزی حکومت کے ساتھ وابستہ کرنے اور ہر تدبیر سے اسے اپنے مستقر سے جدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ہم اکثر اس طریق کو مطلق العنانی اور اس کے عکس کو آزادی کہتے ہیں مگر ان اصطلاحات کو ایک بالکل ہی دوسرے مقصد کے لئے کام میں لانا چاہئے۔ اس کے لئے مناسب لفظ مرکزیت ہے۔ اور اس کے عکس کو صرف لامرکزیت کہنا چاہئے یہ دونوں اصطلاحیں صحیح طور پر انہیں مملکتوں کے لئے استعمال ہوتی ہیں جن میں مرکزی حکومت مقامی حکومت کی بہ نسبت قطعی طور پر زیادہ

اہم ہے یعنی جو مملکتیں فردی کہلاتی ہیں۔ چنانچہ ہم عام طور پر انگلستان کو لامرکزیت اور فرانس کو مرکزیت کی مثال سمجھتے ہیں مگر جب مقامی حکومت وہ وسعت حاصل کرلے جو اسے ممالک متحدہ امریکہ میں حاصل ہے، تو ہم لفظ لامرکزیت کو اس کے لئے موزوں نہیں سمجھتے۔

پس اس طرح فردی مملکت کی دو قسمیں ہیں ایک لامرکزی اور دوسری مرکزی۔ اسی طرح وفاقیت کی بھی دو قسمیں ہیں۔

وفاقیت کی دونوں قسموں میں بہت شرح و بسط کے ساتھ فرق و امتیاز قایم کیا گیا ہے تم رسالۂ فیڈریلسٹ (Fedaralist) دوتوک ویل اور مسٹر فریمین کے تصانیف میں اس بحث کا مطالعہ کرسکتے ہو مجھے یہاں صرف ان کے نتائج حاصلہ سے بحث کرنا ہے اور ان نتائج سے بھی صرف اس حد تک جس سے ہمیں اپنی ترتیب و تقسیم میں مدد ملتی ہو۔ انگریز ارباب قلم میں یہ دونوں اقسام "مملکت وفاقیہ Fedaral states اور نظم ممالک عہدیہ System of confederal states کے ناموں سے مشہور ہیں جس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ اول الذکر اگرچہ اپنے مشمولہ ارکان کے لئے بہت بڑی خودمختاری روا رکھتی ہے پھر بھی وہ مملکت کے نام کی سزاوار ہے مگر ثانی الذکر اس سے بہت آگے بڑھی ہوی ہے اور اسے صحیح طور پر مملکت مطلقاً نہیں کہہ سکتے۔ یہی نکتہ ان بہتر اصطلاحات سے ظاہر ہوتا ہے جو جرمانیہ میں استعمال ہوتے ہیں وہاں ایک قسم کو صرف (Bundesstat) اور دوسری قسم کو صرف (Staatenbund) کہتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ایک اجتماعی مملکت ہے مگر دوسری مملکت نہیں ہے، بلکہ صرف مملکت کا ایک مجموعہ ہے۔

تم یہ کہہ سکتے ہو کہ موخر الذکر صورت اگر مملکت کے نام کی سزاوار نہیں ہے تو اسے ہماری ترتیب و تقسیم میں کوئی جگہ نہ ملنا چاہئے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ قطعی تنظیم جسے (Staatenbund) وفاقیہ کا نام دیا گیا، اس کی جانب عظیم الشان تاریخی اہمیت کی وجہ سے بایں طور توجہ کی گئی ہے کہ تکوین سلطنت میں یہ ایک بہت ہی عام لغزش کا نتیجہ ہوتا ہے جس سے کسی صحتور ممز شکل کے پیدا ہونے کے بجائے اکثر تباہ کن نتائج پیدا ہوئے ہیں۔ اس کا تعلق مملکتوں کے علم تشریح کے بجا

علم الامراض سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے لیکن اگرچہ اس سے ایک حد تک مرکزی طاقت کی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے جو کسی قدر اس مقدار قوت سے پست تر ہے جو وفاقیت کی دیرپائی کے لئے ضروری ہے، تاہم اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی قدر بہتر انتظام کے ساتھ ایک طرح کی وفاقیت ایسی قایم ہو سکتی ہے جو اس زوردار قوی الضبط کافی الانضباط قسم سے بالکلیہ مغائر ہو جس کی نمایندگی ممالک متحدہ امریکہ کرتے ہیں۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وفاقیت کے کم از کم دو اقسام یا اصناف ہیں۔

میں یہاں اس امر پر توجہ دلانا چاہتا ہوں جس کا انطباق ہماری تمام ترتیب و تقسیم پر ہوتا ہے یعنی یہ ایک حقیقی ترتیب و تقسیم ہے نہ محض لفظی یا رسمی ترتیب و تقسیم نہیں ہے۔ ہم ملکتوں کی تقسیم ان حقیقی اختلافات کی وجہ سے کرتے ہیں جو ان میں نظر آتے ہیں ان تعریفات کی وجہ سے نہیں کرتے جنھیں وہ سرکاری طور پر اپنے لئے پسند کر لیتی ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ خود کو وفاقیت کہتا ہے۔ مقدس رومانی شہنشاہی جو ۱۸۰۶ء میں نابود ہو گئی وہ اپنے کو ایسا نہیں کہتی تھی مگر ہم جس طرح پر اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں اس کے اعتبار سے آخر الذکر کے سلطنت وفاقیت ہونے میں نہ کوئی کمی تھی اور نہ اول الذکر میں کوئی زیادتی ہے۔ ہر ایک سیاسی اتحاد جس میں اتنی کافی مرکزی قوت نہ ہو کہ وہ فردی مملکت کے نام کی سزاوار ہو سکے، وہ ہمارے نظام میں سلطنت وفاقی کہلائیگی۔ مثلاً شہنشاہیوں کو اگرچہ اس نام سے موسوم نہیں کیا جاتا مگر حقیقت میں تقریباً تمام بڑی شہنشاہیاں وفاقیتیں ہیں کیونکہ ان شہنشاہیوں میں مرکزی قوت اتنے دور دراز مقامات میں پورے زور کے ساتھ عمل نہیں کر سکتی۔ علی ہٰذا جاگیری شاہی کو جہاں کہیں بھی پوری طرح سے نشو و نما حاصل ہوا وہاں وہ وفاقیت ہی تھی اور ضعیف تر قسم کی وفاقیت تھی کیونکہ جاگیریت کا اثر یہی تھا کہ وہ مرکزی قوت کو کم و بیش برباد کر دے۔

اس مشاہدے سے ایک دوسری بات ذہن میں آئی ہے جس پر میں اس خطبے کو ختم کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہم نے جو ترتیب و تقسیم قایم کی ہے اسے ہمارے پسندیدہ الفاظ، عموی ادارات، آزادی و عمومیت سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم فوراً ہی ایسا خیال ظاہر نہیں کر سکتے، کیونکہ جب میں قدیم شہری مملکتوں کا ذکر کرتا ہوں تو معاً ہمارے

ذہن میں جمہوری ادارات کا خیال آجاتا ہے اور وفاقیت کے ساتھ ہی اس قسم کے روابط خیال پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ ممالک متحدہ امریکہ نے وفاقیت کی سب سے زیادہ کامیاب مثال پیش کی ہے لیکن قدیم شہری مملکتیں لابداً جمہوری نہیں تھیں بلکہ جمہوری ہونا تو کجا ان سب کی ابتدا شاہی سے ہوئی تھی۔ علیٰ ہذا جمہوری ادارات اور میری تعریف کردہ وفاقیت کے درمیان کوئی لازمی تعلق بھی نہیں ہے۔ وفاقیت کا بہت بڑا نمونہ جس سے صدیوں تک یورپ مانوس رہا، یعنی مقدس رومانی شہنشاہی، اس نے وفاقیت کے اصناف کو ایسی مبالغہ آمیز شکل میں پیش کیا کہ اس کا نتیجہ مایوس کن ابتری کے سوا اور کچھ نہ ہوا اور اس پر بھی جرمانیہ کے بیشتر حصوں کی رعایا شاہی حکومت کے زیر سایہ رہتی تھی اور یہ حکومت پروشیا کے مانند بعض حصوں میں شدید مطلق العنان بن گئی تھی۔ اسی طرح (جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں) عظیم الشان فوجی شہنشاہیاں تقریباً ہمیشہ حقیقت میں وفاقیت رہی ہیں اور پھر بھی انھیں شہنشاہیوں میں یہ ہوتا رہا ہے کہ حکومت عام طور پر مطلق العنان ہوتی ہے۔ یہ وفاقیت ہی کی وجہ سے تھا کہ ایران میں مرزبان اور ترکی میں پاشا، خود مختار حکمرانوں کے مثل ہو گئے تھے مگر اپنی رعایا کے لئے یہ مرزبان اور پاشا کسی مشرقی سلطان سے کم نہ تھے۔

پس نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے دو بڑے اقسام ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے تحت مقامی حکومت کی اہمیت کے تناسب سے چہارگانہ تقسیمیں ہیں:-

(۱) شہری مملکت	حکومت مقامی۔ نابود
(۲) ملکی مملکت	
(الف) مرکزی فردیہ	حکومت مقامی۔ قلیل
(ب) لامرکزی فردیہ	حکومت مقامی۔ معتدبہ
(ج) وفاقیہ	حکومت مقامی۔ حاوی
(د) نظم ممالک عہدیت	حکومت مقامی۔ ذی اختیار کل

خطبۂ پنجم

سیاسیات کا طالب علم خاصکر اگر اس نے انگلستان کے کسی مدرسہ میں تعلیم پائی ہے، جب تک آزادی کا نام نہ سُن لے بیچین رہتا ہے۔ میں یہہ خیال نہیں رکھتا کہ آزادی کی قدر و قیمت کو بڑھاکر بیان کرنا ممکن ہے، اور پھر بھی جب میں انگلستان کے دستور سیاسی پر لکھنے والے ارباب قلم کی تحریریں پڑھتا ہوں تو میں یہہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ اس تصور آزادی کو جو اہمیت دیتے ہیں اسکی وجہ سے حکومت کا علم ان کے ہاتھوں میں عجیب و غریب شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہم نے یہہ قرار دیا ہے کہ ہمارا یہہ علم جس مظہر قدرت کی تحقیقات کرتا ہے، وہ حکومت ہے؛ یعنی یہہ وہ اصول ہے جس کے ذریعہ سے بعض حالتوں میں افراد کی مرضی بہبود عامہ کے مقابلہ میں پامال یا قربان کر دیجاتی ہے۔ اب سوال یہہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کیا ہے؟ یہہ وہ جذبہ ہے جس کے توسط سے، اور وہ اصول ہے جسکی مطابقت میں حکومت کی مقاومت کیجاتی ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دستور پر یہ لکھنے والے آزادی کے اس جذبہ اور اس کے ان اصول کے مطالعہ میں اس درجہ غرق ہو جاتے اور اس کے مطالعہ کو علم السیاست کے مطالعہ کے اس درجہ مرادف و متساوی قرار دیدیتے ہیں کہ پڑھنے والا اس وسوسہ میں پڑجاتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو کیا حکومت ایک ایسی خرابی ہے جسمیں مملکتیں مبتلا ہیں اور آیا علم السیاست کا مقصود یہی ہے، وہ اس خرابی کو روکے اور دبائے رکھے۔ آیا مملکت محض حکومت کے قیام سے مملکت بن جاتی ہے یا تا حد امکان حکومت کے جوے سے بچے رہنے سے مملکت ہوتی ہے۔

اس بحث کا اس عجیب طرح سے توڑ مروڑ کیا جانا عین توقع کے مطابق ہے۔ میں اپنے پہلے خطبہ میں یہہ بتاچکا ہوں کہ جو لوگ کسی علم کی ترتیب دیتے ہیں اور پھر بالارادہ کسی عملی مقصد کے درپے ہو جاتے ہیں، تو اس صورت میں بہت سی

غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان آئین نوازوں نے اس معاملہ پر عملی حیثیت سے نظر ڈالی، علمی حیثیت سے نظر نہیں ڈالی ؛ عملی سا سیاسات میں حکومت انھیں زیادہ تر دشمن کی حیثیت میں ملی۔ حکومت ایک بڑی طاقت ہے اور ہمیں اس امر پر متعجب ہونا چاہئے کہ جب کسی مملکت میں اسے ایکبار حرکت دیدیجاتی ہے تو جس قدر قرین عقل ہوتا ہے یہہ اس سے زیادہ غلبہ کے ساتھ چل نکلتی ہے۔ قدیم زمانہ میں شاید مسئلۂ زیر بحث یہہ تھا کہ اسے زیادہ کارآمد کیونکر بنایا جائے مگر ان ارباب قلم کے زمانے میں یہہ سوال مدتوں پہلے طے ہو چکا تھا اور دوسرا اس سے بھی زیادہ ضروری مسئلہ یہہ پیش آگیا تھا کہ حکومت کو زاید از ضرورت حاوی بننے سے کسطرح روکا جائے۔ اس غایت کیلئے کئی نسلوں سے مقولات و مشاہدات کا اجتماع ہوتا رہا ہے اور یہہ ارباب قلم انھیں کا ذخیرہ جمع کر لیتے ہیں۔

لیکن اگر ہم فوری مقاصد عملیہ کو ایک طرف کر کے یہہ عزم کر لیں کہ کل مبحث کو ایک صحیح اصولی طریق پر منضبط کرینگے تو اس وقت ہم یہہ دیکھینگے کہ آزادی کے تمام مبحث کو جسے ان مصنفین کی تحریروں میں ہو الاول ہو الاوسط ہو الآخر کا درجہ حاصل ہے فی الحقیقت کوئی اہم جگہ ضرور ملنا چاہئے مگر نہ ایسی جو آغاز علم سے بہت ہی قریب ہو اور نہ ایسی جو اس علم میں غایت درجہ کی اہمیت رکھتی ہو۔ پہلا اصول یہ ہے کہ حکومت آزادی سے قبل عالم وجود میں آتی ہے ؛ ہمیں اس کا تجزیہ کرنا اور جن مختلف شکلوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے ان میں ترتیب قائم کرنا چاہئے جب تک ہم یہ سب کچھ نہ کرینگے اور جب تک اس طرح پر ہم حکومت کی نوعیت سے ایک معقول حد تک مانوس نہ ہو جائینگے اس وقت تک ہم حکومت کی زیادتی سے پیدا ہونے والے خطرات اور حکومت پر تحدیدات قائم کرنے کی ضرورت پر غور کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے۔

لیکن، ان مصنفین نے جو رائے پیش کی ہے، اس سے میری دانست میں نہایت ابتری پیدا ہو گئی ہے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ آزادی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیدیگئی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہہ کہ اس لفظ کے استعمال میں ہم ضرورت سے زیادہ بے پروائی کے عادی ہو گئے ہیں۔ جس طرح یہہ لوگ آزادی کی تصویر یہہ کھینچتے ہیں کہ "بس وہی ایک کارآمد شے ہے" اسی طرح

یہہ لوگ ہمیں یہہ بھی سکھاتے ہیں کہ سیاسیات میں جس چیز کی ہمیں ضرورت ہو اسے آزادی کے نام سے پکاریں۔ یہہ عادت عام خطابت کے انداز بیان سے نہایت موافق واقع ہوئی اور کیوں نہ ہو، جس سیاسی تقریر میں بار بار آزادی کا ذکر نہ آئے اس کو کوئی کیا کریگا اور کسی کو کیا پتہ چلیگا کہ کس موقع پر شور تحسین بلند کرنا چاہیئے۔ غرض یہہ عادت مزمن ہو گئی ہے اور یہہ مبحث ایک وسیع لاصورتی، غیر ممیز تصور سے خراب ہو گیا ہے، جس سے اس کے نہایت اہم حصے غارت ہو گئے ہیں۔ اگر ہم یہہ جانتے ہوتے کہ آزادی سے ہماری مراد کیا ہے اگر اس لفظ کی ایک واضح و قابل اطمینان تعریف ہمیشہ ہمیں معلوم رہتی تو ہمیں اس امر کے پتا چلانے میں کچھ دشواری نہ ہوتی کہ علم السیاست میں اسکی مناسب جگہ کونسی ہے، مگر ہم اس اصطلاح کو اس بے پروائی سے استعمال کرنیکے عادی ہو گئے ہیں کہ یہہ کہتے ایک بھوت کیطرح سے ہمارے پیچھے پڑ گئی ہے اور جہاں کہیں بھی ہمیں کسی قسم کے معاملات عامہ کے متعلق کسی طرح کے بحث مباحثہ یا شور انگریزی سے واسطہ پڑتا ہے وہاں ہم لازمی طور پر یہی دیکھتے ہیں کہ جذبۂ آزادی اور اس کے معاذ اصول کے درمیان کشاکش ہو رہی ہے۔

حقیقت میں لفظ "آزادی" کو اتنے وسیع مفہوم میں لیا جا سکتا ہے، جس سے یہہ استعمال حق بجانب ہو جائے، مگر ہمارا تعلق اس لفظ سے صرف ایک علمی اصطلاح کی حیثیت سے ہے اور وسیع معنی میں یہہ لفظ کسی علم میں کلیتہً بیکار ہے۔ اسکی یہہ غیر محدود تعمیم جسنے اسے شاعروں کے نزدیک اسقدر خوشگوار بنا دیا ہے وہی اس موقع پر اسکی قدر و قیمت کو زایل کر دیتی ہے۔ شاعر جب یہہ راگ الاپتا ہے کہ:-

آہ! آزادی کیسا پیارا جذبہ ہے اور یہہ کیسے کیسے حوصلوں ور امیدوں کا منبع و ماخذ ہے۔

تو یہہ بہت ہی ولولہ انگیز معلوم ہوتا ہے مگر تم تحقیق کرو تو تمہیں یہہ معلوم ہو جائیگا کہ اس فقرے میں لفظ آزادی کے معنی صرف غیر محبوس ہونے کے ہیں۔ پس جس لفظ کے یہہ معنی ہوں اور اس کے ساتھ ہی سیکڑوں دوسرے معنے بھی ہوں لسے صرف قافیہ سنجی اور شاعری کیلئے چھوڑ دینا چاہیئے اور اسی کیلئے یہہ موزوں بھی ہے۔

سائنس میں اگر اسے کارآمد بننا ہے تو اسکے لیئے ضروری ہے کہ اسے محدود تر تعریف کے اندر مقید کیا جائے۔

میں اب اُسوقت تک آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک کہ میں اس بات میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچ جاؤں کہ اس لفظ کے کیا معنی قرار دینا چاہئیں، اور در حقیقت تمہارے لیئے یہ مناسب ہوگا کہ ایک لمحہ کے لیئے اس امر پر خیال کرو کہ ہم لوگ عام طور پر اس لفظ کو صحیح اور غلط کن کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کسی اور لفظ کے بہ نسبت اس لفظ کا مطالعہ کرنے سے تم آسانی کے ساتھ اس سے آگاہ ہو جاؤگے کہ ہم شاداں و فرحاں، بہ طیب خاطر کس قسم کی پریشان خیالی میں زندگی بسر کرتے ہیں ہم یہیں کس قسم کے دلایل سنجیدگی سے پیش کیئے جاتے ہیں اور ویسی ہی سنجیدگی کے ساتھ کس قسم کے دلایل سے ان کا جواب دیا جاتا ہے۔

کولرج نے ایک نظم لکھی ہے اور اسمیں یہہ کہا ہے کہ اولاً اسنے فرانسیسی انقلاب پر بہت زور کے ساتھ اظہار پسندیدگی کیا کیونکہ وہ ہمیشہ سے آسمان پر ابر کی آزادانہ نقل و حرکت اور سطح بحر پر موجوں کے آزادانہ تلاطم کا مدح خواں رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہہ شاعری ہے مگر مقصود یہہ ہے کہ اس کے سنجیدہ معنی لیئے جائیں۔ وہ معنی کیا ہوسکتے ہیں یا کولرج اس سے کیا نتیجہ نکالنے کا ارادہ کرسکتا ہے کہ صفت "آزادانہ" ایک جگہ سیاق عبارت میں بدلیوں کی نقل و حرکت سے متعلق استعمال ہو اور پھر دوسری جگہ بالکل ہی مختلف سیاق عبارت میں اسے مملکت کے ادارات کے متعلق استعمال کیا جائے۔ بہر نوع میرے نزدیک یہ طرز استدلال کسی چیز کا جواب نہیں ہو سکتا ہے خواہ اس کا مقصود کچھ ہی کیوں نہو، رسکن نے اس صدائے جنگ کا جرأت کے ساتھ جواب دیا اور یہہ ثابت کرنیکا بیڑا اٹھایا کہ ابر آسمان پر آزاد نہیں ہے کیونکہ وہ کشش، روشنی اور گرمی کے قوانین کے تابع ہے، پس اس سے وہ نتیجہ یہہ نکالتا ہے کہ کوئی ایسی شے جسے آزادی کہیں کسی جگہ بھی موجود نہیں ہے کیونکہ تمام چیزیں قانون کے تابع ہیں۔ اس استدلال سے یہ گمان ہوتا ہے کہ نتیجہ یہہ نکلنے والا تھا کہ فرانسیسی انقلاب کبھی ہوا ہی نہیں ہوگا یا کم ازکم یہہ کہ اس انقلاب نے قانون کے خلاف غداری کی شکل اختیار نہیں کی

مگر مسٹر رسکن سنے یہہ نتیجہ اخذ کرنا زیادہ مرجح سمجھا ہے کہ ابر و باراں تو قانون کی اطاعت کرتے ہیں مگر فرانسیسیوں نے کوئی ایسی تدبیر پیدا کرلی ہے کہ خود کو قوانین قدرت سے آزاد کرلیں، اور اگرچہ کوئی شے جسے مجرد آزادی کہیں موجود نہیں ہے مگر فرانسیسیوں نے کسی نہ کسی طرح کوئی ایسی شے بنالی ہے۔ حقیقت میں یہہ ایک تعجب خیز امر ہے کہ دو ایسے سربرآوردہ اشخاص کامل سنجیدگی بلکہ ایک پیشین گو کی سی باوقار فصاحت کے ساتھ ایک نہایت ہی اہم علی معاملہ کے متعلق ایسے بے مغز و تہی باطن انداز میں بحث کریں۔ ایک اور مثال لیجے۔ شیلی نے اپنی تصنیف موسومہ "فسانۂ الحکمت" میں ۱۸۲۰ء کے قریب زمانہ کے انگلستان کے مزدوروں کی دردانگیز مصیبت کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہہ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں، اور اس کے اس قول سے ہر شخص کے دل میں یہہ خیال گزریگا کہ اب اس سے زاید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہہ یقینی ہے کہ فاقہ کشی سے بدتر اور کیا ہوگا؛ مگر شیلی کو ابھی اسمیں کچھ کسر معلوم ہوتی ہے۔ اس نے ایک سیاسی نظم لکھی تھی اور سیاسی نظم میں آزادی کے لفظ کے لانیکی سیاسی تقریر سے کم ضرورت نہیں ہے اسلیئے وہ دلیری کے ساتھ یہہ دعوے کرتا ہے کہ جو شخص فاقہ کر رہا ہو وہ آزاد نہیں ہے۔

نہیں جو ملک آزاد ہیں
ان میں ایسی فاقہ کشی نہیں ہو سکتی
جیسی اس وقت انگلستان میں نظر آرہی ہے۔

پس اب فی الحقیقت پتا یہہ چلا کہ آزادی کے معنی یہہ ہیں کہ کھانے کو کچھ موجود ہو۔ لیکن اگر ہم شاعری کو ایک طرف رکھکر، صرف نہایت ہی موقر اور واقعہ نگار مصنفوں کے استعمال کو دیکھیں تو ہمیں یہہ معلوم ہو جائیگا کہ "آزادی" کی اصطلاح بالکل ہی مغایر حالات و معاملات کے بیان کیلیئے کام میں لائی گئی ہے ہورےشیس اور لیونیداس جو دشمن کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوگئے تھے وہ آزادی کے مرد میدان کہلاتے ہیں، اور یہی اوصاف بروٹس اور ہیمپڈن کی جانب بھی منسوب کئے جاتے ہیں جنھوں نے خود رایانہ حکومت کی مقاومت کی تھی۔ یہہ یقینی ہے کہ یہہ دونوں

اس باب میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، مملکت کی حکومت کا مقابلہ کرنا کتنا ہی حق بجانب کیوں نہ ہو مگر اسکی شکل اس سے بالکل ہی مختلف ہے کہ حکومت کے احکام کے بموجب غیر ملکی دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ اگر ہم اول الذکر فعل کو استقرار آزادی کہیں تو ثانی الذکر فعل کو حمایت خود مختاری کہنا چاہیئے؛ مگر آزادی اور خود مختاری کو خلط ملط نہ کرنا چاہیئے۔ اور اس طرح اگر ہم سوچیں تو لفظ حب الوطنی صرف ثانی الذکر قسم کے افعال کیلئے موزوں ہے اول الذکر قسم کے افعال کیلئے موزوں نہیں ہے، مزید براں "لامرکزیت" کی تعریف اکثر مقامی آزادی کے الفاظ سے کیجاتی ہے لیکن جیسا کہ ہم گزشتہ ہفتہ میں متعین کر چکے ہیں، "لامرکزیت" دو قسموں کی حکومت کے درمیان ایک طرح کا تعلق ہے؛ جہاں یہہ "لامرکزیت" موجود ہوتی ہے وہاں مقامی حکام اپنے اختیار سے کام کرتے ہیں، مرکز معاملات کے دوسرے حکام کے تابع فرمان یا زیر اثر نہیں ہوتے۔ اب دیکھو کہ بعض دوسری مثالوں میں آزادی کے معنی یہہ تھے کہ حکومت کے تعلق کے اعتبار سے رعایا کو قیود سے خلاص حاصل ہو۔ لیکن یہاں یہہ ایسی خلاصی ہے جو ایک حکومت کو دوسری حکومت سے حاصل ہو۔ ان دونوں تخیلات میں نہایت وسیع فرق ہے۔ حکومتی آزادی بہت آسانی کے ساتھ رعایا کی غلامی کے مرادف ہو سکتی ہے کیونکہ اس آزادی کے معنی ہی امر یا امتناع، اور سزا دہی کے ہیں۔ مگر اس لفظ کے استعمال میں ایسی بے پروایانہ سہل انکاری رائج ہو گئی ہے کہ بہت سی مطلق العنان سلطنتوں میں جہاں صحیح مفہوم میں آزادی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا، صدیوں تک ملک کی قدیم آزادی کی پر شور معرکہ آرائی برپا رہی ہے۔ جرمانی قوم کا "مقدس رومانی شہنشاہی" میں یہی حال تھا۔ معاہدۂ ویسٹ فیلیا میں فرانس نے باقرار صالح جرمانیہ کی آزادیوں کی ذمہ داری کی تھی۔ چشم بد دور، آزادی: فریڈورک اعظم کی رعایا کو کونسی آزادی حاصل تھی؟ ہسی کے حکمرانوں کی رعایا کو کونسی آزادی حاصل تھی؟ جو اپنے یہاں کے نوجوانوں کو اجیر سپاہیوں کے طور پر انگلستان اور فرانس کے ہاتھوں فروخت کر ڈالتے تھے۔ یہاں آزادی سے مراد عین مطلق العنانی کے تھے۔ فرانس نے

جس امر کی ذمہ داری کی تھی وہ یہہ تھا کہ چھوٹے درجہ کے حکمران اپنے اقتدار کے نفاذ میں شہنشاہ سے آزاد ہونگے یعنی انھیں یہہ آزادی حاصل ہوگی کہ رعایا کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔

پس سوال یہہ ہے کہ علم السیاست کی اصطلاح کی حیثیت سے "آزادی" کی تعریف کیونکر کیجائے، آیا یہہ ہوسکتا ہے کہ ہم اس لفظ کے کوئی زیادہ مخصوص اور زیادہ قطعی معنی قرار دیں اور پھر عام بول چال میں اس کے جو معنی ہیں اس سے جدا بھی نکریں۔ اگر ہم اس لفظ کیلئے کوئی ایسے معنی پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائیں جو قطعی اہم اور مختص اللفظ معنی ہوا ور پھر صحیح طور پر سیاسی بھی ہو تو ہم اس علم میں ایک بیش قیمت اصطلاح کا اضافہ کردینگے جو اس کیلئے غالباً نہایت درجہ کارآمد ہوگی۔

میں یہہ کہتا ہوں کہ یہ معنی صحیح طور پر سیاسی ہونے چاہئیں۔ ممکن ہے کہ لفظ آزادی کا بالکل جایز طریق پر استعمال ہوا ور پھر بھی یہہ استعمال ایسے طریق پر ہو کہ اسے علم السیاست سے مطلق کوئی لگاؤ نہ ہو۔ آزادی کے متعلق مسٹرل کے مضمون کا خیال کرو، انھوں نے اس مضمون میں ایک طرح کی آزاردہ قوت کا ذکر کیا ہے جو رائے عامہ میں مستتر ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں انھوں نے دعوےٰ یہہ کیا ہے کہ افراد کو اپنی آزادانہ رائے رکھنے اور اپنے شخصی ذوق و میلان سے لطف اندوز ہونے کا حق اس سے زیادہ ہونا چاہیے جتنا عام طور پر جایز خیال کیا جاتا ہے۔ لفظ آزادی کا اس طریق پر استعمال کرنا بالکل بجا و درست تھا مگر اس قسم کی آزادی سیاسی آزادی نہیں ہے۔ ہم جس مظہر قدرت کا مطالعہ کررہے ہیں وہ مملکت یعنی ایسی جماعت ہے جو حکومت کے ذریعہ سے باہم مربوط ہے۔ حکومت تقید یا جبر کا ایک قسم کا اختیار ہے جس کا نفاذ سزا کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ تقید کا یہہ اختیار بعض حالات میں آزاردہ ہوسکتا ہے اور اسی کے مقابلہ میں "آزادی" قایم کیجاتی ہے۔ پس علم السیاست میں آزادی جس ظلم و ستم کے مقابل ہو وہ حکومت کے اندر مرکوز ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی اور طرح کے ظلم و ستم کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔

جسے حکومت نہیں بلکہ رائے عامہ نافذ کرتی ہے اور اسکے بارے میں ہم یہ استدلال کر سکتے ہیں کہ بالواسطہ اس کا اثر حکومت و مملکت پر بھی پڑتا ہو مگر اس قسم کا ظلم وستم فی نفسہ سیاسی نہیں ہے اور جو آزادی اس کے بالمقابل ہوگی وہ بھی صحیح معنی میں سیاسی نہ ہوگی۔

ہمیں حکومت پر نظر ڈالنا اور یہہ تحقیق کرنا چاہئے کہ حکومت تقید کے اس اختیار کو جو اسمیں مضمر ہے کیونکر ایسے طریق پر استعمال کر سکتی ہے جس سے آزادی میں خلل پڑتا ہو۔

سب سے پہلے ہمیں ایک لمحہ کیلئے لفظ "آزادی" کی تاریخ پر غور کرنا چاہئے۔ لاطینی میں اس Libertas سے ایک طرح کی "حیثیت" کا اظہار ہوتا تھا جو قوم کے بعض افراد میں ہوتی تھی اور بعض میں نہیں ہوتی تھی اسے جب لفظی معنی میں استعمال کیا جاتا تھا تو یہہ ایک سیاسی اصطلاح نہیں بلکہ ایک قانونی اصطلاح ہوتی تھی کیونکہ اس سے رعایا اور حکومت کے تعلق باہمی کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ جو افراد شہری کہلاتے تھے اور جو شہری نہیں کہلاتے تھے ان دونوں کے تعلق کا اظہار ہوتا تھا۔ استعارے کے طور پر شاعری میں یا پرجوش و بلند پرواز خطابت میں اس کا استعمال سیاسی مفہوم میں بھی ہو سکتا تھا، مگر جب ایسا ہوتا تھا تو بالارادہ ہوتا تھا۔ جب کسی ستم رسیدہ شہری کو غلام کہا جاتا تھا تو بالقصد و بالارادہ اسے اس ذلیل، نجس اور نیم وحشی مخلوق کے مشابہ قرار دیا جاتا تھا جو رومانیوں کے محلوں کے بیرونی مکانات میں کتوں کی طرح رہتا یا زنجیروں میں جکڑا ہوا بڑے بڑے امرا کی جائدادوں پر کام کرتا تھا۔

اب جدید یورپ میں، اس قسم کی کوئی غلامانہ "حیثیت" قایم نہیں رہی ہے انگلستان میں ان چند حبشیوں کے علاوہ جو اٹھارھویں صدی میں بعض انگریزوں کے گھروں میں دیکھے جاتے تھے، غلاموں کی صورت صدیوں سے کہیں نظر نہیں آتی۔ لیکن اگرچہ اصل شے ہمیں بالکل نامعلوم ہے مگر جو استعارہ اسکی بنا پر قایم ہوا تھا وہ برابر استعمال ہوتا جارہا ہے اور ہم عادتاً آزادی کے متعلق خود رومانیوں سے زیادہ قیل وقال کرتے رہتے ہیں۔ یہہ ایک

عجیب و غریب واقعہ ہے اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم جس بے پروایانہ ابہام کے ساتھ اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں، بہت بڑی حد تک اسکی وجہ یہی ہے ہماری آزادی ایک ایسا استعارہ ہے جسکی طنابیں کٹ گئی ہیں اس سے ایک طرح کی تشبیہ یا تجنیس کا اظہار ہوتا ہے جس کی جانچ ہم نہیں کر سکتے کیونکہ جن حالات کی طرف یہہ اشارہ کرتا ہے وہ آجکل بالکل ناپید ہیں۔

اب دیکھنا یہہ ہے کہ قدیم روما یا دوسرے ممالک میں جہاں غلامی کی اجازت تھی۔ غلاموں کی "حیثیت" کی خصوصیت کیا تھی۔ کیا یہہ خصوصیت یہہ تھی کہ غلام کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ ہوتا تھا اور خود غلامی کی "حیثیت" ہی اس قسم کے ظلم کا باعث ہوتی تھی مگر اس کے ساتھ ہی بہت سے غلاموں سے تلطف آمیز برتاؤ بھی ہوتا تھا۔ بعضوں پر ترحم و شفقت بھی صرف کیجاتی تھی مگر یہہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی وہ غلام کے غلام ہی تھے۔

پس جب ہم غلامی کا لفظ ان لوگوں کی حالت کے اظہار کیلیئے استعمال کرتے ہیں جو کسی ظالم یا بے انتہا سخت حکومت کے تابع ہوتے ہیں تو درحقیقت ہم اس لفظ کو کسی موزوں صورت سے استعمال نہیں کرتے۔ ایک بالکل ہی مختلف قسم کی حکومت کا خیال ذہن میں لاؤ، یعنی ایک ایسی جو نرم و پدرانہ حکومت ہو مگر اس کے ساتھ ہی ہر کام میں دخل درمعقولات بھی کرتی رہتی ہو، جس سے رعایا اپنی آزادانہ مرضی کے استعمال سے بالکل محروم ہو گئی ہو اور گویا رسیوں میں بندھی ہو۔ ہم اسے بھی غلامی ہی کہینگے تاہم یہہ حالت پہلی حالت سے نہ صرف نہایت درجہ مختلف ہے بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہہ حالت اس سابقہ حالت کے قطعاً مخالف ہو کیونکہ جیسے یہہ ہو سکتا ہے کہ نرم حکومت انتہا سے زیادہ دخل درمعقولات کرنیوالی ہو، اسی طرح دوسری طرف یہہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظالم و سفاک حکومت بہت ہی کم کسی کام میں دخل دیتی ہو یا بالفاظ دیگر یہہ کہ وہ غیر معمولی و مستثنیٰ حد تک آزادی کو روا رکھتی ہو۔ ان دو قسموں کی حکومت کے وسیع فرق کو عیاں کرنے کیلیئے میں دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

اولاً روس میں تیرھویں صدی سے پندرھویں صدی تک کی تاتاریوں کی

حکومت کو لو۔ اس سے زیادہ بے رحمانہ سفاکانہ کوئی حکومت نہیں ہوسکتی؛ مگر اس دور میں دوسری طرف یہہ بھی تھا کہ یہہ حکومت اسقدر شاذونادر اور اس قدر کم مداخلت کرتی تھی کہ اکثر و بیشتر روسی آبادی کو اسکے وجود کا بھی کچھ علم نہیں تھا۔ حکمران غول خود اپنے لشکر گاہ میں رہتا تھا اور وہاں سے وہ گاہ بگاہ غارتگری و تباہی کیلیئے نکلا کرتا تھا اور اگر روسی شہزادے ماسکو کے" دیوکسیا نوگورڈ کے باشندے خان اعظم کے حضور میں اپنا خراج پیش کرنے کیلیئے سالانہ حاضر ہوتے رہتے تو معمولی حالات میں یہہ حکمران غول اسی پر قانع رہتا تھا۔ پس اس طرح اس حکومت میں انتہا درجے کا ظلم و ستم بھی تھا اور انتہا درجے کی آزادی بھی تھی۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت سلطنت ترکی میں بھی نظر آتی ہے۔ ظلم یہاں بھی بہت کچھ تھا مگر اس کے ساتھ ہی بعض معاملات میں عیسائیوں کو غایت درجہ کی آزادی بھی حاصل تھی۔

اب دوسری انتہا میں پیراگواے کی جزوٹ حکومت پر نظر کرو۔ یہاں ہر فعل نرم مشفقانہ و پدرانہ تھا مگر اس کے ساتھ ہی باشندگان ملک کے طبائع پر اسقدر کامل اقتدار قایم کردیا گیا تھا کہ ان کی آزادانہ مرضی بالکلیہ ان سے لے لی گئی تھی اور ان کی زندگیاں ناقابل تغیر ضبط اوقات کی نذر ہوگئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تمام خانگی امور، جن میں ہم ادنیٰ مداخلت بھی روا نہیں کھتے پیراگواے میں مقررہ قواعد کے ساتھ گھنٹی پر ہوتے تھے۔ آیا یہہ آزادی تھی؟ یہہ وہی نظم ہے کہ اس کی اشاعت کا جب اندیشہ ہوتا ہے تو ہم انتہائی زور کے ساتھ شور مچانے لگتے ہیں۔ ہم غلامی کا غل مچادینے اور آزادی کا نام لیکر صدائے احتجاج بلند کرنے لگتے ہیں۔ اگر آزادی محض ظلم و ستم کے نفقدان کا نام ہے تو ہمیں یہہ اعتراف کرنا پڑیگا کہ یہہ آزادی ہی تھی کیونکہ یہہ ایک ایسی حکومت تھی جو مخص طور پر ظلم و جور سے مبرا تھی۔

پس یہہ دو متضاد معانی جو لفظ آزادی کو عطا کیئے جاتے ہیں، ان میں ایک کو ہمیں صاف طور پر مردود قرار دینا چاہیئے۔ میرا خیال یہہ ہے کہ ہمارے لئے بہتر یہہ ہوگا کہ ان دونوں میں سے اس مفہوم کو مردود قرار دیں جو آزادی کو ظالمانہ

حکومت کے بالمقابل رکھتا ہے کیونکہ اگر کوئی دوسری وجہ نہ ہو تو اسکے لیئے یہی وجہ کافی ہے کہ ہمیں اسکے لیئے کسی خاص اصطلاح کی ضرورت نہیں ہے ایسے سادے تصور کیلیئے نرم حکومت کا لفظ ایک سادی اور کافی اصطلاح ہے۔ اسے آزادی کہنا خواہ مخواہ ایک اچھے لفظ کو ضایع کرنا ہے۔

پس کیا ہمیں دوسرے مفہوم کو قبول کرنا چاہیئے؟ کیا ہمیں آزادی کو زاید از ضرورت حکومت کا نقیض قرار دینا چاہیئے؟ ایسا کرنے سے ہم اس لفظ کے اصلی غیر استعاری معنی سے کافی طور پر قریب رہینگے کیونکہ غلاموں کی "حیثیت" میں یہہ خصوصیت تھی کہ وہ "غیر محدود" حکومت کے تحت ہوتے تھے آزاد شہری بھی قانون یا معاہدے کے بعض مقرر کردہ حدود کے اندر کسی آقا یا کسی سرکاری عہدہ دار کی اطاعت کا پابند ہو سکتا تھا مگر غلام کے لیئے آزادانہ مرضی کی کوئی حد محفوظ نہیں تھی بجز اس کے جو اسکا مالک اس کے لیئے روا رکھے۔ اس کے جملہ اوقات اور اس کے تمام قویٰ مالک کے استعمال کے لیئے وقف تھے پس اگر کسی سلطنت میں حکومت کوئی ایسا ہی غیر محدود مطالبہ کرے انسانی زندگی کے نہایت ہی شخصی امور میں اپنے اقتدار کو دخل دے، رعایا کو چین نہ لینے دے اس کی آزادانہ مرضی کے لئے کوئی گنجایش باقی نہ چھوڑے تو اس کی نسبت نہایت مناسب طور پر یہہ کہا جا سکتا ہے کہ اسنے اپنی رعایا کو غلام بنا لیا ہے یا اسے آزادی سے محروم کر دیا ہے۔ ہم نہ صرف موزوں طور پر اس فقرے کو استعمال کرتے رہتے ہیں بلکہ اس مفہوم میں لفظ آزادی کے استعمال سے ہم سب مانوس ہیں۔ بدقسمتی یہہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس لفظ کو اور زیادہ کثرت کے ساتھ ایک دوسرے مفہوم میں بھی استعمال کرتے ہیں اور یہہ مفہوم ان معانی سے بھی مختلف ہوتا ہے جن پر ابھی میں غور کر چکا ہوں۔ آزادی کو عام طور پر پارلیمنٹی حکومت کے مرادف سمجھا جاتا ہے۔ پارلیمنٹ کے حقوق ہی وہ آزادیاں تھیں جن کیلیئے انگریزوں نے سترھویں صدی میں جنگ وجدل کی اور جنھیں ہم اٹھارھویں صدی میں یورپی قوموں کے اندر مایۂ ناز و باعث امتیاز سمجھتے تھے۔ اسلیئے جب ہماری یہہ خواہش ہوتی ہے کہ ہم یہہ معلوم کریں کہ کسی ملک میں آزادی ہے یا نہیں تو ہم عادتاً یہہ سوال کرتے ہیں کہ وہاں کوئی آزاد پارلیمنٹ

ہے یا نہیں اگر وہاں اس قسم کی پارلیمنٹ ہوتی ہے اور اس کے وسیلہ سے حکومت سے جواب طلب کرنے اور رائے عامہ کے موافق حکمرانی نہ کرنیکی ضرورت میں حکومت کو بدل دینے کا اختیار رہوتا ہے تو ہم ایسے ملک کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اسے آزادی حاصل ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو عام خیال کے بموجب اسے آزادی نہیں حاصل ہے۔

پس یہہ اس لفظ کا ایک ایسا استعمال ہے جو مانوس ہے اور اکثر صورتوں میں ممکن ہے کہ موزوں بھی ہو لیکن یہ دیکھو کہ اگر ہم اسے اختیار کریں تو ہمیں اس لفظ کے دوسرے استعمال کو ترک کرنا پڑیگا، حالانکہ وہ بھی قابل اطمینان معلوم ہوتا ہے اگر ہم اس دوسرے مفہوم کو اختیار کریں تو ہمیں اس مفہوم کو ترک کرنا پڑیگا کیونکہ یہہ مناسب نہ ہوگا کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی لفظ کے بالکل مختلف معنی لئے جائیں۔

شاید ہم صاف طور پر یہہ نہیں سمجھتے کہ دونوں معانی بالکلیہ ممیز و مختلف ہیں۔ ہم اس مسئلے کی جانچ بہت ہی سہولت کے ساتھ کر سکتے ہیں کیونکہ ہمیں اپنے دلسے صرف دو باتیں پوچھنا ہے، اول یہہ کہ آیا پارلیمنٹی حکومت ہمیشہ کم سے کم حکمرانی کرنے پر قانع رہتی ہے، دوسرے یہہ کہ آیا مطلق العنان حکومت حتی الوسع ہمیشہ زیادہ سے زیادہ حکمرانی کی حریص ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر لفظ "آزادی" کے دونوں معنی ایک دوسرے میں مدغم ہو جائینگے۔ پارلیمنٹی حکومت اور غیر دخل دہ حکومت دونوں مرادف ہو جائینگی اور اسلئے دونوں کو یکساں طور پر "آزادی" کہہ سکینگے۔ برخلاف ازیں، مطلق العنان حکومت ایک دخل در معقولات کرنیوالی حکومت کے ہم معنی قرار پائیگی اور دونوں کو یکساں طور پر غلامی کہہ سکینگے، لیکن ان دونوں امور میں کوئی خلقی مناسبت یا تعلق مطلق نہیں ہے (جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں)، تاریخ کی مطلق العنان حکومتوں میں سے اکثر حکومتیں ظالم ہوئی ہیں مگر دخل دہ مطلق نہیں تھیں، اس کے برخلاف عمومی حکومتیں بعض اوقات مسلسل مصروف رہتی ہیں اور دخل در معقولات کیلئے بچین نظر آتی رہتی ہیں [1]۔

[1] صرف فرانسیسی انقلاب پر نظر کرو جب اسنے ۱۷۹۲ء میں اپنی دوسری (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

تم یہہ دیکھو گے کہ اسپر متعجب ہونیکی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ ایک طرف تو مطلق العنان کو مداخلت کی کوئی خاص وجہ ترغیب وتحریص نہیں ہوتی، دوسری طرف عمومی حکومت کیلئے مداخلت سے باز رہنے کی کوئی خاص بنا نہیں ہوتی۔ مطلق العنان بادشاہ کیلئے مداخلت محنت طلب ہوتی ہے اور پھر اس سے کوئی نفع بھی نہیں ہوتا؛ بلکہ اسے تو زیادہ تر یہ ہوس ہوتی ہے کہ وہ عیش و آرام میں وقت گزار رہے؛ مگر عمومی پارلیمنٹ کو بالطبع حکومت کے ان ضوابط و قواعد سے قوی دلچسپی ہوگی جن سے قوم کی حالت پر اس قدر زبردست اثر پڑتا ہے۔

لہٰذا میرا خیال یہہ ہے کہ ہم یہہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ جو کچھ مناسبت ہے وہ نقیضانہ نوع کی ہے یعنی بہ حیثیت مجموعی پارلیمنٹی حکومت کو ضرورت سے زیادہ اور مطلق العنان حکومت کو ضرورت سے کم کام کرنیکی رغبت رہتی ہے۔ انگلستان میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اس سے تو بالیقین ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں؛ کم از کم اس میں شبہہ نہیں کہ عمومی حکومت کا جہاں تک تعلق ہے وہاں تک تو ایسا ہی ہے۔ ہم نے اس عہد میں زندگی بسر کی ہے جسمیں حکومت یوماً فیوماً زیادہ عمومی ہوتی جارہی ہے اور ہم یہہ دیکھتے ہیں کہ ہر ایک قانون اصلاح کے بعد وضع قوانین میں نیا زور و شور پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم سے یہہ نہیں کہا جاتا کہ کوئی قانون اصلاح اس غرض سے منظور کیا جاتا ہے کہ ہمیں ازمنۂ سابقہ کی بہ نسبت زیادہ بحال خود چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کی غایت یہہ ہوتی ہے کہ سابق کی نسبت ہم پر زیادہ حکمرانی کیجائے؛ یہہ منظوری اسلیئے نہیں ہوتی کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یعنی جبکو جمہوری ہیئت اختیار کی تو کیا وہ با اعتدال ہو گیا؟ کیا انقلابی یہ اعتراف کرنے لگے کہ وہ حکومت کو ایک لابدی خرابی خیال کرتے ہیں جسے تا امکان تنگ سے تنگ حد کے اندر محدود رکھنا نہایت اہم ہے! یقیناً ایسا نہیں ہوا۔ انھوں نے ہر شے میں مداخلت کی اور انسان پر تمام قبضہ کرلیا۔ انھوں نے مذہب میں دخل دیا اور فرانس کو ایک لشکر گاہ بنا دیا۔ مختصر یہہ کہ حکومت کی بنیاد کو جس قدر عمومی بنایا گیا اسی قدر اس کے حدود کو کم کرنے کے بجائے وسعت دی گئی؟ ماخوذ از خطبہ چہارم سلسلہ ۱۸۹۱ء

عمل سے روک دیا جائے بلکہ اسلئے ہوتی ہے کہ اس آلہ کو دس گونہ زیادہ باعمل و قوی کردیا جائے علہ

درحقیقت میں یہہ سوال نہیں اٹھاتا ہوں کہ یہہ مستعد کاری حد سے بڑھی ہوئی ہے یا نہیں۔ ایسے اوقات بھی ہوتے ہیں جب حکومت کو بہت ہی آمادہ کار بننے کی ضرورت ہوتی ہے مگر یہہ قطعی و یقینی ہے کہ عمومی حکومت پر حد سے زیادہ آمادکاری کی بلا مسلط رہتی ہے کیونکہ وہ اعتماد، معاملات حکومت میں تازہ دلچسپی اور اپنی پشت پر پر زور تائید کے احساس و ادراک کے جذبات سے مملو ہوتی ہے۔ ایسی حکومت پر آمادہ کاری کی بلا اس سے بدرجہا زیادہ مسلط رہتی ہے جتنی ایک خاموش، راضی برضا قوم کے اندر مطلق العنان حکومت کے قابل عہدہ داروں پر ہو سکتی ہے۔

علہ اٹھارہویں صدی میں انگلستان کا ایک فخر یہہ تھا کہ دوسرے ممالک کی بہ نسبت انگریز توضیع قوانین پر کمتر انحصار کرتے اور اس پر کمتر اعتبار رکھتے تھے۔ جس زمانہ میں یورپی سلطنتوں کے اندر انگریزوں نے گویا آزادی کا اجارہ لیلیا تھا، اس زمانہ میں آزادی سے مراد یہی تھی۔ مصنوعی اشکال کی ناپسندیدگی و منفرت ہی آزادی تھی۔ جس زمانہ میں بر اعظم متجاوز من الحد حکومت اور تفصیلات ادارات کی زیادتی کے نیچے دبا ہوا کراہ رہا تھا اس زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ فطرت کے ابتدائی نمونے سے قریب تر رہنے میں انگلستان کو کامیابی ہو گئی ہے انگلستان کی نسبت یہہ کہا جاتا تھا کہ "اس پر تصنعات کا اثر نہیں پڑا اور اسنے گویا قدرت کے ہاتھوں سے بن کر ابھی ابھی میدان دنیا میں قدم رکھا ہے"۔

مگر ان دنوں میں ہم عمومیت پسند نہیں تھے۔ اس وقت تک پہلے قانون اصلاح کی شکل بھی ہم نے نہیں دیکھی تھی، اور حق رائے دہی محدود و مخصوص تھا۔

موجودہ صدی میں یہہ سب کچھ بدل گیا ہے حکومت کثیر التعداد گروہ کے ہاتھ میں آگئی ہے؛ اس کے ساتھ ہی حکومتی مداخلت کی قدیمی نفرت بھی ناپدید ہو گئی ہے۔ قدیمی فریق جو سب کے سب قدیم دستور سیاسی پر فدا تھے وہ بھی نیست و نابود ہو گئے ہیں اور ایک دوسرا فریق جو جدت طرازی اور حدود حکومت کی وسعت پر مفتوں ہے وہ بر سر عروج ہو گیا ہے"۔ (از خطبۂ چہارم ۱۸۹۱ء)

انقلاب سے قبل کے فرانس کی مطلق العنان حکومت کے متعلق توکویل نے اپنی تحقیق میں یہہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مطلق العنانی کے تمام افتخار ونمایش کے باوجود وہ حکومت دل کی کمزور تھی، نہ صرف یہہ کہ اس قسم کی حکومت کام کی عدم دلچسپی کی کی وجہ سے کاہل ہوتی ہے بلکہ اپنی بزدلی کیوجہ سے بھی غیر متحرک ہوتی ہے۔ قوم سے علٰحدہ ہونیکے باعث اسے قابل اطمینان اطلاعات نہیں ملتیں اسلیئے وہ پریشان رہتی ہے اور اسے آگے بڑھنے میں اندیشہ لگا رہتا ہے اور اسے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کہاں قدم رکھ رہی ہے۔ اس کے برعکس اس بنا پر کہ عمومی حکومت کو قدم رکھنے کی جگہہ کا بے نظیر علم ہوتا ہے یہہ حکومت غایت درجہ کی خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔

پس یہ عیاں ہے کہ ہم لفظ آزادی کو جو یہ دو معانی ایک ساتھ عطا کرتے ہیں وہ یکساں نہیں بلکہ بالکل ہی مغایر ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر دونوں معانی ایک نہیں ہیں تو یکساں یا ہمجنس ہی ہوں تاکہ جس مملکت کے اندر ایک مفہوم میں آزادی موجود ہو، اسمیں اِسکا بھی یقین ہوسکے کہ دوسرے مفہوم میں بھی آزادی موجود ہوگی۔ یہ واقعہ نہیں ہے بلکہ دو بالکل ہی غیر متشابہ خصوصیات ایسے ہیں جو ایک ہی مملکت میں ہوسکتے ہیں۔ ان دونوں خصوصیات میں اِس کا مطلق میلان نہیں ہے کہ وہ دونوں ایکساتھ ظاہر ہوں بلکہ وہ ایک دوسرے کو نقصان تک پہونچا سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے اثر کو باطل کرسکتے ہیں اور اس پر بھی ہم ان دونوں کو آزادی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ایک ان میں سے طریق پارلیمنٹی ہے جسکی تعریف غرض موجودہ کے اعتبار سے ہم یہ کرینگے کہ حکومت قوم کی کثرت کے سامنے جوابدہ ہو۔ عام محاورۂ زبان کے لحاظ سے ہم نہایت آسانی سے آزادی کہہ سکتے ہیں مگر مجھے اس میں شک ہے کہ آیا اس طرح کہنے سے ہم اس لفظ کا بہترین استعمال کرتے ہیں۔ یہاں بھی خصوصیت کے ساتھ اِس لفظ کے استعمال کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے بلکہ اس مفہوم کے لیے حکومت کی "جوابدہی" "ذمہ داری" کا لفظ استعمال کرنا کافی ہوگا اور اگر ہم یہہ فیصلہ کرلیں کہ لفظ "آزادی" ہی کا استعمال ہم اس موقع کے لئے کرینگے تو پھر بعض

ملکتوں کے اس دوسرے خاصہ کے لئے جس کی نسبت ہمیں منکشف ہوگیا ہے، کہ وہ اس سے بالکل ہی مختلف ہے، ہمیں کوئی دوسرا لفظ نکالنا چاہیئے! مگر اس خاصہ کے لئے مجھے آزادی کی اصطلاح تمام وکمال موزوں ومناسب معلوم ہوتی ہے۔ اگر ہم آزادی کو حد سے بڑھی ہوئی حکومت کی ضد خیال کریں تو پھر تمام پریشانی وپیچیدگی فوراً ہی غائب ہوجاتی ہے۔

عام بول چال میں آزادی سے مراد خوشحالی، آسایش یا محنت ومشقت سے رہائی کے نہیں ہوتے؛ اس سے مراد یہ ہوتی کہ آپ مجاز ہیں جو چاہیں کریں، اس سلئے یہ لفظ ناقص حکومت کی ضد نہیں ہوسکتا کیونکہ ناقص حکومت سے یہ سب خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ مگر ناقص ہونے کی حیثیت سے یہ حکومت عمدہ حکومت کے بہ نسبت آزادی کے لئے زیادہ تباہ کن نہیں ہوتی۔ عمدہ حکومت اور ناقص حکومت دونوں یکساں طور پر حکومت ہی کی قسمیں ہیں، اور اس حیثیت سے لامحالہ تا حد ضرورت آزادی میں کمی کرتی ہیں۔ آزادی کی کمی کے اعتبار سے ان میں فرق نہیں ہوتا بلکہ فرق اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ ایک سودمند طور پر آزادی میں قصر کرتی ہے اور دوسری ایسا نہیں کرتی ہے۔

مختصر یہ کہ عام محاورے میں آزادی تقید کے مخالف ہے اور چونکہ سیاسی شعبے میں حکومت تقید کا نام ہے، اس سلئے سیاسی مفہوم میں آزادی حکومت کی ضد ہے[1]

قطعی صحیح طور پر آزادی نہ صرف حد سے متجاوز حکومت کی ضد ہے بلکہ خود نفس حکومت کی ضد ہے۔ پس قطعی معنی میں، کسی سلطنت کے اندر کامل آزادی نہیں ہوسکتی کیونکہ کامل آزادی مرادف ہے حکومت کے عدم کلی کے اور جہاں حکومت معدوم ہو وہاں کوئی مملکت ہی قائم نہیں رہ سکتی۔ بایں ہمہ

---

[1] مصنف کے پنسل سے لکھے ہوئے ایک حاشیہ سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ اس موقع پر ان کا ارادہ یہ تھا کہ غایت قانون کی حیثیت سے آزادی کے متعلق کانٹ کے خیال پر کچھ بحث کریں۔

ہم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ بعض ملکتوں میں آزادی کے وجود اور بعض میں اس کے فقدان کا ذکر کیا جائے! ضرورت صرف یہ ہے کہ ہم صاف طور پر یہ سمجھ لیں کہ کس مفہوم میں ایسا کہا جاتا ہے۔

آزادی کو جب حکومت کی ضد قرار دیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر شخص کی زندگی دو حصوں میں منقسم ہے، ایک حصہ حکومت کا ہے اور دوسرا حصہ آزادی کا ہے۔ اول الذکر سے اس کی زندگی کے ان تمام اجزا کا تعلق ہے جو حکم کے ماتحت کر دیئے گئے ہیں اور جن کی رہبری دوسرے کی مرضی سے ہوتی ہے اور ثانی الذکر سے وہ تمام اجزا متعلق ہیں جو خود اس کے تابع ہیں۔ یہ جزو جو انفرادی آزادانہ مرضی کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے اور جس پر حکومت کا حملہ نہیں ہوتا وہ بعض ملکتوں میں زیادہ ہے اور بعض میں کم۔ پہلی قسم میں ہم یہ کہتے ہیں کہ آزادی ہے یعنی قوم آزاد ہے اور دوسری قسم میں ہم یہ کہتے ہیں کہ آزادی کا فقدان ہے یعنی قوم آزاد نہیں ہے۔ یہ بالکل اس رواج کے مطابق ہے جس کے بموجب ہم بعض چیزوں کو "گرم" اور بعض چیزوں کو "سرد" کہتے ہیں۔ یہاں "سرد" سے ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ حرارت سے بالکلیہ "خالی ہے" بلکہ مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کی حرارت کا اوسط دوسری چیزوں کی اوسط حرارت سے کم ہے۔

پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزادی اولاً تقید کی معدومیت یا حکومت کی ضد ہے مگر ثانوی مفہوم میں (کہ وہ بھی باعث سہولت ہے) آزادی غایت درجہ کی تقید کی معدومیت یا حد سے بڑھی ہوئی حکومت کی ضد ہے۔

پس جبکہ ہم کسی ملکت میں عملی آزادی کے متعلق تحقیق کریں تو ہمیں یہ سوال نہ کرنا چاہئے کہ آیا قوانین اچھے ہیں یا برے، آیا ان کا نفاذ نرم سزاؤں کے ذریعہ سے ہوتا ہے یا ظالمانہ سزاؤں کے ذریعہ سے، آیا یہ قوانین کسی ایسی عمومی مجلس میں وضع ہوتے ہیں جہاں جملہ اغراض ومقاصد کی واجبی نمائندگی ہوتی ہے، یا وہ کسی خلوت میں جفاکاروں کی کسی خفیہ وخود غرضانہ سازش کے بموجب وضع کیے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تمام سوالات نہایت اہم ہیں۔ اگر ان کے متعلق مفید جواب دیا جا سکے تو غالباً وہ ملک مرفہ الحال اور

صحت بخش حالت میں ہوگا؛ گر سوال یہ ہے کہ آیا ہم ایسے ملک کو آزاد کہینگے یا نہیں؟ یہ امر تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس لفظ کا استعمال نہ کیا جائے کیونکہ اس کا استعمال اُن حالتوں میں متوقع اور لابدی معلوم ہوتا ہے جہاں قوم کو صحت بخش حالت میں ظاہر کرنا منظور ہو۔ لیکن پھر بھی اگر اس لفظ کو فصاحت و بلاغت اور شاعری کے زمرے سے نکال کر اس سے سائنس میں کام لینا ہے تو ہمیں اس لفظ کو ایک تصور پر محدود کر دینا چاہیئے اور وہ تصور ان جملہ تصورات سے مختلف ہوگا۔ اگر ہم ایسا کرینگے تو ہم قانون کی کیفیت کے متعلق کچھ دریافت نہ کرینگے کہ وہ اچھا ہے یا بُرا، بلکہ قانون کی کمیت کے متعلق دریافت کرینگے کہ انکی تعداد زیادہ ہے یا کم۔ سوال صرف یہ ہوگا کہ آیا افراد کو صاف صاف بحال خود چھوڑ دیا گیا ہے؟ آیا جہانتک ممکن ہے انھیں یہ مجاز ہے کہ وہ جس طرح چاہیں کام کریں؟ آیا مملکتی ضوابط اور آزادانہ مرضی پر قیود کی تعداد کم سے کم حد کو پہنچا دیگئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو قوم آزاد ہے خواہ ان کے انتظامات خراب ہی کیوں نہ ہوں بلکہ ان کی زندگی تک بدحالی و پریشانی میں کیوں نہ گزرتی ہو، اور اگر ایسا نہیں ہے تو قوم آزاد نہیں ہے، خواہ اس پر کیسی ہی عمدہ حکومت کیوں نہ ہوتی ہو اور وہ کیسی ہی صحت بخش اور مرفہ الحال کیوں نہو۔

میں اس مسئلہ کو بالقصد تیغ برہنہ کی طرح پیش کرتا اور اس اعتراض کی توقع رکھتا ہوں کہ "اگر ایسا ہے تو پھر یہ امر نہایت ہی مشکوک ہے کہ آزادی کوئی اچھی چیز ہے یا بُری" بہت خوب! یہ کس نے کہا کہ آزادی اچھی چیز ہے؟ سچ یہ ہے کہ ایک ایسے تصور کو زیر بحث لانے میں ہمیں دشواری پیش آتی ہے جس کا اظہار صرف تقریروں کی لسانی دلفاظی میں ہوتا ہے کسی ایسے بادشاہ کیطرح "جس سے کوئی غلطی سرزد نہ ہوسکتی ہو" آزادی کو مفروضہ قانونی کے شاندار جامہ میں تلاش کیا جاتا ہے اور اگر اس سے نقصان پہنچتا معلوم ہوتا ہے تو تہذیب کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ کہدیا جائے کہ کوئی اور شخص اس کے نام سے یہ کام کر رہا تھا۔ اصول مسلمہ یوں بیان ہوتا ہے کہ "یہ آزادی نہیں، اباحت ہے" آہ۔ یہ آزادی ہی ہے مگر ہر ایک حقیقی شے کی طرح آزادی بھی صرف بعض حالات میں اور ایک خاص حد تک اچھی ہے۔ تاریخ میں ایسے اوقات اور متعدد اوقات آئے ہیں جبکہ آزادی ایک

بے بہا نعمت ثابت ہوئی ہے، جبکہ بلند ترین دل و دماغ خوشی کے ساتھ اس میں منہمک رہے ہیں تاآنکہ آزادی کا لفظ ہی اس مقدس رفعت وعظمت کو پہنچ گیا جیسی رفعت وعظمت "نکوکاری" یا "بہشت" کے الفاظ کو حاصل ہے اور یہ لفظ ایک ایسا منتہائے کمال بن گیا جس کی پرستش ہونے لگی۔

مگر "آزادی" ہر ایک مقام وزمان کا ہمہ گیر منتہائے خیال نہیں ہے۔ ہمیں اس خیال کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ بعض سلطنتوں میں آزادی اپنے وقت سے قبل یا مبالغہ آمیز صورت میں نمودار ہو جائے اور اس سے بھی بڑھکر ہمیں یہ نہیں فرض کرنا چاہئے کہ تمام سیاسی کوششوں کا واحد وکافی مقصد صرف آزادی ہی ہے۔ ہمیں سب سے زیادہ اس کا خیال رہنا چاہئے کہ کافی غور وخوض کے ساتھ اس لفظ کی ایک تعریف کرنے اور اسے ایک خاص تصور کے ساتھ وابستہ کرنیکے بعد ہم محض شاعری کے مطالبات کو پورا کرنے کے لئے، اپنی رائے کو بدل ندیں۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہم کس غرض کے لئے اس بحث میں پڑے تھے۔ ہمارا مقصود ترتیب وتقسیم ہے۔ آج میں نے آزادی کے تصور کا تجزیہ خود اس تجزیہ کی ضرورت سے نہیں کیا ہے بلکہ صرف اس غرض سے کیا ہے کہ ہم ترتیب وتقسیم کے اصول کی حیثیت سے آزادی کا استعمال کرسکیں، مگر اس تجزیہ نے میرا پورا ایک گھنٹہ خرچ کر دیا اور جس نتیجہ پر ہم پہنچے ہیں۔ اسے اپنی ترتیب وتقسیم پر عاید کرنیکا کام ابھی باقی رہ گیا ہے۔ یہ اب دوسرے خطبہ کا موضوع ہوگا۔

خطبۂ ششم

ہفتۂ گزشتہ میں ہم اپنا ترتیب و تقسیم کا کام نہیں کر سکے اور ایک گھنٹہ ایک دوسری تقسیم کے کام یعنی تعریف اصطلاحات کی فکر و کاوش میں صرف کر دیا۔ ہم یہ تحقیق کرتے رہے کہ لفظ آزادی کو علم السیاست میں کام میں لانے کا بہترین و سہل ترین طریقہ کیا ہے مگر ہم نے یہ کام ترتیب و تقسیم کی ضرورت کو مدنظر رکھکر کیا تھا۔ عام مباحث کے اندر جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ملکوں میں اس لحاظ سے امتیاز کیا جاتا ہے کہ آیا ان میں آزادی ہے یا آزادی کا نقدان ہے، اور پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ آزادی اگر ہے تو زیادہ ہے یا کم ہے۔ اس صورت میں ہمیں یہ تحقیق کرنے کی خواہش دامنگیر ہوئی کہ آیا یہ ممکن ہے یا نہیں کہ اس عام ترتیب و تقسیم کو قطعیت کی صورت دیجائے اور اسے علمی اغراض کے لئے کار آمد بنایا جائے۔

ہم جس نتیجے پر پہنچے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ جس مفہوم میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے، اس مفہوم میں اس کا استعمال کرنا باعث سہولت نہیں ہے۔ اس عام رواجی استعمال کے بموجب آزادی صرف دستوریت یا ذمہ دار حکومت کا نام ہے۔ ایسے ممالک جہاں غیر مقبول حکومت فوراً خارج کی جا سکے آزاد سمجھے جاتے ہیں اور جہاں بعض سلمہ وسایل کے توسط سے بدلی کے اظہار کی اجازت ہو اور حکومت اس اظہار خیال کے ساتھ عادتاً وقعت کا برتاؤ کرتی ہے وہاں بھی کسی حد تک آزادی کو مسلم سمجھا جاتا ہے۔ اسے ذمہ دارانہ حکومت کہتے ہیں اور بلاشبہ یہ نہایت درجہ اہم ہے! مگر ہمیں یہ امر نہ تو ضروری معلوم ہوا اور نہ باعث سہولت نظر آیا کہ ہم آزادی کی اصطلاح کو اس کے لئے مخصوص کر دیں۔

لیکن ہمیں ایک دوسرا مفہوم بھی معلوم ہوا جس میں لفظ آزادی نہایت سہولت کے ساتھ بولا جا سکتا ہے اور یہ بھی اس قدر مسلّم اور اہمیت میں بھی بہت بڑھا ہوا ہے (خواہ یہ اہمیت اول الذکر مفہوم کے اہمیت کے برابر نہ ہو)۔ ہمارا علم زیر بحث جس مظہر قدرت سے بحث کرتا ہے وہ کیا ہے؟ وہ حکومت ہے اور حکومت تقیید یا تہدید کی ایک قوت ہے۔ اب دیکھو کہ آزادی اپنے سادہ ترین اور ہمہ گیر معنی مقبولہ میں کسی ایسے شخص کی حالت ہے جو اس قسم کی تقیید و تہدید کے تحت میں نہ ہو۔ جو شخص حکومت کے تحت میں ہوتا ہے اسے جس طرح حکم دیا جاتا ہے اس طرح وہ کام کرتا ہے۔ جو شخص اپنے حسب خواہ کام کرتا ہے اسے "آزادی" حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کوئی شخص ہمہ وقت اور بالکلیہ حکومت کے تحت میں بھی نہیں ہوتا۔ حکومت کسی شخص کو اس کے تمام افعال کی ہدایت نہیں دیتی؛ حکومت کسی شخص کے کل وقت، اس کی کل ملک اور اس کے کل قویٰ پر قبضہ نہیں کر لیتی! پس جس شے کے قبضہ سے وہ باز رہتی ہے، جسے وہ خود اس شخص کی آزادانہ مرضی پر چھوڑ دیتی ہے وہ اس شخص کی "آزادی" ہے، یہ فرد واحد کی آزادی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قوم کی آزادی کیا ہے؟ بظاہر یہ آزادی قوم کی زندگی کا وہ حصہ ہے جس پر حکومت کسی قسم کا اقتدار نہیں قایم کرتی، جسے "برضائے خود" کے اصول پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر حکومت یہ فیصلہ کرے کہ وہ تجارت کے انضباط کی کوشش سے مجتنب رہنا چاہتی ہے تو اس طرح وہ تجارت کو آزادی کے حصہ میں داخل کر دیتی ہے چنانچہ ہم یہ کہتے ہیں کہ تجارت آزاد ہو گئی ہے۔ اس اصول پر وہ کون سی شے ہے جو ایک قوم کو آزاد بنا دیتی ہے اور دوسری کو آزاد نہیں بناتی آزادی اور فقدان آزادی کا معیار کیا ہے؟ کوئی حتمی دقطعی معیار نہیں ہو سکتا اور آزادی ہر حال میں ایک مقابلتی رہیگی۔ مگر ہم یہ کہینگے کہ جہاں اختیاری اصول کے لئے نسبتاً زیادہ حد چھوڑ دی گئی ہے اور حکومت کا حیطۂ عمل (یعنی جس حد کے اندر با اقتدار ضوابط کا نفاذ ہوتا ہو وہ) نسبتاً کم ہے، اس قوم میں آزادی موجود ہے، اور جہاں اس کے برعکس ہے وہاں آزادی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ عام محاورے میں لفظ آزادی کے جو تین خاص سیاسی معنی ہوتے ہیں، انکا مختصراً مقابلہ کرنا باعث سہولت ہوگا۔ اولاً لفظ آزادی قومی خود مختاری کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ صورت خصوصاً قدیم تاریخ اور شاعری میں پائی جاتی ہے چنانچہ میراتھان، تھرماپولی، ارگارتن بینک برن وغیرہ کے متعلق میں جب ہم اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں اس وقت اس سے یہی مراد ہوتی ہے۔

ثانیاً ذمہ دار حکومت کے لئے آزادی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ معنی نہ صرف قدیم تاریخ، اور ظالم کشی کے قصوں میں واقع ہوے ہیں بلکہ خود انگلستان کی دستوری تاریخ میں یہ معنی پائے جاتے ہیں، کیونکہ سترھویں صدی میں انگریزوں کی جد وجہد کا خاص مقصد ذمہ دار حکومت ہی کا قایم کرنا تھا۔ ثالثاً یہ لفظ حکومت کی تحدید کے لئے آتا ہے۔ یہ معنی بھی بالکل عام ہیں، مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اسے اس دوسرے معنی سے ممیز کیا جائے۔ مثلاً خود تاریخ دستور انگلستان پر نظر ڈالو۔ حکومت کی ذمہ داری وہ اصول ہے جس پر بہت دعوے کے ساتھ زور دیا گیا ہے مگر جب کلیسائی عدالتوں کا اختیار محدود کیا گیا، جب مذہبی روا داری جاری کی گئی اور انحراف کرنے والوں کو بطور خود عبادت کی اجازت دیگئی، جب قانون اجازت کی میعاد کو ختم ہونے دیا گیا، اور مطابع کو آزادی حاصل ہوگئی، ان تمام حالتوں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت ذمہ داری کے آگے سر نہیں جھکاتی بلکہ اپنے حدود کو محصور کرتی ہے۔

میں نے اس خیال کے لئے دلائل پیش کیے کہ لفظ آزادی کے جب یہ معنی لیے جاتے ہیں تو اس صورت میں اس کا بہترین انطباق ہوتا ہے، چنانچہ کسی قوم کی حکومت نے جس قدر اپنے حدود کو مقید کر دیا ہو، اسی نسبت سے اس قوم کو آزاد کہنا چاہئیے۔

جب اس طرح سمجھا جائیگا تو آزادی اپنے حالات کے اعتبار سے اچھی یا بری شئے معلوم ہوگی۔ جب آزادی کامل ہوگی تو یہ کلی لاحکیت کے مرادف ہوگی، اور یہ وہ حالت نہیں ہے جسے ہم کسی حیثیت سے بھی خوشگوار سمجھیں۔ انسانی تاریخ میں جلیل القدر اور قابل وقعت جو کچھ ہے اس کا وجود

تابع حکومت توموں ہی میں پایا جاتا ہے یا بالفاظ دیگر یہ کہ آزادی کے ایک حد تک مقید کرنے ہی کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف یہ بھی مسلّمہ ہے کہ جب حکومت ایک مرتبہ قایم ہو جاتی ہے تو وہ بہت آسانی کے ساتھ بیحد قوی ہو جاتی ہے۔ تاریخ جہاں تک لکھی ہوئی ملتی ہے، اس کے ایک بڑے جزو میں لوگ زیادتی حکومت ہی سے تکلیف اٹھاتے رہے ہیں اسلیئے وہ آزادی کو ایک نعمت عظمیٰ سمجھکر اس کے لئے آہیں بھرتے رہتے ہیں، مگر آزادی کی نسبت اس طرح خیال کرنے کے عادی ہو جانے سے، انھوں نے بلا قصد اس لفظ کے معنی میں ترمیم کردی ہے۔ شعرا و خطبا جس شے کی تمنائیں کرتے ہیں وہ حکومت کی بربادی نہیں ہے بلکہ وہ صرف ایک معقول حد تک حکومت کی تقیید چاہتے ہیں مگر وہ اس کی تشریح کرنے کی پروا نہیں کرتے کیونکہ وہ پہلے ہی سے ایک ایسی حکومت کا تصور قایم کرلینے کے عادی ہوگئے ہیں جو کافی منضبط ہو۔ لفظ "آزادی" کو شاعری و خطابت سے نکالکر حکمیات میں منتقل کرنے کے لیئے ہمیں اس کے معنی میں ویسی ہی اصلاح کرنا پڑیگی جیسی لفظ "حرارت" میں کی گئی ہے۔ ہماری زبان میں آزادی کے معنی شاعرانہ مفہوم میں "معقول حد کی آزادی" کے ہونگے۔ یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے مستعلہ عام لفظ حرارت کے معنے علمی زبان میں "معقول حد کی" "حرارت" کے ہوتے ہیں۔

اب میں ان مختلف مدارج کی بحث کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، جن مدارج کے اعتبار سے آزادی مملکت میں نمایاں ہوتی ہے۔ تم دیکھو گے کہ اسے دوسرے لفظوں میں یوں ظاہر کرسکتے ہیں کہ حدود حکومت کو کتنے مختلف مدارج وسعت علا ہو سکتے ہیں۔ یہاں یہ پورے طور سے ظاہر ہو جائیگا کہ علم السیاست پر بحث کرنے کا یہ طریقہ، محض عقید تمندانہ طریقے سے کس درجہ مختلف ہے۔

سیاسیات کے معلموں میں حدود حکومت کا مسئلہ ہمیشہ ایک دلچسپ مبحث بنا رہا ہے مگر انھوں نے عام طور پر اسے استفسار کی صورت میں پیش کیا ہے کہ حکومت کے جایز حدود کیا ہیں؟ اور حکومتی مداخلت کے مخصوص واقعات کی بحث میں عام طور پر یہ دلیل پیش کیجاتی ہے کہ وہ فطری و ناقابل انفکاک آزادی کی قطع و برید کا دوسرا نام ہے یا بالفاظ دیگر یہ کہ حکومت کو تہدید کا جو حق

حاصل ہے وہ ایک محدود حق ہے اور اس کے حدود سب جگہ ایک ہی ہیں۔

میرا یہ خیال نہیں ہے کہ ہم انجام کار میں حکومت کی قابلیت کے متعلق اس قسم کے کسی اخلاقی تہدید کے تصور پر نہ پہنچ جائینگے، مگر میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اس موجودہ حد پر ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں ہے۔ ہم اب اس موضوع پر ایک طالب علم طبعی کے مانند نگاہ ڈال رہے ہیں[1] انسانی گروہ اپنے گرد وپیش کے مشکلات کے خلاف جد وجہد کرنے کے لئے ہمسایہ قبایل کے دباؤ کی مدافعت کے لئے یا نامناسب حالات طبعی اور مضر آب وہوا سے بچنے کے لئے حکومت کی تدبیر نکالنے پر مجبور ہو جاتا ہے؛ اس تدبیر سے وہ حملے کی مقاومت کرنے یا خود اپنے قایم کردہ جارحانہ تجویزوں کے عمل میں لانیکی طاقت کو بیحد بڑھا لیتا ہے۔ بگر گروہ کے اندر جب یہ اصول ایک مرتبہ مسلم ہو جاتا ہے تو یہ بڑی وسعت وسرعت کے ساتھ اس میں تعدیل پیدا کر دیتا ہے، ہم اسی تعدیل کے مطالعہ کرنیکے خواہاں ہیں۔ یہ عیاں ہے کہ حکومت کی جس مقدار کو قبول کیا جائیگا، حکومت کی جتنی خوراک استعمال کیجائیگی اسی کے اوپر اس معاملہ کا بہت کچھ انحصار ہوگا اور حکومت کی مقدار کا تحقق کرنا آزادی کی مقدار کا تحقق کرنا ہے، اس لئے آزادی ہمارے

---

[1] ۱۸۹۱ء میں مصنف کی "عقیدتی نقطۂ نظر" سے علیحدگی زیادہ پر زور الفاظ میں ظاہر ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "یہ نظریہ اعتقادانہ طور پر یہ قرار دینا چاہتا ہے کہ حکومت کو کن کاموں کے انضباط کا حق ہے اور کن کاموں کے انضباط کا حق نہیں ہے یا بالفاظ دیگر یہ کہ حکومت کی فطرت وتعریف کے اعتبار سے حکومت کے حدود کیا ہونے چاہئیں۔ لیکن میں نے آغاز ہی میں جو عام اصول قرار دیدئے ہیں ان کے لحاظ سے میں اس قسم کے استفسارات نہیں کر سکتا۔ میں حکومت کے متعلق اس حیثیت سے بحث نہیں کرتا کہ وہ کوئی بالارادہ پیدا کردہ شے ہے بلکہ وہ اس کوشش کی ایک نیم شعوری پیداوار ہے جو انسان ان خرابیوں سے بچنے کے لئے کرتا ہے جن میں وہ گھرا ہوتا ہے۔ پس اگر تم یہ سوال کرو کہ ہمیں کتنی حکومت درکار ہے؟ تو اس کا میں جو جواب دونگا وہ یہ ہوگا کہ اس مقصد کے لئے جتنی حکومت ضروری ہے وہ نہ صرف ہونا چاہئے بلکہ اتنی حکومت ہمیں لامحالہ برداشت کرنا پڑیگی"۔

لئے نہایت اہم ہو جاتی ہے۔ مگر اس تحقیقات میں ہمیں اس سے مطلق بحث نہیں ہے کہ جب حکومت کا اجرا ہوتا ہے تو کس استحقاق سے آزادی محدود کیجاتی ہے یا یہ کہ آزادی پر قیود عاید کرنا اخلاقاً کس حد تک روا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حکومت سے جو تبدیلیاں پیدا ہونگی وہ ہر حال میں ایک ہی ہونگی، خواہ حکومت حق پر ہو یا نہ ہو اور اس لیے ہماری ترتیب و تقسیم ہر دو صورت میں ایک ہی ہوگی اور گو حکومت کے خلاف افراد کے یا افراد کے خلاف حکومت کے حقوق طبعی کا سوال (یعنی فی الواقع سیاسیات و اخلاقیات کے درمیان جملہ تعلقات کا مسئلہ) ہنوز زیر بحث ہے، لیکن ہم یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ اس ترتیب و تقسیم کے اصول کو فوراً آمیش کر دیں۔

لیکن اگرچہ ہم ہنوز یہ نہیں کہسکتے کہ حکومت کس حق سے انفرادی مرضی کو پامال کرتی ہے پھر بھی اس سبب کی طرف اشارہ کرسکتے ہیں جو حکومت کے وجود میں آنے کا باعث ہوتا ہے اور اس سے یہ دلیل قایم کرسکتے ہیں کہ جس شدت کے ساتھ یہ سبب عمل کرتا ہے، اغلباً اتنی ہی شدت حکومت میں بھی ہوگی۔ یہاں میں ان تمام ملکتوں کو الگ کئے دیتا ہوں جنھیں میں نے غیر عضوی قرار دیا ہے۔ ان ملکتوں میں لامحالہ حکومت کا انحصار جور و زیادتی اور حرص پر ہوتا ہے۔ ہم جن ملکتوں پر غور کر رہے ہیں وہ عضوی ملکتیں ہیں اور ان میں سیاسی اصول کی ترقی و بیداری معاشرے کے اپنے ماحول کے ساتھ جد و جہد کرنے سے ہوتی ہے۔ نظم معاشرت پر ایسے دباؤ پڑتے ہیں جسکے باعث مشترک عمل لابد ہو جاتا ہے اور عمل مشترک سے حکومت وجود میں آتی ہے۔ پس یہ خیال کرنا موجہ و معقول ہے کہ حکومت کی مقدار اس دباؤ کی مقدار سے براہِ راست متناسب ہوگی یعنی آزادی کی مقدار اس دباؤ کے بالعکس متناسب ہوگی۔ بالفاظ دیگر یہ کہ کوئی جماعت جو فراغت کے ساتھ رہتی ہو، اس کے حالات زندگی سہل، اور وسعت ارضی وافر ہو، تو ہمیں یہ توقع کرنا چاہیئے کہ وہ جماعت آزادی سے بہت زیادہ لطف اندوز ہوگی۔ جس جماعت کو سخت مشکلات کا سامنا ہو اور وہ شدید

خطرات میں گھری ہوئی ہو تو ہمیں یہ توقع کرنا چاہیئے کہ اس میں آزادی کم اور حکومت زیادہ ہوگی۔

اس عام اصول کی تائید میں جو تاریخی مثالیں نقل کیجا سکتی ہیں وہ سب ظاہر ہیں اور ان پر بحث کرنے میں ہمیں اختصار سے کام لینا مناسب ہے یورپی مملکتوں میں کس نے آزادی کے معاملہ میں سربراہی اختیار کی اور کس میں حکومت اپنے معتدل حدود پر قائم رہی؟ ظاہر ہے کہ سلطنت انگلستان میں ایسا ہوا ہے مگر یورپ سے باہر ہم سب اس پر متفق ہونگے کہ ممالک متحدہ امریکہ ہی ایسی مملکت ہے جسے آزادی کے معاملہ میں ابتدا ہی سے ہمارے برابر ہمالک رہا ہے۔ کیا اسکی کوئی توجیہ پیش کیجا سکتی ہے؟ ایک نہایت ہی ترغیب دہ توجیہ فوراً پیش کی جا سکتی ہے، وہ یہ کہ ان دونوں سلطنتوں میں آبادی بہت کچھ یکساں ہے اور اسلیئے ہم یہ کہتے ہیں کہ تومند انگلوسکسین قوم ہی وہ قوم ہے جس نے بحراوقیانوس کے دونوں جانب خودسری اور مطلق العنانی کے خلاف سر اٹھایا اور وہ بغیر آزادی کے زندگی نہیں بسر کر سکتی۔ لیکن ان دونوں آبادیوں میں ایک اور بھی وصف مشترک ہے جس کا دعوے کرنا بھی اتنا ہی خوشگوار معلوم ہوگا دونوں کے لئے یکساں طور پر عمدہ طبعی سرحدیں موجود ہیں؛ انگریز ایک جزیرے میں رہتے ہیں اور ایک خطۂ بسیط نے ہمیں دشمن سے محفوظ کر دیا ہے۔ یہ تنگ رودبار ہمارے لئے جو کام کرتا ہے وہی کام امریکہ والوں کے لئے وسیع بحراوقیانوس انجام دیتا ہے۔ تاریخ کے طالب علم کو خود اپنے دل سے یہ سوال کرنا چاہیئے کہ سترھویں صدی میں جبکہ انگلستان استقلال کے ساتھ برابر آزادی کیطرف قدم بڑھاتا جا رہا تھا اس زمانہ میں ایسے ہی استقلال کے ساتھ فرانس مطلق العنانی کی جانب کیوں گامزن تھا؟ یہ یقینی ہے کہ لوئی چہاردہم کے وقت میں فرانس میں جو امر سب سے زیادہ حاوی نظر آتا ہے وہ سرحد کا معاملہ تھا۔ بقول رانکے لوئی خود اپنے زمانہ میں فاتح اعظم سمجھے جانے سے زیادہ فرانس کا مستحکم کرنیوالا سمجھا جاتا تھا گویا لوئی وہ شخص تھا جسے خدا نے اس غرض سے بھیجدیا تھا کہ وہ فرانس کے لیئے مستحکم ایک قابل اطمینان سرحد معین کرے۔ لیکن غیر ملکی دشمن کے خلاف وہ ملک کو جس قدر مضبوط کرتا جاتا تھا، اسی قدر وہ خود اپنے اقتدار کو مجمع آزادی کو

پامال اور مطلق العنانی کو مستحکم کرتا جارہا تھا۔

دوسرے درجے میں پروشیا اور شاہی ہوہنزولرن کی مثال پیش کرونگا۔ اس مملکت نے اٹھارھویں صدی کے ابتدائی برسوں میں فریڈرک اعظم کے مخبوط الحواس باپ فریڈرک ولیم کے دور حکومت میں اپنی موجودہ شکل اختیار کی اور مطلق العنانی کی ایک خاص طرز قایم کی جسکی درشتی اور جسکی عریان عسکریت یورپ میں کبھی اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ لوگوں نے اسے ہدف تمسخر بنالیا تھا، مگر اب ڈیڑھ سو برس کے بعد اٹھارھویں صدی کا وہ کونسا سیاسی تجربہ ہے جو اس سے زیادہ نمایاں طور پر کامیاب ثابت ہوا ہو۔ اس کی تشریح کیونکر ہوسکتی ہے؟ جب پروشیا کی آبادی نسلاً ٹیوٹن مذہباً پروٹسٹنٹ تھی، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ایسے قطعی طور پر آزادی کیطرف سے کیوں پیٹھ پھیر لی تھی؟ سب سے پہلے تو سرحد پر نظر کرو؛ فریڈرک ولیم کی مملکت تمام یورپ میں سب سے کم قابل مدافعت تھی۔ یہ تین قطعات پر مشتمل تھی جو ایک دوسرے سے بالکل علحدہ تھے اور ان میں باہمی آمد و رفت کی بھی کوئی سبیل نہیں تھی، اور ہم یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ فریڈرک ولیم اول کے ابتدائے عہد حکومت میں شمال میں جو جنگ عظیم برپا ہوئی، اسی کی وجہ سے یہ انتہائی فوجی نقص خاص طور پر فریڈرک کے دل پر نقش ہوگیا تھا۔ اس کی جدتیں ایک بڑی حد تک ان فوجی سبقوں سے نفع حاصل کرنے کی کوشش پر مبنی تھیں جو اس نے اس جنگ کے دوران میں چارلس دوازدہم اور پیٹر اعظم سے سیکھی تھیں۔

اس تعمیم سے دو اصولوں کی توضیح ہوتی ہے جنھیں تاریخ سے تعمیمی کام لیتے وقت کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ ایک تو مملکتوں پر خالصۃً اندرونی طور پر کبھی نظر نہ کیجائے؛ یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ ان کی ایک دوسری حیثیت بھی ہے جو اس سے بالکل مختلف ہے یعنی ممالک غیر کے ساتھ ان کے تعلقات۔ یہ وہ قاعدہ ہے جس کی نسبت خاص طور پر یہ ضرورت ہے کہ تمہارے دلوں پر نقش کردیا جائے کیونکہ کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے انگریزوں سے

زیادہ اس قاعدے کی نسبت لاپروائی برتی ہو۔ انگریزوں میں ایک خلقی عادت یہ ہو گئی ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو خود کفیل سمجھنے لگے ہیں اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ انگلستان میں جو کچھ واقع ہوا ہے اس کی توجیہہ و تشریح خود انگلستان ہی کے اسباب و علل سے ہو سکتی ہے۔ یہ حالت اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ میرے خیال میں ابھی انگلستان کی تاریخ کا اس طرح لکھنا باقی ہے جس سے ان غیر ملکی یا براعظمی اثرات کا صحیح تعین کیا جا سکے، جنھوں نے انگلستان کے معاملات پر اثر ڈالا ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ عظیم الشان تاریخی مظاہر قدرت کی تشریح میں ہمیں محض قومی خصایص کا دعوے کرنے میں ذرا سست رفتاری سے کام لینا چاہئے۔ کوئی تشریح نہ اسقدر بدیہی ہے نہ اسقدر آسانی سے نظر کے سامنے آ سکتی ہے، اور نہ اسقدر مبہم، اسقدر سہل الحصول، اور اسقدر مشکل الثبوت ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ انگریزوں نے کیوں اتنی جلد آزادی حاصل کر لی، تو ہر شخص اس کا جواب یہ دے سکتا ہے کہ اسلئے کہ وہ انگریز ہیں اور آزادی کی الفت انگریزوں کی فطرت میں داخل ہے۔ میں اسے ایک نہایت ہی ارزاں تشریح سمجھتا ہوں۔ یہ تشریح بہت آسانی سے پیش کر دی جاتی ہے مگر اس کا ثبوت دینا تقریباً ناممکن ہے! یہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ مشکوک ہے کہ اس سے قومی تفاخر کو تسکین ہوتی ہے۔ ان وجوہ سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تشریح کو بالعموم ناقابل قبول قرار دینا چاہئے۔ بہرحال اصلی منشا کیطرف آیئے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زیادتی حکومت، دباؤ کی زیادتی کے بالمقابل ردعمل ہے اور دوسری طرف آزادی یا سست حکومت، دباؤ کا نتیجہ ہے۔ یہ عام قاعدہ ہے مگر حسب عادت اس میں بھی بہت سے مستثنیات ہونگے۔

اب سوال یہ ہے کہ آزادی کی تعریف و تشریح جب اس طرح کی گئی تو اس صورت میں ہم اسے ترتیب و تقسیم کے اصول کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ صاف عیاں ہے کہ ملکتیں جس حد تک آزادی کو روا رکھتی ہیں اس میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ اشتباہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ

آیا اس طرح جو اختلافات پیدا ہونگے وہ ایسے ہونگے جن سے بخوبی ممیز گروہوں کی ایک معقول تعداد ایسی پیدا ہوجائے کہ ہر ایک گروہ کو ہم ایک اختصاصی نام دے سکیں، یا یہ ہوگا کہ یہ فرق اس درجہ خفیف، ایسے تدریجی اور اس قدر کثیر التعداد ہونگے کہ ان میں امتیاز کا قایم کرنا یا ان کو تقسیم و ترتیب کے تحت میں لانا دشوار ہوجائیگا؛ کیونکہ فی الجملہ یہ کوئی کافی وجہ نہیں ہوسکتی کہ دو مملکتوں کو اس وجہ سے مختلف درجات میں رکھا جائے کہ ان میں ایک کی حکومت دوسرے کی حکومت کے بہ نسبت دخلدہی کے طرف زیادہ مایل ہے۔

لیکن زیادہ تر قابل اطمنان طریقہ یہ ہوگا کہ ہم یہ ملحوظ رکھ سکیں کہ بعض اہم ترین اور مشہور عام صیغے ایک مملکت میں تو حکومتی ضوابط کے تحت میں ہیں؛ لیکن دوسری سلطنت میں انھیں خودمختارانہ عمل کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے ہماری تعریف کے بموجب یہ بعینہ وہی امتیاز ہے جس پر آزادی کا انحصار ہے بجہاں حکومت اس طرح پر متعدد صیغوں میں دست اندازی نہیں کرتی وہاں آزادی کا شیوع ہوتا ہے اور جہاں اس کے برعکس ہوتا ہے وہاں نتیجہ بھی مغائر نکلتا ہے۔

تھیں یاد ہوگا کہ میں حکومت کی کوئی ایسی قطعی حد نہیں قرار دیتا ہوں جیسے کسی مجرد اصول کے مطابق قائم کیا جاسکے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس موجودہ زمانہ میں بعض اصناف معاملات میں حکومت کی مداخلت قطعاً غلط اور تمدن کے منافی سمجھی جاتی ہے؛ چنانچہ سابق زمانہ میں اگرچہ حکومتوں کی تقریباً ہر جگہ یہ عادت تھی کہ وہ مذہبی عقیدے یا کم از کم طریق عبادت میں دخل دیا کرتی تھیں اور خود انگریزوں کو اتنی خفیف رواداری کے حاصل کرنے کے لئے جتنی دلیم ومیری کے قانون رواداری میں عطا کیگئی تھی نصف صدی کی جدوجہد صرف کردینا پڑی، مگر اب اس سے زیادہ ہمہ گیر طریق پر کوئی امر مسلم نہیں ہے کہ جملہ حکومتیں اپنے ممالک میں غیر محدود رواداری جاری کریں۔ خیال یہ پیدا ہوگیا ہے کہ قدیمی تقیدی وضع کے قوانین کی کسی طرح سے حمایت نہیں کی جاسکتی۔ سیاسیات میں اس قسم کی عقیدہ پرستی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سے زیادہ ناقابل انکار کوئی امر نہیں ہوسکتا کہ اس قسم کے

معاملات پر حکومتی تقیدات موجودہ زمانہ کے مروجہ خیالات سے بالکلیہ متبائن ہوتے ہیں، مگر مجھے یہ بھی کسی حالت میں مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ ایک ایسے طریق کو جو دوسرے زمانوں میں تقریباً ہمہ گیر طور پر تسلیم تھا اس اصول کو اس طرح مسترد کر دیا جائے، گویا کہ وہ ان زمانوں میں بھی ایسا ہی ناقابل حمایت تھا جیسا ہمیں اب نظر آتا ہے۔ مثلاً حفاظت خود اختیاری کے حق کی کوئی حد نہیں ہے۔ نظم ہائے معاشرت کو قتل عام اور تباہی سے بچانے کے لئے جتنے اختیارات کی ضرورت ہے حکومت انہیں عمل میں لائیگی اور کوئی اسے ایسا کرنے سے روک نہیں سکتا مگر اس معاملہ میں تم یہ پوچھ سکتے ہو کہ مذہب سے اس معاملہ کا کسی قسم کا کیسے تعلق ہو سکتا ہے اور غیر محدود مذہبی رواداری کو جائز رکھنے سے ایسے بدیہی وصریحی قسم کے کیا خطرات پیدا ہو سکتے ہیں؟ یہ صحیح ہے کہ بعض عہدوں میں اس قسم کے خطرات کا کوئی اندیشہ نہیں تھا مگر سوال یہ ہے کہ (مثلاً) جنگہائے صلیبی کے زمانہ میں یا اس سے بھی قبل آریوسی تنازعات کے دوران میں بھی یہی حالت تھی یا نہیں؟ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا وجود جن عظیم الشان مستقل خطرات کے دفع کرنے کے لئے ہوتا ہے وہ دو شکلیں اختیار کرتے ہیں اول یہ کہ کوئی دشمن قرب وجوار میں موجود ہو یعنی کوئی دوسرا قبیلہ سرحد کے پار تاک میں لگا ہو۔ لیکن انکے علاوہ ایک دشمن اور بھی ہے جو اس سے کم نمایاں اور اس سے کم مادی ہیئت کا ہوتا ہے۔ میں یہ پہلے ظاہر کر چکا ہوں کہ مملکت کے آغاز اور اس کی نوعیت اصلیہ سے مذہب کو بہت کچھ سروکار ہوتا ہے مملکتیں ایسے اشخاص سے مرکب ہوتی ہیں جو بعض اعتبار میں یکجنس ہوتے ہیں اور یہ یکجہتی صرف خون وقرابت ہی میں نہیں ہوتی بلکہ کائنات سے متعلقہ خیالات وآراء میں بھی ہوتی ہے۔ تاریخ انسانی کے بہت سے وسیع عہدوں میں لوگوں نے اس سے انکار کر دیا ہے کہ وہ ایک ہی مملکت کے اندر ایسے لوگوں کے ساتھ رہیں جو ان کے ہم مذہب نہوں، اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن عہدوں کا ذکر اوپر ہوا ہے، ان میں یہ میلان ناقابل دفاع

تھا۔ پس ایسے زمانے میں رواداری کا ہونا ناممکن تھا۔ اس رواداری کا یہ نتیجہ ہوتا کہ نظم معاشرت میں ہیجان و اضطراب کے ساتھ انتشار پیدا ہو جائے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی رواداری اگر قبل از وقت رائج ہو گئی ہوتی تو اس سے وہی ہیبتناک مصائب پیدا ہو جاتے جن کے متعلق ہم عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت کا وجود میں آنا انھیں کے روکنے کے لئے ہوا ہے۔ مذہب کی مثال درحقیقت ایک انتہائی مثال ہے۔ تمام دوسرے محکمے جن پر حکومت نے غیر معمولی حالات میں قبضہ کر لیا ہے، ان سب میں مذہب کی بہ نسبت صلاحیت قبول زیادہ ہے۔ لہٰذا میں جس شے کو حقیقت سیاسیہ کی "نسبت باہمی" کہنا چاہتا ہوں اسے ثابت کرنے کا اس سے زیادہ قاطع طریقہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا کہ مذہبی نارواداری جو ہمارے اس زمانہ میں تقریباً ناقابل معافی گناہ معلوم ہوتی ہے اس کی نسبت بھی یہ کہا جائے کہ وہ بھی اپنے وقت و موقع پر ہرگز قابل لعنت نہیں تھی۔ اسے وہ امتیازی اصول کہہ سکتے ہیں جس پر تاریخ کی اعتقادی و علمی نظر کے انتخاب کا انحصار ہے۔ جو لوگ کسی طرح کے مستثنیات کو جائز رکھے بغیر رواداری کو ایک قانون مطلق سمجھتے ہیں، انھیں تاریخ دنیا کے ایک بڑے حصہ سے اس طرح روگرداں ہو جانا چاہیئے گویا وہ حصہ ایک مہیب خواب تھا۔ یہ لوگ "جنگہائے صلیبی" "اصلاح جوالی" یا اسپینی بادشاہی کی داستان کے ساتھ کیا سلوک کرینگے؟ تاہم میں اس شخص سے ملنا چاہتا ہوں جو صاف طور پر مجھ سے یہ کہنے کی جرأت کرے کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتوں میں رواداری جس زمانے سے جاری ہوئی ہے اس سے ایک یا دو صدی قبل اس کا اجرا مامون و محفوظ تھا مثلاً یہ کہ کیا یہ مناسب ہوتا کہ انگلستان میں الیزبتھ کے عہد میں، اس کا اجرا ہو جاتا یا فلپ دوم اسے اسپین میں یا خاندان والوا اسے فرانس میں جاری کر دیتا۔

لیکن سردست ہمارا کام "ترتیب" "تقسیم" ہے اور فوری سوال یہ ہے کہ آیا یہ ممکن و مناسب ہوگا کہ ملکتیں اپنی حکومتوں کے لئے جو حدود روا رکھتی ہوں ان حدود کی وسعت کے اعتبار سے سلطنتوں کی تقسیم ایک سلسلے میں

کیجا سکے۔ ہم سرسری طور پر ان حدود کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ جس قسم کے معاملات کو حکومت اپنے ضوابط کے تحت لانے کی دعویدار ہو، ان کا شمار کر لیں۔ ہم نے جو رائے اختیار کی ہے اس کے بموجب معاملات کی جو صنف اصلاً و ضرورتاً حکومت سے تعلق رکھتی ہے وہ دشمن کے خلاف ملک کی حفاظت اور اس کے ساتھ ہی دیگر ممالک پر جارحانہ جنگ کی کیفیت ہے۔ اسمیں جب جنگ پیش آجائے تو مملکت کے لئے سب کاموں سے زیادہ لازمی اس کی نگرانی ہو جاتی ہے اس کے بعد دوسرا درجہ قانون کا ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جرائم اور زیادتیوں کے فرو کرنیکا کام حکومت اپنے ابتدائی مرحلہ ہی میں اختیار کر لیتی ہے۔ اس محدود المفہوم قانون کے بعد وسیع المفہوم قانون کا درجہ ہے۔ اپنے وقت مناسب پر حکومت کے ضروری فرائض کے ساتھ ذاتیاتی انصاف یعنی رفع تنازعات و نفاذ معاہدات کے فرائض کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے مگر اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کسی مملکت میں حکومت جسقدر ترقی کرتی جاتی ہے اسی قدر ایک دوسرے قسم کا ارتقا بھی ہوتا جاتا ہے۔ جب ہم معاشرے کے ابتدائی حالت کا انکی زیادہ ترقی یافتہ حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا اختلاف صرف حکومت ہی میں نہیں ہوتا بلکہ اس سے زیادہ عام طور پر یہ اختلاف اس شئے میں ہوتا ہے جسے ہم "تخصیص" کہتے ہیں۔ مِلک، حرفت، مشاغل اور کاروبار میں معاشرہ زیادہ متنوع ہو جاتا ہے۔ اولاً جملہ مِلک مِلک آراضی ہوتی ہے اور تقریباً ہر ایک شہری ایک ہی طرح کے مشاغل میں مصروف رہتا ہے۔ اس وقت تک خاص پیشے پیدا نہیں ہوتے۔ فنون کا وجود نہیں ہوتا، اور کاروبار منقسم نہیں ہوتا (مثلاً ہر شخص یکساں طور پر سپاہی پیشہ ہوتا ہے)، پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب یہ کیفیت بدل جاتی ہے۔ حرفت میں پیچیدگی بڑھ جاتی ہے۔ صنعت اور غیر ملکی تجارت میں ترقی ہوتی ہے، سرمایہ جمع ہو جاتا ہے، مِلک غیر منقولہ کے ساتھ مِلک منقولہ بھی پیدا ہو جاتی ہے، روپیہ کا استعمال شروع ہو جاتا ہے، روپیہ کے بعد اعتبار کا درجہ آتا ہے، علوم و فنون پیدا ہوتے ہیں، تعلیم اور علم ادب کو اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، مدرسے اور دار العلوم قائم ہو جاتے ہیں! یہ

ارتقائی نغمہ قطعی معنی میں سیاسی نہیں ہے! پھر بھی اس سے برابر نئے نئے سیاسی مسایل رونما ہوتے رہتے ہیں کیونکہ ہر عمل پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ نئی شے جو مملکت میں ظاہر ہوئی ہے، اس کا تعلق دونوں حدود میں سے کس کے ساتھ ہوگا، یعنی یہ آزادی کے لائحہ عمل میں داخل ہوگی یا حکومت کے لائحہ عمل میں؟ کیا ملک میں تجارت موجود ہے؟ اگر موجود ہے تو کیا حکومت کو اسے منضبط کرنا چاہیئے؟ کیا علم ادب موجود ہے؟ اگر ہے تو کیا ہر مصنف کو اپنے حسب مرضی اپنی کتاب کی اشاعت کرنا چاہیئے یا اسے حکومت سے اجازت حاصل کرنا چاہیئے؟

تم یہ دیکھتے ہو کہ ان سوالوں کے جو جواب دیئے جائیں، ان کے بموجب ہم مملکتوں کا ایک سلسلہ ترتیب دے سکتے ہیں اور مختلف مملکتوں میں حکومت کے حدود کو جو مختلف قسم کی وسعت دی گئی ہے، ان کے موافق ہم اصطلاحات کا ایک نظم اختراع کر سکتے ہیں۔ جرمانی مصنفین اس قسم کے اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں کہ جس مملکت میں حکومت کم سے کم حد پر ہوتی ہے، اسے وہ اکثر "جنگلی مملکت"، کہتے ہیں۔ وہ "قانونی مملکت"، "تجارتی مملکت"، اور "احتسابی مملکت" کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ دوسری طرف جس مملکت میں حکومت کے حدود بہت وسیع ہوتے ہیں اس کی نسبت وہ "تمدنی مملکت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ اگر ہم اس قسم کی ترتیب و تقسیم اختیار کریں تو یہ زیادہ تر دو بڑے اصناف پر مشتمل ہوگی کیونکہ اصل سوال یہ ہوگا کہ ہم مادیاتی نقطۂ نظر کو اختیار کرینگے یا نہیں یعنی ہم یہ خیال کرینگے کہ مملکت کا تعلق صرف نظم و امن، بہبود، انسداد جرایم وغیرہ کے ایسے دنیاوی اغراض سے ہے یا ہم مملکت کے لیئے اس سے اعلیٰ و ارفع وصف کو بھی جایز رکھینگے؟ آیا ہم مملکت کے لیئے یہ روا رکھینگے کہ وہ انسانیت کے جلیل القدر خیالات، مذہب، اخلاق اور علم و ہنر سے واسطہ و تعلق رکھے۔ ایک لفظ میں یہ کہ ہم "تمدنی مملکت" کو قبول کرینگے یا نہیں۔

جیسا کہ میں واضح کر چکا ہوں، اس سلسلۂ خطبات میں میں نے یہ کام

اپنے ذمہ نہیں لیا ہے کہ اس قسم کے سوالات کا عقیدہ پرستانہ جواب دوں۔ میں اپنے کو مملکتوں کی ترتیب و تقسیم تک محدود رکھوں گا مگر مجھے رائے و خیال کی ان پر زور رفتاروں پر نظر کرتا ہے جو خاص اس مبحث پر گزشتہ دو صدیوں کے اندر جاری رہی ہیں۔ سترھویں صدی تک اگر کوئی ہمہ گیر رائے تھی تو وہ یہی تھی کہ سیاسی اتحاد کا خاص مقصد تزکیۂ مذہب ہے۔ ایک اعتبار سے مملکت اور مذہب مرادف یکدگر تھے۔ یہ خیال بہت ہی آہستہ آہستہ کرکے زائل ہوا ہے۔ جس زمانہ میں یہ خیال زائل ہونا شروع ہوا ہے، اس زمانہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مملکت کے حیطۂ اقتدار کی تحدید کے متعلق زمانۂ مابعد کی معرکہ آرائی کے جراثیم پیدا ہوئے اور اس معرکہ آرائی سے بھی کم و بیش اتنا ہی اضطراب برپا ہوا۔ انگلستان میں رواداری قطعی صورت ولیم دہیری کے دور میں قبول کی گئی، مگر اسی دور میں انگلستان جنگ عظیم کے ایک سلسلہ میں مبتلا ہو گیا اور جب ہم ان جنگوں کی اصل کی جانچ کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑائیاں تجارت اور خاصکر اس ادعا کی وجہ سے پیدا ہوئیں جو اس زمانہ میں تمام حکومتوں میں عام تھا کہ تجارت کو ضوابط حکومت کے تحت میں لانا چاہئے۔

اس طرح ہم اٹھارھویں صدی پر پہنچ جاتے ہیں اور اس صدی کے نصف آخر کے شروع ہونے سے قبل لوگوں کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہوا کہ حکومتیں ضرورت سے زیادہ بلند پروازی سے کام لے رہی اور اپنی حد سے آگے قدم بڑھا رہی ہیں یہ خیال کہ حکومت بہت آگے بڑھ گئی ہے اور بنی نوع انسان پر ضرورت سے زیادہ حکمرانی ہونے لگی ہے۔ اس عجیب و غریب بے چینی میں جو فرانسیسی انقلاب کی مخصوص اخلاقی سبب تھا مضمر تھا۔ مذہب، تعلیم، تجارت، سیاسیات غرض متعدد شعبوں میں یہی شور بلند ہو گیا، سادگی کی زیادتی، تنظیم کی کمی، اور فطرت پر اعتماد کی توسیع کا مطالبہ ہونے لگا۔ اس نئے مسلک کا ممتاز اصول "عدم مداخلت" تھا۔

اس میں وہ اصول مضمر ہے جس کا ذکر میں ایک یا دو مرتبہ کر چکا ہوں، یعنی حکومت گویا ایک ضروری مصیبت ہے اور اس کے دائرے کو کم از کم حد کے اندر مقید رکھنا چاہئے، بالفاظ دیگر یہ کہ ہم نے آزادی کے لفظ کا جو مفہوم قرار دیا ہے اس مفہوم میں یہ اصول عدم مداخلت آزادی کا گویا امتیاز ہے، فی الحقیقت علم السیاست

کے لئے یہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے کہ آیا اس اصول کو کامیاب ہونا چاہئے تھا یا نہیں۔ لیکن (جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں) کسی اعتقادی نتیجہ کے تعین میں جملہ سیاسی حقیقت کی باہمی تناسب کو ہر نہج سے ملحوظ رکھنا چاہئے۔ یہاں آبادی زیادہ ہے، وہاں کم ہے۔ یہ مملکت ترقی یافتہ حالت میں ہے اور وہ ابھی ارتقائی ابتدائی مرحلہ میں ہے، پس کیا یہ توقع قرین عقل ہے کہ کوئی ایسا عقیدہ معین کیا جا سکے جس کا اطلاق اس وسعت کی نسبت سے جو حکومت کے لئے موزوں و مناسب قرار دیا جائے ہمہ گیر طور پر ہو سکے؟ ”عدم مداخلت“ کا اصول مسلمہ جو ایک مرتبہ اٹھارھویں صدی میں قایم ہو گیا۔ اس کا شیوع بہت ہوا، لیکن انیسویں صدی میں اس کے خلاف ردعمل بھی اتنے ہی زور سے ہوا۔ سوال یہ ہے کہ اسنے فی الجملہ فتح پائی یا شکست کھائی؟ اس سوال کا مختصر جواب دینا غالباً دشوار ہوگا۔ بعض اہم مسایل مثلاً مذہب کے مسئلہ میں اسے بالیقین پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس زمانہ کے اکثر اشخاص کے لئے یہ سمجھنا دشوار ہے کہ کس طرح اتنی صدیوں تک اتنی قوموں کا یہ عقیدہ تھا کہ حکومت کو طرز عبادت سے بھی کوئی واسطہ وتعلق ہے۔ اگر عام طور پر میرے لئے یہ خیال کرنا بھی دشوار ہے کہ اب بھی یہ اعلام شعاری (”عدم مداخلت“) بجائے خود مقبول ہو درحقیقت ہم یہ جانتے ہیں کہ دوسرے اہم سوال یعنی تجارت کے مسئلہ میں اسے (یعنی اصول عدم مداخلت کو) انگلستان میں بہت بڑی فتح حاصل ہوئی اور جب پینتالیس برس قبل انگلستان نے آزاد تجارت کا اصول اختیار کیا تو انگلستان میں اس اصول کے حامی صدق دل سے یہ یقین رکھتے تھے کہ زیادہ زمانہ نہیں گزریگا کہ ان کی یہ اصلاح تمام دنیا میں رائج ہو جائیگی۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا اور بہت سی بڑی بڑی سلطنتوں میں اب بھی کم وبیش قدیم زمانہ کی طرح یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تجارت کا انضباط حکومت کے نہایت ہی اہم فرائض میں سے ایک فرض ہے۔

اب فی الجملہ نہایت ہی زور کے ساتھ دوسری طرف یعنی حکومتی مداخلت یا یوں کہو کہ مداخلت انتظامی کیجانب میلان پیدا ہو گیا ہے چنانچہ زمانۂ حالیہ میں مملکت نے تعلیم کو اپنے حدود میں داخل کر لیا ہے۔ ابتدائی تعلیم پوری طرح

حکومت کے تحت میں مستحکم کر لی گئی ہے اور اس باب میں مملکت نے اپنی پوری قوت سے افراد کو مجبور کرنیکا کام لیا ہے۔ ثانوی تعلیم اور جامعات پارلیمنٹ کی دخلاندہی کی وجہ سے نئے سرے سے ڈھالے گئے ہیں۔ یہی امر حفظان صحت کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے اور ہر روز کسی نہ کسی نئی جانب سے نئے مطالبات پیش ہوتے رہتے ہیں کہ کوئی گرہ حکومت کے ناخن تدبیر سے کھل جائے۔

لیکن اس تغیر کا بہترین ثبوت اس عظیم الشان مستعدی میں پایا جاتا ہے جو اب سیاسیات میں رائج ہے اور جس پر تمام فریق متفق ہیں کہ بہت کچھ کام کرنا ہے اور ہمارے حد امکان سے زیادہ کام ہمارے سامنے پڑے ہوئے ہیں۔ اس سے فی الواقع یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ حکومت کے حدود تمام اطراف میں بڑھتے جا رہے ہیں بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صرف ایک سمت میں سے بہت زیادہ وسعت ہوتی جا رہی ہے، اور وہ قانون سازی ہے۔

تاریخی طور پر دیکھا جائے تو قانون سازی میں حکومت کی موجودہ مستعدی نہایت ہی نمایاں اور غیر معمولی ہے۔ دوسرے شعبوں میں حکومت کے افعال پر ویسی ہی رقیبانہ نظر رہتی ہے جیسی پہلے تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کبھی کوئی زمانہ ایسا نہیں تھا کہ خانگی معاملات میں خودرایانہ مداخلت یا انتظامی سختی کی وجہ سے حکومت اس وقت سے زیادہ معرض ملامت میں رہی ہو۔ ان معاملات میں ہم آزادی کے قدیم روایات پر ثابت قدم ہیں مگر وضع قوانین کے معاملہ میں ہم ایک امتیاز قائم کرتے ہیں۔ ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ اہم قوانین کی تیاری و منظوری میں حکومت کو برابر مشغول رہنا چاہئے۔

تاریخی نظر سے یہ دوسرے عہدوں کے اصول مسلمہ سے بالکل متباین ہے۔ کم و بیش یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے زمانوں میں وضع قوانین سے مملکت کا کوئی تعلق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانہ میں بھی قوموں کے لئے قوانین ہوتے تھے اور اگرچہ کمتر ایسا ہوتا تھا، پھر بھی وہ ان قوانین میں ترمیم کرتے رہتے تھے۔ لیکن اس ترمیم کا کام مملکت کے ہاتھ میں بہت کم آتا تھا۔

اس کی توضیح کے لئے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ ہنری مین

کی بیان کی ہوئی ایک مثال یہاں نقل کروں۔ وہ کہتے ہیں کہ رنجیت سنگھ صرف حکمراں ہی نہیں تھا بلکہ اگر کبھی کوئی مطلق العنان حکمراں ہوا ہے تو وہ مطلق العنان حکمراں تھا۔ باایں ہمہ اغلب یہی ہے کہ اس نے اپنی تمام زندگی میں کبھی کوئی قانون نہیں بنایا۔ گو وہ بذات خاص مملکت کا مجسمہ تھا۔ اس پر بھی اسے وضع قوانین سے کچھ سروکار نہیں تھا۔

قدیم تر زمانے میں مملکت یعنے وہ طاقت جو احکام نافذ کرتی اور سزائیں عاید کرتی ہے اس کی نسبت شاذ و نادر ہی یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ قانون بنانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ وہ کسی مہم کا انصرام، کسی محصول کا اجرا، کسی شکایت کا تدارک سب کچھ کر سکتی تھی مگر قانون کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ کسی اور ہی دائرۂ اقتدار میں ہے۔ قانون ایک مقدس رواج کا نام تھا۔ مملکت اس کا انتظام تو کر سکتی تھی، اسے نافذ بھی کر سکتی تھی، اس کی ضبط و ترتیب بھی عمل میں لاسکتی تھی مگر قانون کی توضیح و تنسیخ و ترمیم، یہ ایک بہت اعلیٰ دارفع اختیار سمجھا جاتا تھا جس کا استعمال شاذ و نادر ہی ہو سکتا تھا اور جس کی نسبت یہ امر بھی مشتبہ تھا کہ یہ اختیار کس کے ہاتھ میں ہے۔ "قوانین بالائے افلاک اعلیٰ علیین پر رواں ہوتے ہیں" زاید از ضرورت دلیرانہ تغیرات پر پردہ ڈالنے کے لئے اکثر مذہب کی مدد لیجاتی تھی یا عام طور پر کسی حد تک حیلۂ شرعی سے کام نکالا جاتا تھا۔

اس مبحث میں ہم ازمنۂ سابقہ کے روایات سے کلیتہً دور جا پڑے ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ اہل جرمانیہ قانونی مملکت کا ذکر کرتے ہیں اور اس سے وہ صرف اس مملکت سے مراد لیتے ہیں جو تحفظ حقوق کی ذمہ داری لیتی ہے۔ انیسویں صدی کی مملکت کے بیان کے لئے ہمیں دوسرے نام کی ضرورت ہے یہ "مملکت مقننہ" ہے۔ اسنے بہت سے ان اختیارات کا عمل میں لانا ترک کر دیا ہے جن سے اس سے قبل کی مملکتیں کام لیتی تھیں مگر جس اختیار کے دعوے سے زمانۂ سابق کی سلطنتیں خائف رہتی تھیں اس اختیار کو وہ نہایت آزادی اور ان تھک کوششوں کے ساتھ استعمال کرتی ہے۔ وہ قانون بناتی، بگاڑتی اور اس میں ترمیم کرتی ہے۔ قانون کو وہ یہ سمجھتی ہے کہ صرف کثرت کی رائے ہے، جس کی بنا بحث واستدلال پر ہو۔ یہ "مملکت مقننہ" ہے۔

تم دیکھتے ہو کہ اگرچہ میں ایسے نام تجویز کر سکتا ہوں جن سے مملکتی عمل کے حدود کے اعتبار سے مملکتیں ممیز ہو جائیں گر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں مدارج آزادی کے اعتبار سے مملکتوں کا ایک ترقی پذیر سلسلہ قایم کر دوں۔ آزادی اپنے مواقع بدلتی رہتی ہے۔ کبھی وہ انسانی عمل کے ایک شعبے میں نمودار ہوتی ہے کبھی دوسرے شعبے میں۔ ایک مملکت بعض امور میں آزادی کی جانبدار ہوتی ہے اور وہی مملکت دوسرے امور میں اس کی مخالف بھی ہوتی ہے۔

لیکن بہر نوع، ہم عام طور پر دو قسم کی سلطنتوں کو صریحاً دیکھ سکتے ہیں جن میں سے ایک میں آزادی کی اور دوسری میں حکومت کی خصوصیت کے ساتھ جانبداری کیجاتی ہے اور تاریخ میں ہم ان دونوں قسموں کی مثالیں بہت ہی مختلف مدارج میں پا سکتے ہیں مگر جو مثالیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں اور نہایت ہی طبعی طور پر ہمارے دلوں میں آتی ہیں وہ ہمارے اس نظم میں اس عنوان کے تحت میں ترتیب نہیں دیجا سکتیں۔ تاریخ جن ستمگار اور پامال کن سلطنتوں کی مثالیں پیش کرتی ہے ان میں سے دس میں سے نو ہماری اصطلاحات میں محض غیر عضوی ہیں یعنی وہ ایسی حکومتیں ہیں جنکی بنا ابتدا ہی سے قوت کے سوا، اور کسی شے پر نہیں تھی۔ تاہم جب ان تمام مثالوں کو مسترد کر دیا جائے تو بھی ایک قلیل تعداد مملکتوں کی مثال ایسی باقی رہجائیگی جن کی نسبت یہ ممکن ہے کہ شدت حکومت کے اعتبار سے انھیں ایک ترقی پذیر سلسلہ میں مرتب کیا جائے، یا یوں کہو کہ انھیں اپنے حیطۂ اقتدار کی وسعت کے اعتبار سے مرتب کیا جائے۔

خطبۂ ہفتم

تم آزادی کے موضوع پر دو خطبات سُن چکے۔ اب بتاؤ کہ ہم جن نتائج پر پہنچے وہ کیا ہیں؟ ہماری پہلی تفتیش اس بارے میں تھی کہ ملکتیں جس قدر آزادی کو روا رکھتی ہیں آیا اس کے مدارج کے اعتبار سے ان کی ترتیب و تقسیم کیجائے یا نہیں؟ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ حکومت کے حدود اور (ہماری تعریف کے بموجب) آزادی کے حدود مختلف ملکتوں میں بہت ہی مختلف ہیں، یہ کہ بعض ملکتوں میں آزادی بہت کم اور حکومت بہت زیادہ ہے اور بعض میں آزادی بہت زیادہ اور حکومت بہت کم ہے؛ مگر ہم کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ یہ اختلافات محض مقداری کے اعتبار سے نہیں ہیں اور یہ کہ ان حدود میں صرف وسعت ہی کے اعتبار سے کمی بیشی نہیں ہوتی بلکہ اکثر جب وہ ایک طرف گھٹتے ہیں تو دوسری طرف بڑھ جاتے ہیں۔ اس لئے ہم ایک طرح کی ترتیب و تقسیم پر پہنچے تو ضرور مگر یہ کلیتہً ایسی ترتیب و تقسیم نہیں تھی جس کی ہمیں توقع تھی، یا اس سے بہتر یوں کہو کہ ہم دو قسم کی ترتیب و تقسیم پر پہنچے، جن میں سے صرف ایک کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ محض آزادی کے اصول پر مبنی ہے۔ ان دونوں کے فرق کو از سر نو پھر مختصراً بیان کرنا خالی از منفعت نہو گا۔

اولاً یہ کہ بعض ملکتوں میں شدت کی کیفیت ہے اور بعض میں ملائمت کی یعنے بعض میں حکومت پُر زور و مستعد کار ہے اور بعض میں نرم۔ عام قاعدے کے طور پر واضح ہوتا ہے کہ حکومت کی قوت عمل یعنے اس کی ضرورت ان مشکلات کے

متوازن ہوتی ہے جن سے جماعت کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

میں نے یہ ظاہر کرنے کے لئے متعدد مثالیں دی ہیں کہ جہاں ملکی سرحد کمزور ہوتی ہے، وہاں حکومت اس کے تدارک کے طور پر خود کو مستحکم کر لیتی ہے۔ تمام دنیا جانتی اور سمجھتی ہے کہ ایک پُرامن تجارتی مستقر کے بہ نسبت ایک لشکرگاہ میں بہت شدت کے ساتھ حکومت ہونا چاہئے اور یہ محض اس وجہ سے کہ دشمن کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ جس ملک کی سرحد کمزور ہو وہ اس اعتبار سے ایک لشکرگاہ کی نوعیت رکھتی ہے اور اس لئے وہ اپنے لئے ایک سخت حکومت پیدا کر لیتی ہے۔ میں یہ بھی ظاہر کرونگا کہ کسی خارجی دشمن سے مدافعت کے علاوہ دوسرے ضروریات بھی ایسے خیال میں آسکتے ہیں، جن سے یہی نتیجہ پیدا ہو جائے۔ قوم کے اندر مزاج کے جذبات اور خاندانوں، فرقوں اور فریقوں کے درمیان اندرونی مخاصمت بھی قوم کو اس امر پر برانگیختہ کر سکتی ہے کہ وہ ایک آہنی حکومت قایم کر کے اس خرابی کا انسداد کرے۔

پس شدت و نرمی کے لحاظ سے جو سرسری طور پر داخلی و خارجی مہلک اثرات سے مملکت کی مدافعت کے حسب حال ہوں، حکومتوں کی ترتیب چند مدارج میں ہو سکتی ہے۔ سب سے زیادہ نمایاں تقسیم ان حکومتوں کے درمیان ہوگی جو کسی طرح سے انسان کے دل و دماغ پر اقتدار کا دعوے کرتی ہیں یا نہیں کرتیں۔ جہاں حکومت، اپنا اختیار تہدیدی کسی مذہب یا کسی تعلیم کے متعین کرنے، یا بعض اعتقادات وخیالات کو یا تعلیم و عبادت کے مقاصد کی بعض انجمنوں کو خطرناک سمجھکر ممنوع قرار دیتی ہو، ایسی حکومت اپنے کو نمایاں طور پر ان مملکتوں سے جدا کر لیتی ہے جو رواداری کا دعوے رکھتی ہوں۔ ہمیں صرف اس امر سے بچے رہنا چاہئے کہ رواداری کو ایسا اصول مطلق نہ قرار دیدیں جس سے ادنی انحراف بھی گویا گناہ ہو۔ اگر کسی مملکت میں رواداری جایز رکھی جاسکے تو بہت بہتر ہے؛ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ مملکت مضبوط ہے، مگر بیشتر مملکتیں اتنی قوت نہیں رکھتی تھیں کہ اس بار کی متحمل ہوں اور اس لئے وہ اپنی حفاظت خود اختیاری کے اعتبار سے اس پر قیود عاید کرنے کے لئے مجبور ہوئیں۔ براعظم یورپ کی نہایت ہی آزاد مملکتیں یہ محسوس کرتی ہیں

"حلقۂ مسیحی" کے ساتھ رواداری برتنا ان کے لئے دشوار ہے۔

بہر حال یہ جو کچھ بھی ہو، روادار مملکتیں بھی ہیں اور وہ بھی ہیں جن میں رواداری نہیں برتی جاتی۔ نیز، جو مملکتیں اپنے تمام شہریوں پر فوجی خدمت عاید کرتی ہیں اور جو نہیں عاید کرتیں ان دونوں کے درمیان بھی ہم تمیز قایم کر سکتے ہیں۔ یہاں بھی شدت حکومت کا فرق صریحاً مدافعت مملکت کی دشواری کے فرق کی بنا پر ہے مثلاً ایسی سلطنتیں جیسے جرمنی جنکی سرحدیں دشمن کے حملے کے لئے کھلی ہوئی ہوں وہ فوجی خدمت عامہ کا اصول اختیار کر لیتی ہیں؛ اس کے برخلاف انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ جو حملے کی زد سے بچے ہوے ہیں وہ ایسا نہیں کرتے۔

شاید غور کرنے سے تم اور بھی اس قسم کے اصناف میں تمیز قایم کر سکو اور میرا خیال ہے کہ جس بڑے اصول پر ہم اس وقت غور کر رہے ہیں، (یعنی جب مملکتوں کو خطرات کا اندیشہ ہوتا ہے تو وہ باگ کو سخت کر دیتی ہیں اور جہاں کہیں خطرہ کم ہوتا ہے وہاں آزادی کو سرسبزی حاصل ہو جاتی ہے) اگر تم تاریخ میں اس قانون کی تمثیلیں تلاش کرو تو تمہارے لئے بہت سودمند ہوگا۔

لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، درجہ آزادی کے اعتبار سے مملکتوں کی اس ترتیب و تقسیم میں دوسری ترتیب و تقسیم کی وجہ سے جو آزادی کی نوعیت کے اعتبار سے ہو پیچیدگی پڑ جاتی ہے، کیونکہ مختلف قومیں اپنی توجہ مختلف اغراض کی طرف منعطف کر دیتی ہیں اور یہ ایک طبعی امر ہے کہ ہر قوم میں حکومت اس قوم کے نظری میلان کی تقلید و تصدیق کرے۔ لہذا حکومت کبھی کسی طرف جھکے گی اور کبھی کسی طرف اور چونکہ آزادی اسی مقام پر ہوتی ہے جہاں حکومت کا فقدان ہو۔ اس لئے انھیں (میلانات کے موافق) جزوی آزادی کے اتنے ہی اقسام بھی ہو جائیں گے۔

پس اب ہمیں یہ مشاہدہ کرنا ہے کہ اس قسم کی ترتیب و تقسیم پیدا کرنے میں ہم جتنا چاہیں بڑھ جائیں مگر اس تحقیقات کو اختیار کرتے وقت ہمنے اولاً جس نشانہ پر نظر جمائی تھی وہ نشانہ خطا ہو گیا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ بعض خاص خاص مملکتوں کے اندر ان کے ارتقا کی خاص ہیئتوں میں "آزادی" کے

تحفظ میں جو خصوصیت عام بول چال میں مضمر ہوتی ہے اسے علمی شکل و قطعیت عطا کریں لگر مثلاً جب ہم انگریزوں کی آزادی کا ذکر کرتے ہیں یا سترھویں صدی کی دستوری کشمکش میں اس کے استحکام کا یا انقلاب فرانس کے بعد سے براعظمی ملکوں کے اسے اختیار کرنے کا قدم بقدم پتہ چلاتے ہیں تو ہم عام طور پر لفظ آزادی کو اس سے مختلف مفہوم میں استعمال کرتے ہیں جسے قبول کرنا میں نے مناسب سمجھا ہے۔ یہ درست ہے کہ سترھویں صدی سے ہم حدود حکومت کی وسعت کے مسئلہ پر برابر غور کرتے رہے ہیں، مگر اٹھارھویں صدی میں جس آزادی کا گویا اجارہ انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور جس پر اب بھی انگریز فخر و ناز کرتے ہیں وہ حدود حکومت کی تحدید پر اس درجہ محتوی نہیں ہے جس درجہ اس طرز کی خصوصیت پر محتوی ہے جس کے بموجب حکومت چلائی جاتی ہے۔ ہمیں عام الفاظ میں اس بیان سے آغاز کرنا چاہئے کہ یہ خصوصیت کن امور پر مشتمل ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ پارلیمنٹ کو جو اقتدار تفویض کیا گیا ہے، اس سے اسے کچھ نہ کچھ سروکار ضرور ہے۔ جس طرح مفہوم اول میں آزادی بغیر درست مداخلت کی ضد تھی اسی طرح دوسرے مفہوم میں آزادی مطلق العنانی یا شخصی حکومت کی ضد ہے۔ پس اس حد تک یہ ارسطو کی "ملوکی" حکومت کے مقابلہ میں اس کی اعیانی حکومت یا دولت عامّہ کے ہم معنی ہے مگر ہم کبھی بھی لفظ آزادی کا اطلاق اس حکومت پر نہیں کرتے جسے ہم صریحی طور پر چند افراد کی حکومت تسلیم کرتے ہیں۔ انگلستان کی پارلیمنٹ اب قوم کی نہایت وسیع تعداد کی نمایندگی کرتی ہے مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ گزشتہ صدی کے وسط میں جبکہ دنیا میں یہی ایک "آزاد" پارلیمنٹ تھی تو وہ نسبتاً بہت ہی تھوڑے اشخاص کی نمایندگی کرتی تھی لیکن اگر وہ تعداد اثباتی حیثیت سے بدرجۂ اقل معقول تعداد نہیں تھی تو ہمارا ملک اپنی پارلیمنٹ کے طفیل میں آزاد خیال کئے جانے کا ہرگز دعویٰ نہ کر سکتا۔

دوسری طرف یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ دوسرے مفہوم کیطرح اس مفہوم میں بھی آزادی عملی طور پر بالعموم مطلق و مجرد ہونے کے بجائے زیادہ تر اضافی ہے۔ یہ ایک نہایت ہی خالی رائے ہوگی کہ جن ملکوں میں آزادی نظر آتی ہے ان کے زمرے میں انگلستان کو شمار کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا جائے کہ یہاں اتنے بہت سے

قوانین اصلاح کے بعد مردوں کے لئے ہمہ گیر حق رائے وہی ہنوز رائج نہیں ہوا ہے ؛ اگر یہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انگلستان کی آزادی مطلق و مجرد نہیں ہے بلکہ صرف اضافی ہے۔ ایک آزاد پارلیمنٹ کے لئے یہ ضرور ہے کہ وہ بدرجۂ اتل قوم کے ایک معقول تعداد کی نمایندگی کرتی ہو لیکن جب وہ سب کی نمایندگی کرے یا (جیسا کہ قدیم شہری مملکتوں میں ہوتا تھا) فی الواقع سب پر مشتمل ہو صرف اس صورت میں ہم یہ کہینگے کہ وہاں آزادی کے اس مفہوم میں مطلق و مجرد آزادی موجود ہے۔

اس رائے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ آزادی کا استعمال جب اس طریق پر کیا جاتا ہے تو اس سے جن واقعات اثباتیہ کا اظہار ہوتا ہے ان کی تہ میں ایک نظریہ مضمر ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم بخیال خود یہ جانتے ہیں کہ پارلیمنٹ کو اسقدر اختیار کیوں ہونا چاہئے کیونکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ پارلیمنٹ کو اس وقت تک کامل نشو و نما نہیں حاصل ہوتا جب تک کہ وہ کل قوم کی نمایندگی نہ کرے، یا واقعاً سب پر مشتمل ہو۔ اس نظریے کا اظہار عام طور پر حکومت خوداختیاری کے لفظ سے کیا جاتا ہے تاآنکہ اس مفہوم میں آزادی کو اکثر حکومت خوداختیاری ہی کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت تک میں نے حکومت کا ذکر اس طرح پر کیا ہے گویا وہ ایک نشان ہے جس سے سلطنت کا علم ہوتا ہے، اور حکومت کا مطلب میں نے یہ سمجھا ہے کہ اس کے ذریعے سے ایک شخص اپنی مرضی کو دوسرے شخص پر عاید کرتا ہے، جس سے زید سزا کے خوف سے وہ کام کرتا ہے جو خود زید نہیں بلکہ بکر کی مرضی کے موافق ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ اس زمرے سے وہ شے جسے حکومت خوداختیاری کہا جائے خارج ہو جاتی ہے لیکن ایک شخص خود اپنی مرضی سے جو چاہے کرے یا وہ دوسرے کی مرضی کے موافق عمل کرے۔ ان دو صورتوں کے درمیان ہم اغلباً ایک تیسری صورت کا تصور بھی قائم کر سکتے ہیں کہ وہ اس طرح کام کرے کہ وہ نہ محض اس کی مرضی ہو اور نہ محض دوسرے کی مرضی ہو بلکہ وہ ایسی شاہراہ عمل پر گامزن ہو جسے اس نے ایک خاص مقصد یعنی بہبود عامہ کے خیال سے خود اپنی ذاتی مرضی تصور کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا ہو حکومت خوداختیاری کی حقیقت عریاں یہی ہیں ہو گی۔ اس کا

ضابطہ ایک گونہ حسب ذیل ہوگا۔ زید فی الحال شخصی طور پر بالکل ہی ساکت رہنا چاہتا ہے مگر ہمسایہ قبیلہ کی طرف سے اس کی جماعت کو جو خطرہ لاحق ہے اس کا خیال کرکے اور اس کے اندفاع کے لیئے پرزور مشترکہ کارروائی کو ملحوظ رکھ کر وہ بلا کسی دباؤ کے خود اپنی خوشی سے دشمن کے مقابلے پر جانا پسند کرتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ یہ حکومت خود اختیاری ہے اور۔ اگر اس قسم کا کوئی طریقہ عمل میں آسکتا ہو تو یہ امر غالباً قرین قیاس ہوگا کہ مملکت کی کارروائیوں کے دامن سے جور و زیادتی کا وہ دھبہ دھل جائے جسنے ابتدا سے اسے خراب کر رکھا ہے اور اس قسم کی کسی شے کا جسے حکومت بلا تہدید کہا جائے وجود میں آنا ممکن ہو۔

غالباً یہ وہ مطمح نظر ہوگا جس کے حصول کے لئے معقول حد تک ایثار سے کام لینا انسب ہوگا، لیکن تم دیکھتے ہو کہ اس مقصد کے لیئے ہر ایک شہری سے فرداً فرداً دو ممیز حیثیتوں سے مشورہ کرنا ضروری ہوگا۔ اولاً اس سے صرف یہ پوچھا جائیگا کہ انفرادی حیثیت سے اس کی مرضی کیا ہے اور وہ کیا چاہتا ہے، ثانیاً اس سے یہ پوچھا جائے گا غالباً ایک ہمہ گیر مجلس کے رکن کی حیثیت سے ہر شے پر خیال کرکے جس میں بہبود عامہ کا خیال بھی داخل ہو وہ کس شاہراہ عمل کو اپنی مرضی کے مطابق تصور کرتا ہے۔ یہ حکومت خود اختیاری یا حکومت بلا تہدید ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ آیا اس قسم کی کوئی شے ممکن بھی ہے؟ اس کا ذکر اکثر اس طرح کیا جاتا ہے، گویا صرف اس کا امکان ہی نہیں ہے بلکہ یہ حاصل بھی ہو چکی ہے۔ چنانچہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس مبحث پر قوم نے اپنی مرضی کا اظہار کر دیا ہے اور وہ مرضی سب سے فایق ہے۔ مگر تم یہ دیکھو گے کہ میں نے جس مطمح نظر کی توضیح کی ہے وہ اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک کہ کوئی ایک شخص بھی .... ایسا کام کرنے پر مجبور کیا جائے جسے جملہ حالات پر نظر کرتے ہوئے وہ خود اپنی مرضی سے کرنیکا خواہشمند ہو۔ میں سر دست اس سوال کو برطرف کیئے دیتا ہوں کہ جب تک حق رائے وہی ہمہ گیر حد سے کچھ بھی کم رہے اس وقت تک ہم صحیح معنی میں قوم کی مرضی کا ذکر زبان پر نہیں لاسکتے، اور یہ کہ قوم کی مرضی کے تحقق کرنے کے لئے جب تمام مردوں کو شامل کر لیا جائے تو پھر تمہیں تمام عورتوں

اور تمام بچوں کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔ یہ ایک کھیل ہے۔ اس کے علاوہ اگر تم تہدید سے نجات بھی حاصل کر لو تو تمہاری ہمہ گیر پارلیمنٹ میں رائے بھی ہمیشہ بالاتفاق ہونا چاہیئے کیونکہ اس اصول پر کسی گروہ کثیر کو گو نشا امکانی حق ہے کہ وہ گروہ قلیل کو پابند کر سکے۔ میرا خیال ہے کہ گروہ کثیر کے اس حق کے لیئے کبھی بھی کافی ثبوت استحقاق نہیں پیش ہوا ہے۔ ایک فرانسیسی صاحب قلم نے بجا طور پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بے انتہا کثرت کے لیئے تو یہ حق روا رکھنا چاہیے، مگر قلیل کثرت کے لیئے اس حق کی حمایت کرنا تقریباً محال ہے پس اگر تین کرور میں سے دو کرور ننانوے لاکھ آدمی متفق ہو جائیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تقریباً قوم کی مرضی کا اظہار ہو گیا ہے مگر جب تین کرور ستر لاکھ نفوس کے سات سو نمایندوں کی مجلس میں صرف دس یا بیس کی کثرت رائے سے ایسا اعلان کیا جائے تو یہ حکم ہرگز نہیں لگایا جا سکتا۔

تعجب ہے کہ یہ مفروضہ کہ وضع قوانین کے معاملات میں کثرت کو کل کے برابر سمجھنا چاہیئے اور قلت کو خواہ وہ کم و بیش نصف باشندوں کی حد تک کیوں نہ پہنچ گئی ہو کچھ بھی شمار نہ کرنا چاہیئے اسقدر حاوی و وسیع ہو گیا ہے اور اسے بغیر بحث و حجت کے قبول کر لیا گیا ہے لیکن فرض کرو کہ ہم یہ خیال کر لیں کہ علم السیاست میں کثرت کو کل کے بجائے قرار دیدینا چاہیئے تو بھی حکومت خود اختیاری کا لفظ جو موزوں طور پر اس نظم حکومت پر عاید ہو سکتا ہے جسمیں انفرادی مرضی پر کوئی زیادتی نہ ہوتی ہو صحیح معنی میں اس نظم پر منطبق نہیں ہوتا جسمیں انفرادی مرضی کو اس وقت تک پامال کیا جاتا ہو جب تک کہ وہ بہ حیثیت مجموعی کل کے بالمقابل اصلی محض قلت ہو، اس قسم کا طریقہ غالباً سہولت کے اعتبار سے یا کسی دوسرے طریق کے انکشاف کی دشواری کے خیال سے بجا قرار دیا جا سکتا ہے مگر اسمیں قوم کی مجموعی مرضی اور حکومت بلا تہدید کے مطمح نظر سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔

پس اس کے بجائے کہ ہم حکومتوں کو دو شقوں میں تقسیم کریں ایک تو فرد واحد کی شخصی حکومت اور دوسری کل شہریوں کی خود اختیاری حکومت، یوں کہنا زیادہ انسب ہوگا کہ شخصی حکومت کی ضد قلت پر کثرت کی حکومت ہے یہ آخر الذکر قسم اگرچہ کسی نہج سے حکومت خود اختیاری نہیں ہے تاہم اس کے

اہمیت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ اس کی بنا حقوق مطلق پر کیونکر رکھی جا سکتی ہے، بلکہ یہ دعویٰ کرنا بھی نہایت ہی جلد بازی ہوگی کہ بہ اغلب وجوہ کثرت کی مرضی ہمیشہ کیا اکثر مرتبہ ہی قلت کی مرضی کے بہ نسبت قابل ترجیح ہوگی میرے خیال میں اس باب میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ قلت پر کثرت کو اختیار دینا ایک سادہ اور سریع الفہم اصول ہے اور جہاں کثرت بے انتہا زیادہ ہو، وہاں یہ قریب قریب بجا بھی ہے، حکومت سے بالطبع جو تنفر پیدا ہو جاتا ہے وہ اس طرح بدرجۂ غایت کم ہو جاتا ہے اور یہ اصول اس حد تک فطرت کے مطابق ہے کہ اس سے اقتدار ایسے جزو کو مل جاتا ہے کہ اگر جسمانی قوت سے کام لینے کی نوبت آ جائے تو بوجہ کثرت تعداد اغلباً یہی جزو غالب آ جائے گا۔ لیکن ان سب فواید کو ایک طرف کرکے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیاسیات کے شعبہ میں جتنے اختراعات ہوے ہیں ان سب میں سب سے اہم اور عظیم الشان اختراع کثرت کو عطاے حقوق کا اصول ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ہم محض مفروضات پر استدلال نہ کریں، اور جب یہ کہنا کافی ہے کہ کثرت کے سامنے سر جھکانا اکثر اعتبارات سے باعث سہولت ہے تو پھر ہمیں یہ نہ کہنا چاہئے کہ ایسا کرنا فی الواقع بجا ہے یا یہ کہ کثرت کو فی الواقع کل کے مرادف سمجھا جائے۔

میرا خیال ہے کہ یہ سب سے بڑا عملی انکشاف ہے، اگرچہ عام طور پر اس کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اختراع ہونیکے بجائے ایک اکتشاف ہے، اور یہ کہ عملی سہولت کے ساتھ ہی اسکا نظریاتی حق بھی موجود ہے اس کے علاوہ ایک دوسرا عظیم الشان اختراع بھی ہے جسکا اس سے قریبی تعلق ہے جسے زیادہ صریحی طور پر اکتشاف کہا جا سکتا ہے۔ علم السیاست میں ہمیں عام طور پر اس سے بچے رہنا چاہئے کہ ارادی تدبیر پر زاید از ضرورت زور دیں بیشتر سیاسی مظاہر قدرت ایجاد و اختراع کے بجائے زیادہ تر نشو و نما پا کر اپنی حالت موجودہ کو پہنچے ہیں مگر نیابتی نظم کا تصور جس نے سیاسی ادارات کی ہئیت کو بالکلیہ بدل دیا ہے وہ اس میں ایک استثنا ہے۔ میں تمہارے سامنے جو سیاسی

واقعات پیش کرنا چاہتا ہوں ان میں سے ایک یہ ہے کہ شخصی حکومت اور کثرت کی حکومت دونوں قدیم مملکتوں میں بھی پائی جاتی ہیں اور جدید مملکتوں میں بھی؛ مگر یہ مشکل سے کہا جا سکتا ہے کہ نیابتی طریقہ زمانۂ قدیمہ کے لوگوں کو معلوم تھا۔ قدیم وجدید دنیا کا یہ عظیم الشان فرق اس دوسرے وسیع فرق سے بہت ہی قریبی تعلق رکھتا ہے جس پر معاً ہماری توجہ منعطف ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ قدیم یونان واطالیہ میں مملکت وسیع قطعہ کے بجائے شہر کے مرادف تھی۔ یہ لازماً وہ پہلا مشاہدہ ہے جو ہمیں اس وقت حاصل ہوتا ہے جب ہم ان مملکتوں کا مقابلہ جدید یورپ سے کرتے ہیں۔ مگر دوسرا مشاہدہ یہ ہے کہ جس شئے کو ہم اکثر آزادی سمجھتے ہیں یعنی کثرت کی حکومت اس میں اگرچہ قدما اس حد تک پہنچے ہوئے تھے کہ زمانۂ جدیدہ میں غلبۂ کثرت کی تحریک (جس کا آغاز اٹھارھویں صدی میں ہوا) ایک طرح کی قدیم اصول ہی کی تجدید معلوم ہوتی ہے لیکن تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ قدیم زمانہ میں "آزادی" نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی تھی، جسکی تجدید اب غیر ممکن ہے۔ ایتھنز کی "کلنیریا" اہل ایتھنز کے نمائندوں کی مجلس نہیں تھی بلکہ (ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ) خود قوم تھی، اور اگر ہم یونان سے روما کیجانب متوجہ ہوں تو وہاں بھی ہم یہی حالت دیکھتے ہیں؛ وہاں بھی عمومی مجلسیں جمع ہوتیں اور مملکت کے کاموں کو چلاتی تھیں۔ وہاں ایک "مجلس سنتوریہ" تھی جس کی نسبت یہ خیال تھا کہ زمانۂ قدیم کے ایک بادشاہ سرویوس تولیوس نے اسے قائم کیا تھا اور اس کے دوش بدوش ایک "مجلس قبائلی بھی" تھی۔ ان دونوں مجلسوں میں بہت بڑا فرق تھا مگر ان میں سے کوئی بھی نیابتی اصول پر قائم نہیں ہوئی تھی۔ دونوں کے دروازے یکساں طور پر تمام شہریوں کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ روما کی "مجلس سینات" کا اثر بعض عہدوں میں اور بعض زمانوں میں بہت بڑھ گیا تھا اور اس میں بالیقین کل عامۃ الناس شامل نہیں تھے مگر یہ بھی کسی حیثیت سے نیابتی جماعت نہیں کہی جا سکتی۔

اس طرح ہم ارتقاء سیاسیہ کے اعتبار سے دنیائے قدیم اور عالم جدید میں دو عظیم الشان فرق معلوم کرتے ہیں۔ پس اب میں یہ ظاہر کروں گا کہ یہ

دونوں فرق ایک دوسرے سے کس قدر قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ اس تعلق پر نظر کرنے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سیاسی شعبہ میں انسانی ارتقا کا قطعی راستہ کیا رہا ہے۔ شخصی حکومت اور کثرت کی حکومت دونوں زمانۂ قدیمہ کی مملکتوں میں بھی رائج تھیں اور زمانۂ جدیدہ کی مملکتوں میں بھی پائی جاتی ہیں مگر زمانۂ قدیمہ کی مملکتیں چونکہ شہری مملکتیں تھیں اس لیے ان میں کثرت کی حکومت کے جاری کرنے کے معنی ایک ایسی مجلس کے قیام کے تھے جس میں تمام شہریوں کو جگہ ملے لیکن اس قسم کی کسی مجلس کا خیال اگر زمانۂ جدیدہ کے کسی مدبر کے سامنے پیش کیا جائے تو فوراً اس کی سانس رک جائیگی۔ جدید مملکتوں میں ترقی کا انتہائی نقطہ یہ ہے کہ ایسی مجلس قائم کیجائے جس کے انتخاب میں ہر شہری کو ایک نہایت ہی مختصر سا حصہ ملے مگر ایتھنز اور روما میں یہ شہری بجائے خود پارلیمنٹ کا رکن تھا۔ پس سوال یہ ہے کہ عمومیت کی یہ ہمہ گیری ان کے لئے کیوں ممکن تھی اور ہمارے لئے کیوں ناممکن ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ ان کے لیے اس کا امکان صرف اس وجہ سے تھا کہ ان کی مملکتیں شہری مملکتیں تھیں شہری مملکت میں آبادی کم ہوگی اور لوگ ایک دوسرے سے قریب قریب رہینگے۔ شہری مملکتوں میں اس قسم کے منظروں کا مشاہدہ ہو سکتا ہے جس کا بیان تمہیں ارسطو فانیس کے ناٹک مسمی "کارنیاں" کے آغاز میں ملیگا۔ وہاں تمہیں خود ایتھنز کی "اکلیزیا" کی طلبی و انعقاد کا بیان ملیگا۔ شاعر کہتا ہے کہ بازار میں لوگ قیل و قال کر رہے ہیں اور تم دیکھو گے کہ وہ شنگرفی رنگ کی رسی سے کترا کر نکل جانیکی فکروں میں لگے ہوئے ہیں۔ بے شک یہ ہمہ گیر رائے دہی کی ایک تصویر ہے۔ بازار میں ہر شخص کا صرف یہ حق ہی نہیں ہے بلکہ اس کا قطعی فرض بھی ہے کہ میدان "نکس" میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھے اور اس غرض سے کہ کوئی شخص نکل نہ جائے، بازار کے گرداگرد ایک رسی تان دیگئی تھی تاکہ کل آبادی کو میدان پارلیمنٹ کے اندر گھیر لے اور اس رسی میں رنگ اس لئے لگا دیا گیا تھا کہ جو لوگ اپنے ادا کے فرض سے بھاگ نکلنے کی کوشش کریں ان پر کم از کم داغ تو لگ جائے۔

لیکن ایک ملکی مملکت میں، جہاں کی آبادی تین کروڑ ہو، اور وہ دوناً گو

مربع میل پر پھیلی ہوئی ہو، وہاں اس قسم کی ہمہ گیر جمہوریت کیونکر جاری کیجا سکتی ہے؟ ارسطو خود حد سے بڑھی ہوئی شہری مملکت کا ذکر کرتے وقت اس دشواری کو محسوس کرتا اور یہ سوال کرتا ہے کہ کیا جو نقیب ایسے مجمع کثیر کو خطاب کریگا اس کا استنتور[1] یعنی نہایت بلند آواز ہونا ضروری نہیں ہے؟ درحقیقت یہی عملی رکاوٹ ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ارسطو کو یہ دشواری ناقابل دفاع معلوم ہوتی تھی۔ وہ کثیر التعداد کی حکومت کا تصور قایم کر سکتا تھا مگر وہ اس کا تصور صرف شہری مملکت کے اندر قایم کر سکتا تھا۔

لیکن اصول نیابت کو جاری کر کے اس رکاوٹ کو رفع کر دیا گیا ہے اور اس کا عظیم الشان فایدہ یہ ہے کہ اس کا انطباق ملکی مملکت پر ہو سکتا ہے۔ اس طرح قابل انطباق ہو جانے سے، اس نے بنی نوع انسان کے لئے ایک نئے سیاسی ارتقا کا امکان پیدا کر دیا۔ مدت دراز تک دنیا ئے قدیم کی عظمت دنیائے جدیدہ کے لئے بعینہٖ کسطرح ایک بلائے بیدرماں بنی ہوئی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ قدما سب کچھ کر گئے ہیں اور اب کچھ کرنے کو باقی نہیں رہا ہے۔ علم ادب، فنون لطیفہ، فلسفہ سب کچھ انھیں کا حق تھا۔ اس طلسم کو غالباً سب سے پہلے پندرھویں صدی کے ان بحری انکشاف کنندگان نے توڑا، جنھوں نے سب سے اول صاف و صریح طور پر عالم جدید کے معلومات کو دنیائے قدیم کے معلومات سے آگے بڑھا دیا۔ قدامت کی فوقیتوں میں سے ایک فوقیت اس کی سیاسیات کی بھی تھی۔ جا گیریت کے بے کیف عالم میں جہاں حکومت کی حیثیت ہمیشہ ایک ہی سی رہتی تھی اور وہ بھی بہت زیادہ بلند نہیں تھی، وہاں یہ یاد دلوں میں چٹکی لیتی رہتی تھی کہ زمانۂ قدیمہ میں شاندار مملکتیں اور مشہور مجلسیں تھیں جو ڈیموس تھینس اور سسرو کی فصاحت کے زیر اثر تھیں۔ لیکن وہ وقت بھی آ گیا جب اس شعبہ میں بھی عالم جدید، عالم قدیم کی ہمسری کے قابل ہو گیا۔ اس نے واقعاً

[1] "الیاڈ" میں نقیب کا نام استنتور ہے۔ یہ شخص بہت ہی بلند آواز تھا۔ اسی مناسبت سے ہر بلند آواز شخص کو انگریزی میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

قدیم "پولس" (شہر) کی تجدید نہیں کی مگر اس نے اسی کے قریب قریب ایک شئے بنائی جس سے آخرالامر دنیائے جدید اس حالت میں آگئی کہ وہ ارسطو کی "سیاسیات" میں ایک دوسرے حصہ کا اضافہ کر سکے۔ اس دنیائے جدید نے ملکی مملکت کو ترقی دیکر اور یہ ظاہر کردیا کہ کسطرح یہ ملکی مملکت بھی "پولس" کی تمام شان و شوکت آزادی اور عظمت و وقعت کی قابلیت پیدا کر سکتی ہے۔ یہ کام اس نے نیابتی اصول کے ذریعہ سے انجام دیا۔

پس اب تم دیکھتے ہو کہ جو نظم اس طرح پر جاری کیا گیا اور جس نے اسقدر مضبوط جڑ پکڑ لی ہے، وہ نہ صرف قطعی مفہوم میں حکومت خود اختیاری نہیں ہے بلکہ اس سے دو درجے بعید ہے۔ حکومت خود اختیاری قطعی معنی میں وہ حکومت ہوگی جو محکومین کی مرضی کے موافق ہو، مگر یہ اولاً ایک ایسی حکومت کا طریقہ ہے جو صرف کثرت کی مرضی کے موافق ہو اور یہ امر ایک بالکل ہی مختلف شئے ہے؛ دوسرے یہ ایک ایسا طریقہ ہے جسکے تحت خود قوم سے مطلقاً مشورہ نہیں کیا جاتا بلکہ صرف قوم کے نمایندوں سے مشورہ کیا جاتا ہے اور تم یہ جانتے ہو کہ جن نمایندوں سے مشورہ کیا جاتا ہے، ان کی تعداد کس قدر کم ہوتی ہے انگلستان میں تقریباً تین کرور ستر لاکھ کی آبادی میں سے دارالعوام میں نمایندوں کی تعداد سات سو سے بھی کم ہوتی ہے پس اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ اس طرز پر نہایت ہی مکمل طور پر عمل کیا گیا ہے تو بھی یہ یقینی ہے کہ اس طریق کے تحت افراد کو جو اختیار دیا جاتا ہے وہ بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ میں غایت درجے کے انتہائی مفروضات اختیار کرتا ہوں۔ اولاً یہ فرض کرو کہ حق رائے دہی انتہائی حد کو پہنچا دیا گیا ہے جس سے قریب قریب ہر شخص منتفع ہوتا ہے۔ ثانیاً اس کے نتیجہ کے طور پر جو پارلیمنٹ قایم ہوتی ہے وہ کل حکومت کو اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ ثالثاً یہ کہ ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ حکومت کے حدود انتہائی درجے تک وسیع کردیے گئے ہیں، یعنی ہماری تعریف کے موافق مملکت کے اندر انفرادی آزادی اقل قلیل حد کو پہنچا دی گئی ہے لیکن یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی افراد کو اختیار میں کتنی قدر حصہ ملتا ہے؟ اس امر کے تعین میں کہ یہ مختار مطلق مجلس کن افراد پر مشتمل ہوگی،

ہر شخص کو غالباً تین کروڑ میں سے ایک حصہ ملتا ہے۔ مجھے اس نظم کے متعلق بوسیوآبو کی رائے یاد آتی ہے۔ اب سے چالیس برس پہلے فرانس میں پارلیمنٹی حکومت نہایت شدید مرکزیت اور بے قرار حکومتی مداخلت سے ممزوج تھی۔ آبو اس پر لحاظ کرتے ہوئے اس طریق کے متعلق یہ کہتا ہے کہ ہر ایک فرانسیسی جب صبح کو آئینہ میں اپنا منہ دیکھتا ہے تو وہ اس خیال پر نازاں ہوتا ہے کہ وہ خود ہر حکمراں کے دو کروڑ ستر لاکھ حصص میں سے ایک حصہ کو دیکھ رہا ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ دیکھنا بھول جاتا ہے کہ وہ ایک مکمل غلام کو بھی دیکھ رہا ہے۔

بہرحال اس نیابتی اصول نے اسقدر گہری جڑ پکڑ لی ہے اور ہم اس سے اسقدر مانوس ہو گئے ہیں کہ شاید ہمارے لئے اس کی عظیم الشان اہمیت اور دنیا میں اس کی انتہائی سست رفتاری کے ساتھ اس کے شیوع کا سمجھنا دشوار ہو گیا ہے۔ لیکن تاریخ کے ایک بہت ہی بڑے اور بہت ہی شاندار واقعہ پہ نظر کرو۔ ہمہ گیر مجلسوں کے قدیم تر طریق کا خاتمہ بظاہر روما میں ہوا۔ وہ عجیب وغریب انقلاب جسے ہم رومانی جمہوریت کا زوال یا شاید روما میں آزادی کا زوال کہتے ہیں، وہ حقیقت میں شہری مملکت کا زوال تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کے بعد شہنشاہیت کو عروج ہوا، یعنی ایک ایسی مطلق العنانی قایم ہوئی جس میں یوماً فیوماً فوجی شان زیادہ آتی گئی۔ صدی پر صدی گزرتی گئی، تجربہ پر تجربہ ہوتے رہے مگر ایک تجربہ ہمیشہ مایوس کن ثابت ہوا اور وہ قدیمی جمہوریت کا بحال کرنا تھا اور نہ یہ ہو سکا کہ اس نوعیت کی کوئی اور شے پیدا کر لی جاتی۔ اس کے بعد سے کسی حکومت کو یہ موقع نہ ملا کہ وہ کوئی ایسی شکل اختیار کرتی جو مطلق العنانی کی شکل نہ ہوتی۔

اب اگر تم اس وجہ کی تحقیق کرو کہ جمہوریت کی تجدید ناممکن کیوں تھی تو تمھیں بہت جلد یہ منکشف ہو جائیگا کہ روما کے قدیم جمہوری ادارات اپنے اصل اصول ہی میں ایسے تھے وہ صرف ایک شہری مملکت کے لئے موزوں تھے اور روما دوبارہ شہری مملکت نہیں بن سکتا تھا۔ جب تک یہ بالکل محال نہ ہو گیا کہ روما کے شہریوں

کو باشندگان روما کے مرادف سمجھ لیا جائے اس وقت تک یہ ہو سکتا تھا کہ "مجلس سنتوریہ" "میدان مارس" میں جمع ہو کر قنصلوں کا سالانہ انتخاب کیا کرے مگر اب روما ایک وسیع مملکت کا مرکز ہو گیا تھا جو ایک طرف رھائن اور دوسری طرف ڈینیوب سے محدود تھی۔ اس توسع سے مملکت نے اپنی تمام ہئیت کو بدل دیا تھا اور بظاہر اپنے قدیمی ادارات سے تجاوز کر گئی تھی۔ مگر شاید تم یہ کہو گے کہ جب یہ صورت تھی تو آگسٹس نے کیوں نہ نیابتی طریق جاری کیا۔ اگر روما شہری مملکت نہیں رہا تھا تو کیوں اسنے روما میں وہ ادارات جاری نہیں کئے جو ایک ملکی مملکت کے لئے موزوں و مناسب تھے، لیکن تم اسی طرح یہ سوال بھی کر سکتے ہو کہ آگسٹس نے امریکہ کیوں نہ دریافت کر لیا؟ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اگر زمانہ قدیم کے سیاسی فلاسفہ کو یہ تحقیق کرنا دشوار تھا کہ کوئی شے ملکی مملکت بھی ہو سکتی ہے تو اس صورت میں کیا ہم رومانی مدبرین سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ یہ معلوم کر لیتے کہ حکومت کی مشین (کل) کے کن تغیرات اور کن اصلاحات سے ایک شہری مملکت ایک عمدہ ملکی مملکت میں تبدیل کیجا سکتی ہے؟ یہی وہ مسئلہ تھا جو ہم سے کسی حد تک اس وجہ سے مستور رہا کہ ہم ہر جگہ شاہی و جمہوریت، آزادی و غلامی کے اصطلاحات استعمال کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ ان اصلاحات کے متعلق یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ سیاسیات کی ہر امر کی توضیح کر دیتے ہیں اور اسی لئے ہمیں رومانی انقلاب میں بھی نظر آتا ہے کہ جمہوریت کا سقوط ہو گیا اور ملوکیت رائج ہو گئی، آزادی زایل ہو گئی اور مطلق العنانی رواج پا گئی۔ اس طرح کا بیان انقلاب کی ہئیت اصلیہ کو چھوڑ جاتا ہے۔ یہ ایک شہری مملکت کا سقوط اور اس کے ساتھ ان ادارات (بالخصوص عالمگیر غیر نیابتی مجلس) کا بھی سقوط تھا جو شہری مملکت کے ساتھ مخصوص تھے۔

شہری مملکت کے سقوط کے بعد حکومت میں کیا واقع ہوگا۔ یہ ایسا مسئلہ تھا جو اس زمانہ کے سیاسی ارباب تخیل کے حل کرنے کی حد سے بالکل باہر تھا۔ کسی کو غیب سے یہ معلوم نہیں ہو گیا تھا کہ کوئی ایسی ملکی سلطنت قایم ہو جائے گی جسمیں ارتقا کی قابلیت ہو۔ اور کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ ایسی مجلسیں دیکھنے میں آئیگی جو ان مجلسوں کے مثل ہونگی جنھیں ڈیموس تھینز اور سسرو نے مخاطب کیا تھا۔ یہ

ضرور ہے کہ یہ مجلسیں ہمہ گیر نہیں ہونگی مگر پھر بھی نہایت ہی وسیع ہونگی اور ان کی بنیاد نیابتی اصول پر ہوگی۔ اس نئے راستہ کے کھولنے اور اس پر کامیابی کے ساتھ گامزن ہونے کے لئے ہزار برس سے بھی زیادہ وقت صرف ہو گیا۔ انگلستان کی پارلیمنٹ جو اب پارلیمنٹوں کی ماں سمجھی جاتی ہے، اس کی نسبت ہم یہ جانتے ہیں کہ صحیح نیابتی شکل میں اس کی تاریخ تیرھویں صدی کے آخری حصہ سے شروع ہوتی ہے۔

اگرچہ اس اصول کی ترقی بجد سست رہی ہے لیکن یہ ایسی مستحکم ترقی ہوئی ہے کہ اس موجودہ زمانہ میں یہ اصول اور جو کچھ اس سے منتج ہوتا ہے وہ سیاسیات کے عین مرکز پر قائم ہو گیا ہے۔ انگلستان میں تیرھویں صدی سے سترھویں صدی تک پارلیمنٹی حکومت نے نمایاں ترقی نہیں کی۔ پارلیمنٹ تھی ہر حال میں، اور بعض زمانوں میں وہ نہایت طاقتور بھی ہو گئی تھی مگر ان چار صدیوں میں نیابت کے اصول نے وہ تمام ترقیاں نہیں کیں تھیں جو اسمیں پنہاں تھیں۔ اس کے بعد سترھویں صدی کے انقلابات پیش آئے میں نے یہاں ان انقلابات کا نام اس غرض سے نہیں لیا کہ ان پر بحث کروں بلکہ ان کا نام صرف اس غرض لیتا ہوں کہ ان کے مجموعی نتیجے پر رائے دوں۔ دوسرے اضطرابات جو اپنے بعض مدارج میں نہایت درجہ وحشیانہ و پریشان کن ہو گئے تھے ان کا انجام ۱۶۸۸ء میں نہایت خوبی سے ہو گیا۔ اس سال میں ایک ایسی قرارداد طے پا گئی جس نے ایک بڑی ملکی مملکت کے لئے حکومت بذریعہ کثرت کی وہ خاص شکل مستحکم کر دی جس کی بنیاد نیابتی اصول پر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ قوم کی یہ نیابت نہایت درجہ نامکمل تھی، تاہم بڑے بڑے مسائل میں بھی نیابتی مجلس کا اقتدار مسلم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ صدی آئی جسمیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ انگلستان ان تمام ادارات کا اجارہ بن گیا ہے جنھیں "آزاد" کہا جاتا ہے لیکن انقلاب فرانس کی جنگوں کے بعد سے حقیقتاً و اصلاً اسی کے مثل ایک طریق بر اعظمی مملکتوں میں بھی شایع ہونا شروع ہو گیا۔ ۱۸۳۲ء میں اسے مستحکم ترقی حاصل ہوئی اور اب اگر ہم آزادی کا اندازہ حق رائے دہی کی وسعت سے کریں تو ایک سے زائد بر اعظمی مملکتیں آزادی کے معاملہ میں انگلستان سے آگے بڑھی ہوئی ہیں۔

نیابتی طریق کے ہمہ گیر طور پر رائج ہو جانے سے کرۂ ارض کے سیاسی ادارات میں ایک طرح کی نمایاں یکسانی پیدا ہو گئی ہے۔ جس طرح ارسطو کی مملکت یعنی "پولس" کی طرح ارسطو کی مجلس عمومی "ایکلزیا" (جو شہریوں کے تمام مجمع کو حکومت کا اختیار عطا کرتی تھی) وہ بھی غائب ہو گئی ہے۔ کثیر التعداد کی حکومت اب صرف ایک مرمہ شکل میں نظر آتی ہے؛ اس کے معنی اب نمایندگان کی نسبتاً ایک چھوٹی سی مجلس کی حکومت کے ہیں؛ مگر اس مرمہ شکل میں اسے وہ بلند ترین اعزاز حاصل ہوا ہے جو سیاسی شعبہ میں کسی شے کو دیا جا سکتا ہے کیونکہ اسے "آزادی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

خطبۂ ہشتم

گزشتہ خطبے میں ہم کثیر التعداد کی حکومت کے تصور پر بحث کر رہے تھے اس طرز حکومت نے زمانۂ جدیدہ کی مملکتوں میں جو مرمہ صورت اختیار کی ہے اس پر مزید غور و فکر کرنے سے قبل ہمیں یہ موقع حاصل ہے کہ ہم فرد واحد کی اس حکومت کی زیادہ گہری طور پر جانچ کریں جسے ہم مطلق العنانی کے نام سے اس حکومت کے ساتھ مقابلہ کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

یہ ایک رواج ہو گیا ہے کہ مطلق العنانی کو لعنت محض، بھوت پریت اور فوق الفطرت بدی سمجھا جائے جس نے توہم پرستی سے اتحاد کر لیا ہو اور جو فانی انسان کی بدقسمت نسل کو خاک میں ملاتی رہتی ہو۔ یہ اعتقاد ایک دوسرے اعتقاد کا ایک جز و ہے جو آزادی کو غیر مشروط خدائی رحمت ظاہر کرتا ہے جسکی نما ہر زمانہ اور ہر جگہ میں یکساں ہوتی ہے۔ بیشک مطلق العنانی کی ایک نوع ایسی ہی مہیب ہے جیسی اس نظریہ میں خیال کی گئی ہے۔ غیر عضوی مملکتوں میں جہاں ہر شے کی بنا جور و ستم اور فتح پر ہوتی ہے، وہاں ایسے افعال ہولناک نادرات سے نہیں ہوتے مگر یہاں ہمیں غیر عضوی سلطنتوں سے کوئی بحث نہیں ہے۔ ہمیں حکومت کے جن اقسام سے تعلق ہے انھوں نے کسی نہ کسی دباؤ کے مقابلہ میں سیاسی بنیادی اصول کے ردعمل سے نشو و نما پایا ہے۔ انھیں اقسام میں سے ایک قسم فرد واحد کی حکومت ہے۔ اصول موضوعہ کے مطابق یہ کسی نہ کسی ضرورت کو رفع کرتی ہے اور بعض صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ ایک اہم ضرورت جسے یہ رفع کرتی ہے وہ چند افراد کے ظلم کے خلاف عام قوم کے تحفظ کی ضرورت ہے،

چنانچہ ہم یہ جانتے ہیں کہ جولیس سیزر نے اپنی زندگی کا آغاز روما کے عمومی فریق کی سرگروہی کی حیثیت سے کیا، اور زمانۂ مابعد میں والی شہنشاہ ان سینانی قناصل کے مظالم کے مقابلہ میں جن کا انحصار اعیانیت پر تھا، صوبوں کے باشندوں کے حامی وسرپرست بن گئے۔ اسی طرح انگریزوں نے مسلح طبقۂ امرا کی بے ضابطگیوں کے خلاف اپنے پُرزور ٹیوڈر بادشاہوں کی تائید کر کے انھیں اپنا محافظ بنایا۔ اسی طرح ولندستان کی جمہوریہ میں جب قوم نے سیاسیات میں دخل دیا تو اس نے شہزادہ آرنج کے لئے اپنی ٹوپیاں اچھالیں اور شہریوں کے ظلم کے خلاف (Orange Bone) کو اعلام شعاری بنایا اور اسی کا شور مچایا۔ پھر دیکھو کہ جس ملک میں ایک صدی قبل ملوکیت غیر معمولی طور پر بے وقعت تھی اسی ملک میں تیرھویں صدی میں فرانسیسی شاہی کس سرعت کے ساتھ مطلق العنانہ اختیارات کی حد تک پہنچ گئی۔ یہ صرف اس طرح وقوع میں آیا کہ جاگیری امرا کے ظلم کے خلاف ردعمل ہونے لگا اور بلدیات (کیموں) جنھیں تمام فرانس میں دفعتہً یہ معلوم ہو گیا کہ امرا کے خلاف ان کی جدوجہد میں بادشاہ ان کی مدد کے لئے آمادہ ہے، انھوں نے بادشاہ کی تائید کی۔ ایک مثال اور لو مطلق العنانی کی اس سب سے قوی شکل پر نظر کرو جس کا علم جدید یورپ کو ہے۔ کس شے نے اتنی مدت تک روس کو اپنے فرمانروایان زار کا وفادار بنا رکھا؟ وہ شے عامۃ الناس کی یہ خواہش ہے کہ "بوباریں" (ممتاز امرا) کے مقابلہ میں انھیں کوئی طاقتور محافظ مل جائے۔ زارینہ این کی تخت نشینی کے شہرۂ آفاق واقعہ کا مشاہدہ کرو۔ جب امرا نے این سے جو کورٹس کورلینڈ تھی ایک ایسے تخت پر جلوس فرما ہونے کے لئے کہا جس کے متعلق اس کا استحقاق بہت کمزور تھا، اور انھوں نے اپنی تائید کے معاوضے کے طور پر اسے ایک دستور سیاسی کا پابند بنانا چاہا، تو کس شے نے ان کی اس تجویز کو درہم برہم کر دیا؟ قوم بغاوت پر آمادہ ہو گئی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ زارینہ کی کمزوری ان کے لئے یہی ظلم و ستم کے ہم معنی ہے۔ قوم نے اس امر پر اصرار کیا کہ اسے مطلق العنان ہونا چاہئے اور اس قوم کے لئے یہی بمنزلہ منشور تھا کہ زارینہ نے اس منشور کو چاک کر ڈالا جو امرا نے اس سے بزور حاصل کیا تھا۔

اس قسم کی مثالوں سے عمومی سیاسی فلسفے کے متعلق تمہارے دلوں میں ایک طرح کی بے اطمینانی سی پیدا ہو جائیگی۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے لفظ "آزادی"

کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے تمہیں یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم سیاسی اصطلاحات کے استعمال میں جیسا چاہیے، ویسی سختی سے کام نہیں لیتے مگر میری ان رایوں نے عمومی فلسفہ کے قلعہ کو کسی قسم کی دھمکی نہیں دی تھی بلکہ میرا رجحان صرف یہ تھا کہ ہم ان مطالب کو دوسرے اصطلاحات میں زیادہ سہولت کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں۔ میں صرف ایک لفظ کا تغیر چاہتا تھا؛ لفظ آزادی جس کا استعمال ہم نے دوسرے مفہوم میں زیادہ باعث سہولت سمجھا ہے اس کے بجائے صرف عمومی اصول یا عمومی حکومت کے الفاظ رکھدو، اور وہ نظریۂ مقبولہ بدستور صحیح معلوم ہو گا۔ مگر مطلق العنانی کے اس تصور کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔ عمومی نظریہ میں کوئی شے اتنی مہیب نہیں ہے، جتنی مطلق العنانی۔ یہ نظریہ اس کی ضد کے طور پر عمومیت کو اس حیثیت سے پیش کرتا ہے کہ یہ مکمل مسرت و خوشحالی کی حکومت ہے۔ یہ نظریہ فی الجملہ عددیت کو پسند نہیں کرتا الا اس حد تک کہ عددیت میں جمہوری شان ہے اور اس میں ایک مجلس کے اندر بحث و مباحثہ لازم ہے اس حد تک یہ نظریہ اسے مطلق العنانی سے کم مہیب سمجھتا ہے۔ مطلق العنانی کو تو یہ میکسیکو کی بت پرستی کے ہم مرتبہ قرار دیتا ہے۔ لیکن اب تم یہ دیکھتے ہو کہ تاریخی مثالوں سے ممکن ہے کہ مطلق العنانی کی ایک دوسری ہی کیفیت پیش کیجائے جس کے بموجب یہ بدترین حکومت نہو بلکہ یہ ایک ایسی تدبیر ہو جس کے وسیلے سے اس سے بھی زیادہ ظالمانہ حکومت سے نجات حاصل کیجائے۔ پس اس اصولِ موضوعہ کے مطابق یہ حکومت عمومیت کی ضد ہونے کے بجائے اس کی ایک بھدی سی شکل ہو جائیگی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک وسیع آبادی جو ایک وسیع قطعۂ ملک پر پھیلی ہوئی ہو اور بڑے بڑے امراء کے ظلم و جور کے مقابلے میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہو، وہ اتنے وسیع رقبے پر خود کسی متحدہ عمل کے انتظام کے ناقابل ہونیکے باعث اپنی تمام قوتوں کو ایک شخص واحد کے ہاتھ میں جمع کر دے گی اور اسے ایک ایسے گرز آہنی سے مسلح کر دے گی جو انفراداً و اجتماعاً ان دشمنان قوم کی سرکوبی کے لئے کافی ہو۔ اس قسم کی طاقت عددی سیئات کے مقابلے میں بہت ہی بے قوارہ اور ظاہر بغیر متمدن معلوم ہو گی۔ اس کی ضرب سخت ہو گی اور وہ ادیبانہ و شاعرانہ

فصاحت سے کام نہیں لے گی مگر اس کی یہ بدقواری اور درشتی گویا عمومی ہوگی۔ مطلق العنان کو جب اس رنگ میں دیکھا جائے تو وہ صرف ایک سرابنوہ معلوم ہوتا ہے جسے اختیارات سے مسلح کر دیا گیا ہو۔

بعض شخصی حکومتوں کی تو بالیقین یہی خصوصیت تھی اور بعض میں ہمیں یہ پتا چل سکتا ہے کہ ابتداءً ان میں یہ خصوصیت رہی ہے لیکن بعد میں متعدد خرابیوں کی وجہ سے زایل ہو گئی ہے۔ تاہم اس سے قبل کہ ہم شاہی و جمہوریت کے اس مقابلہ کو اور اس اصول مسلمہ کو (کہ وہ بھی قریب قریب ہمہ گیر کے ہے) ترک کر دیں کہ عمومیت، مطلق العنانی کی ایک پرزور اور تقریباً انتہائی ضد ہے، ہمارے لیئے یہ بہتر ہوگا کہ ہم مطلق العنانی کے تصور کی جانچ کسی قدر زیادہ دقت نظر سے کریں کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس لفظ (مطلق العنانی) سے صرف امر واقعہ کا اظہار ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے کسی حد تک اس کی تشریح بھی ہو جاتی ہے۔ اس نام کے ساتھ اس مظہر سیاسی کے متعلق ایک طرح کا نظریہ بھی مضمر ہے، کیونکہ اس تمام اعتقاد مقبولہ میں یہ خیال سرایت کیئے ہوئے ہے کہ حکومتیں دو قسم کی ہیں جو ایک دوسرے سے اصلاً و قطعاً ممیز ہیں اور ان میں امتیاز یہ ہے کہ ایک حکومت اعلےٰ ہے اور ایک حکومت اسفل ہے۔ ہم اقتدار کے دو طرز مسلسل اپنی نظروں کے سامنے رکھتے ہیں جو بلا شک وشبہ ایک دوسرے سے مغایر ہیں اور یہ دونوں طرز ہمارے لیئے عملی رہبر کا کام دیتے ہیں جن کی نسبت ہمارا یقین یہ ہے کہ وہ ہمیں کبھی غلط راستہ پر نہ لیجائیگا۔ ان میں سے ایک "خلقی اقتدار" ہے جو تحکمانہ لہجہ میں گفتگو کرتا اور قوت سے کام لیتا ہے۔ اس نوع کو جب نہایت ہی جانبدارانہ طریق پر بیان کیا جائے تو اس کی مثال بچوں پر باپ کے اقتدار سے دیجاتی ہے۔ اسی ایک خاص مثال میں اسے مستحسن و جایز قرار دیا جاتا ہے مگر اس کے ساتھ دعوےٰ یہ کیا جاتا ہے کہ جب مملکت کے اندر حکمراں اس قسم کے اقتدار کا مدعی ہو تو یہ اس وقت تک روا نہیں ہو سکتا کہ شہریوں کو بچوں کے درجے تک پست کر دیا جائے اور حکمراں کے ساتھ ایک ایسی خلقی فوقیت منسوب نہ کر دی جائے جس کا ہونا اس میں ممکن نہیں ہے۔ دوسرا طرز "مفوضہ اقتدار"

کا ہے اس میں حکمراں درحقیقت خادم ہوتا ہے اور رعایا بہ حیثیت مجموعی حکمراں ہوتی ہے۔ اس کی ایک بدیہی مثال کسی دائرۂ معاشری یا تاجرانہ شرکت کے عہدہ داروں کی ہو سکتی ہے جنھیں کسی حد تک اقتدار صرف اسی غرض سے عطا کیا جاتا ہے کہ معاشرے کی خواہشیں زیادہ عجلت و مستعدی کے ساتھ پوری ہو سکیں۔ مگر ان کی نسبت یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ان کی خود اپنی کوئی رائے ہے یا کم از کم یہ کہ اگر کثرت سے انھیں اس درجہ اختلاف ہو کہ وہ اپنی رائے سے دست کش نہ ہو سکیں تو وہ خاموشی کے ساتھ کنارہ کش ہو جائیں۔ حکومت کے متعلق یہ خیال جو سب سے پہلے روسو نے مدون کیا ہے اور اس وقت سے یورپی انقلابات کے لیے باعث ہیجان بنا ہوا ہے اسے قوم کے اقتدار اعلیٰ کا اصول کہا جاتا ہے ان دونوں مخالف طرزہائے حکومت کے نظریہ کی قدامت اور رسوخ جمہوریہ اور دولت عامہ کے الفاظ کے استعمال عام سے ظاہر ہے۔ ان میں ایک لفظ دوسرے کا ترجمہ ہے اور ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ ان میں سے کوئی لفظ بھی حکومت کی کسی ایک شکل کے لیے ممیز نام کے طور پر نہیں استعمال کیا سکتا کیونکہ حکومتوں میں کتنا ہی اختلاف باہمی کیوں نہ ہو پھر بھی اتنا تو ضرور ہوگا کہ "بہبود عام" کے دعوے میں وہ سب متفق اللسان اور سب کی سب یکساں طور پر "جمہوریات" ہوں گی مگر یہ نام انھیں مملکتوں کو دیا جاتا ہے جہاں کوئی مجلس حکمراں ہوتی ہے اور کوئی بادشاہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ بادشاہ کے لیے یہ اقرار بھی ضروری نہیں ہے کہ اس کا مقصود بہبود عام ہے بلکہ وہ محض اپنے خلقی اقتدار کی بنا پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ اس نظریہ کی تہ میں اس امتیاز کا ہونا اس سے عیاں ہے کہ وہ کرامویل اور نپولین کے ایسے حکمرانوں کو کس طرح زیر بحث لاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ دونوں شخصی حکمراں ہونے کے اعتبار سے اس سے کم مطلق العنان نہیں تھے جتنا چارلس اول ہونا چاہتا تھا یا جتنا لوئی چاردہم فی الواقع تھا، لیکن ان پر نظر لوئی اور چارلس سے بالکل مختلف طریقے سے ڈالی جاتی ہے کیونکہ ہم فرض یہ کر لیتے ہیں کہ وہ اس امر کے معترف تھے کہ ان کا یہ مطلق العنانہ اختیار انھیں قوم ہی سے حاصل ہوا تھا، اور قوم ہی کے لیے تھا۔

یہ امتیاز اگر حقیقی ہو تو واقعی یہ نہایت درجہ اہم ہے اور اگر ہم یہ خیال کرنے پر مجبور ہوں کہ لوئی چہاردہم، چارلس اول اور بادشاہوں کا وہ طویل سلسلہ جو ایک مدت تک بیشتر یورپی ممالک میں انھیں اصول حکومت کی نمایندگی کرتا رہا ہے وہ سب کے سب اپنی رعایا پر اس طرح حکومت کرتے تھے جیسے کوئی مالک اپنے گھر کے غلاموں پر حکومت کرتا ہو، اور وہ رعایا کو اپنی فایق طاقت سے پامال کر رہے تھے تو تاریخ ہمارے لئے نہایت ہی مہیب بن جائیگی۔ پہلے ہم اپنے ذہن میں لوئی چہاردہم کا یہ تصور قایم کریں کہ اپنی قوت فایقہ سے فرانسیسی قوم کو پامال کر رہا تھا۔ یہ صاف عیاں ہے کہ ہم ان الفاظ کو ان کے حقیقی لغوی معنی میں نہیں لے سکتے۔ غلاموں کا کوئی مالک کبھی واقعاً اپنے تمام غلاموں کو قوت فایقہ کے زور سے قابو میں نہیں رکھتا بلکہ وہ اُس قوت فایقہ کی دھمکی دیکر انھیں قابو میں رکھتا ہے جسے وہ بہ عجلت تمام طلب کر سکتا ہے۔ کیونکہ ملک میں غلاموں کے ہونے سے وہاں کی تمام آزاد آبادی غلاموں کو مطیع رکھنے پر متحد ہو جاتی ہے۔ آگے چلئے! اگر فرانسیسی قوم لوئی چہاردہم کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوتی تو کیا وہ انھیں زیر کرنے کے لئے قرب وجوار کے بادشاہوں سے امداد طلب کر لیتا؟ کیا جرمانیہ وانگلستان سے پولیس کے دستے امن بحال کرنے کے لئے بھیجدئے جاتے؟ تم جانتے ہو کہ یہ کبھی نہیں ہوتا اور فرانسیسی قوم کے دل میں یہ گمان بھی نہیں پیدا ہوتا کہ ایسا ہوگا۔ تو آخر کیا ہوتا؟ وہ اپنے سپاہیوں کو طلب کرتا۔ کیا کہا؟ سپاہی! میرا خیال تو یہ تھا کہ یہ سپاہی بھی انھیں فرانسیسیوں میں سے تھے جنھیں وہ زیر رکھتا تھا بلکہ درحقیقت اس کے لئے ایک خاص دشواری بھی ہوتی تھی کہ اس کے غلاموں میں سے ایک بہت بڑی تعداد مسلح و قواعد دان ہوتی تھی۔ اگر تم یہ قبول کرو کہ لوئی چہاردہم کا انحصار اس کی سپاہ پر تھا تو پھر یہ یقینی طور پر عیاں ہے کہ اسے بھی بالکل اسی طرح قوت "معمولی لوگوں کے ذریعہ سے حاصل ہوتی تھی" جس طرح اُس حکمراں کو حاصل ہوتی ہے جو یہ کہتا ہے کہ وہ اپنا اختیار قوم سے حاصل کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طریقے مختلف ہیں مگر دونوں صورتوں میں تائید رعایا ہی کی طرف سے حاصل

ہوتی ہے، محض بادشاہ کی طرف سے نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح قوم کی تائید نہ رہنے کی صورت میں موجودہ زمانہ کے حکمران کو سپر ڈال دینا پڑیگی اسی طرح اگر فوج لوئی چہاردہم کو چھوڑ دیتی تو اسے بھی سر جھکا دینا پڑتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت اعلےٰ اور حکومت ادنےٰ کے مابین جو نقیض نظر آتی ہے وہ فریب نگاہ ہے۔ کسی ایسے شخصی حاکم کا وجود جو قوت فایقہ کے ذریعہ سے اس طرح حکومت کرتا ہو جیسے باپ بچوں پر حکومت کرتا ہے ایک خیال محال ہے۔

اصلیت صرف یہ ہے کہ نسبتۃً ایک چھوٹی تعداد اپنے فایق تر ارتباط و تنظیم کے ذریعے سے ایک بہت بڑی تعداد کو قابو میں رکھ سکتی ہے اور اس چھوٹی تعداد کا ایک سرخیل ہو سکتا ہے مثلاً کرالویل خود اپنی ذاتی طاقت سے انگریزی قوم کو قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا مگر پچاس ہزار کی ایک تربیت یافتہ فوج کے ذریعہ سے جو اس کی گرویدہ تھی وہ بآسانی ایسا کر سکتا تھا! مگر اس فوج کی خدمات حاصل کرنے کے لئے اس نے کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو ترغیب دیکر آمادہ کیا ہوگا اور اگر ایسا تھا تو اس کا دارومدار انہیں لوگوں پر تھا یعنے وہ ان لوگوں کے سامنے جوابدہ تھا۔

درحقیقت یہ ایک تعجب کی بات معلوم ہوتی ہے کہ حکومت کی تمام شکلوں میں سے ہم صرف شاہی شکل کے متعلق یہ خیال کریں کہ اس کا انحصار قوت پر ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ حکومت کی تینوں ارسطاطالیسی شکلوں میں سے صرف یہی ایک شکل ہے جس کا دارومدار محض قوت پر نہیں ہو سکتا۔ کثیر التعداد گروہ بہت آسانی کے ساتھ قوت کے زور سے حکومت کر سکتا ہے کیونکہ اسے قوت میں فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ معدودے چند کا بھی ایسا کرنا ممکن ہے کیونکہ تنظیم و انضباط سے وہ اپنی قوت کو عملاً غالب بنا سکتے ہیں مگر شخص واحد ایسا نہیں کر سکتا زیادہ سے زیادہ ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ کسی بہت ہی چھوٹے سے تمدنی قبیلہ میں کوئی ایکلیس محض جسمانی قوت کی فوقیت کے زور سے کچھ عرصے تک حکومت کرے۔ لیکن اگر ہم اس شخصی حکومت کی تشریح کی کوشش کریں تو ہمیں بہت جلد قوت فایقہ کی تخویف محض کے ساتھ ہی

ساتھ قدر افزائی، امید انعام، اور احساس مفاد عامہ کو بھی اطاعت کے اغراض میں جگہ دینا پڑیگی۔

مختصر یہ کہ اگرچہ معدودے چند اور کثیر التعداد دونوں یکساں طور پر خود اپنی ذات پر بھروسہ کر سکتے اور خالص قوت کا استعمال کر سکتے ہیں مگر بادشاہ ایسا نہیں کر سکتا بلکہ اسے ضرورتاً کسی نہ کسی شخص کو اپنی مدد پر راغب کرنا پڑتا ہے، کسی نہ کسی کو یہ یقین دلانا پڑتا ہے کہ اس کی حکمرانی مفید ہے اور اس لئے اس کا دارومدار کسی نہ کسی دوسرے شخص پر ہوگا یعنی وہ کسی نہ کسی کے سامنے ذمہ دار ہوگا۔ اس لیئے اگرچہ غیر ذمہ دار عددیت اور اس سے بھی زیادہ غیر ذمہ دار عمومیت کا ہونا بالکل ممکنات سے ہے اور ایک معمولی بات ہے مگر کسی ایسے ادارے کا وجود جسے غیر ذمہ دار بادشاہی کہا جائے ناممکن ہے۔

اگر ہمارے دلوں پر قدیم حقوق ربانی کے قدیم اختلاف آراء کی گرد نہ جمی ہوتی تو یہ امر ہم پر بہت صاف روشن ہو جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ اس بحث سے ہم ایک ایسی فوق الفطرت مختار کل وجود کا تصور پیش نظر رکھ لیتے ہیں جو بادشاہ کی تائید میں ہو اور اس پر بہ تامل نظر غور نہیں کرتے کہ آیا یہ فوق الفطرت قوت فی الواقع بادشاہ کی تائید کرتی ہے یا بعض اشخاص غلطی سے ایسا سمجھتے ہیں۔

ہمیشہ یہ تعلیم دیگئی ہے کہ فرائض منصبی کے جملہ قوانین خدائی احکام سے نافذ ہیں۔ ہمیں جو کچھ کرنا چاہیئے اس کا کرنا ہی ہمارے لئے بہتر ہے اور جو ہمیں نہیں کرنا چاہیئے اس کا کرنا ہمارے لئے برا ہے۔ مذہب اور خاصکر عیسوی مذہب حکومت کی اطاعت کو عموماً ایک اخلاقی فرض قرار دیدیتا ہے، پس لامحالہ حکومت اس تعلیم کا نفع اٹھاتی ہے اور لوگ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ جو وجود عالم کائنات پر حکمراں ہے وہ اس کی تائید کرتا ہے۔ لازماً نہیں مگر عموماً اس وجود کے متعلق یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ وہ جسطرح فطری وسایل سے عمل کرتی ہے اسی طرح فوق الفطری وسایل سے بھی کام لیتی ہے، پس اس حد تک حکومت کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ فوق الفطری قوت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ مگر یہ سمجھنا غلط ہے کہ اس اصول کا اطلاق صرف شاہی حکومت پر ہوتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ

اس کا اطلاق کل حکومتوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اکثر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ابتداءً "عہد نامۂ جدید" کی ان مشہور آیات کا مقصود یہ نہیں تھا کہ موروثی شاہی پر ان کا اطلاق کیا جائے بلکہ انتخابی شہنشاہیت پر ان کا اطلاق مقصود تھا۔ خدا کی جانب سے جس امر کا مفروض ہونا کہا جاتا ہے وہ صرف شاہی کے لئے نہیں ہے بلکہ عام طور پر قوت موجود الوقت کے لئے ہے۔ اگر حکومت کی تمام دوسری شکلوں کی بہ نسبت بادشاہی نے اس مذہبی حکم سے عملاً زیادہ نفع حاصل کیا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمام یورپ میں کئی صدی تک بادشاہی وہ حکومت تھی جسنے قوت موجود الوقت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ دوسری حکومتیں بھی جب ضرورت سمجھتی ہیں بالکل اسی طرح مذہب کو اپنی تائید کے لئے طلب کرتی ہیں؛ اعیانیت اور اس سے بھی زیادہ عمومیت یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ حکومت کی جو صحیح، واجب و مذہبی شکل ہو سکتی ہے وہ یہی طرز حکومت ہے اور عمومیت کے جانبدار ہمیشہ یہ کہتے رہے ہیں کہ مسیحی منتہائے خیال کا عملی مظاہرہ اس سے ہوتا ہے۔

لیکن اہم شے دیکھنے کی یہ ہے کہ مذہبی احکام جب حکومت کو قوت پہنچاتے ہیں تو وہ کس طریقے پر قوت پہنچاتے ہیں۔ میں نے یہ بتایا ہے کہ بادشاہ کا انحصار محض قوت پر نہیں ہو سکتا کیونکہ قوت فائقہ ہی وہ شے ہے جس کی اس میں نہایت بدیہی طور پر کمی ہے، اور پھر بھی وہ خصوصیت کے ساتھ تحکمانہ بلند لہجہ اختیار کرتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مدار کسی ذاتی فوقیت باطنی پر ہے۔ سوال یہ ہے آیا یہ اس وجہ سے ہے کہ قوائے سماوی فی الواقع اس کی جانب سے برق و رعد کے ذریعہ سے مداخلت کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ میرے نزدیک واقعہ اس کے خلاف ہے اس لئے کہ مذہب کا عمل عقیدے کے ذریعہ سے ہوتا ہے، مرئی طور پر نہیں ہوتا۔ وہ راعی و رعیت کی قوت کے واقعی تناسب میں کوئی فرق نہیں کرتا بلکہ وہ رعایا کے دلوں پر عمل کرتا ہے۔ وہ ان کے دلوں میں حکمران کے متعلق ایسی رائے قایم کر دیتا ہے جو کسی اور نہج سے قایم نہیں ہو سکتی تھی۔

لوئی چہار دہم فرانسیسیوں کے درمیان فی الواقع ایک نہایت کمزوری ہستی تھا مگر بہت سے اشراسنا کی وجہ سے جن میں یہاں مذہب کا اثر بھی سب سے زیادہ اہم تھا، یہ فرانسیسی اسے ہیبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انھیں غالباً ہمارے بہ نسبت اس امر کا زیادہ یقین نہیں تھا کہ اگر کوئی شخص اس کی نافرمانی کرے گا تو آسمان سے آگ آکر اسے فوراً جلا کر خاک سیاہ کر دیگی۔ تمام امور پر لحاظ کرکے ان میں جو خیال رائج تھا وہ یہ تھا کہ اس کی وفادارانہ اطاعت کرنا مناسب و مصلحت آمیز ہے۔ ان امور میں، حال، استقبال، وہ خود، ان کی آئندہ نسلیں اور ان کا ملک ان کے جسموں کی بہتری اور ان کی روحوں کی بہتری سب چیزیں شامل تھیں۔ اگر ایسا تھا تو تم یہ دیکھتے ہو کہ لوئی چہار دہم کا مدار بلا واسطہ تائید سمادی پر نہیں تھا بلکہ درحقیقت اس کا انحصار رعایا کے دلی جذبات پر تھا۔

میرے اس قول کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ کوئی شخص خالصتاً قوت کے زور سے حکمرانی نہیں کر سکتا لیکن جس طرح کہ معدودے چند قوت کے ساتھ تنظیم کا اضافہ کرکے کثیر التعداد پر غالب آسکتے ہیں، اسی طرح فرد واحد دھوکے اور دغا سے اپنی ناکافی قوت کو بڑھا سکتا ہے۔ شخصی حاکم ایک ایسا فریب کار ہوتا ہے جو فوق الفطرت قوت کا جھوٹا ادعا کرتا ہے اور توہم پرستی و فریب دہی کے ذریعہ سے اپنا اقتدار قایم رکھتا ہے۔

بیشک، خاص حالات میں اور تھوڑی مدت کے لئے ایسا ہونا بالکل قرین قیاس ہے جیسا کہ ہمیں خراسان کے نقاب پوش پیغمبر کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے۔ فوق الفطرت طاقت کے ذریعہ سے نہ سہی مگر فوق الفطرت طاقت کے ادعا کے ذریعہ سے ایک شخص واحد علی اغراض کے لئے کثیر التعداد سے زیادہ قوی بن جانے میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے اور اس طرح وہ اپنی رعایا سے آزاد اور غیر ذمہ دار بن سکتا ہے۔

لیکن اس قسم کا امکان محض ہمیں شخصی حکومت کی تاریخی مثالوں کی تشریح میں مطلق مدد نہیں دیسکتا۔ ہم پھر اسی لوئی چہار دہم کو دربار میں لاتے

ہیں۔ جس ہئیت کے ساتھ اس کا پاس و لحاظ کیا جاتا تھا اس میں ایک زبردست مذہبی عنصر بھی شامل تھا، اور ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ جس مذہبی تعلیم نے اس خیال کی پرورش کی تھی وہ بالکلیہ صحیح نہیں تھا۔ اس میں تو ہم پرستی کا داغ لگا ہوا تھا لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر کوئی فریب تھا تو لوئی چہاردہم خود اس فریب کا بانی نہیں تھا؛ یہ مبالغہ آمیز دعاوی خصوصیت کے ساتھ اس نے نہیں پیش کیئے تھے، نہ ان لوگوں نے پیش کئے تھے جو اس سے تنخواہ پاتے تھے۔ ایک مخصوص عقیدہ فرانسیسی کلیسا اور قوم میں پیدا ہو گیا تھا جس نے ایک طویل مدت میں مختلف حالات سے قوت حاصل کر لی تھی اور لوئی چہاردہم نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ پس دیکھیئے یہ رائے جو اس کے لیئے اس درجہ سودمند تھی اس کے شایع کرنے والے وہ بالکل دوسرے اشخاص تھے، وہ اپنی رائے کو بدل سکتے اور دوسری رائے شایع کر سکتے تھے۔ پس اس کا دار مدار انھیں پر تھا اور وہ کسی حد تک ان کو جواب دہ بھی تھا۔ وہ اگر کامیابی سے حکومت کرنا چاہتا تھا تو اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ بہت غور و فکر کے ساتھ ان لوگوں کے مزاجوں کو دیکھتا سمجھتا اور ہموار کرتا رہے جنھوں نے قوم کو اطاعت کرنا سکھایا تھا۔ جس طرح کرامویل کا انحصار اس کی فوج پر تھا اسی طرح ایک بڑی حد تک لوئی چہاردہم کا انحصار اس کے اساقفہ پر تھا۔ وہ فی الجملہ پاپائیت کے ساتھ مخاصمت میں ان اساقفہ سے اپنی تائید کرانے میں کامیاب ہوا لیکن اگر ایسا اتفاق ہوتا کہ یہ اساقفہ اس کے خلاف ہو جاتے تو اس کا دور حکومت اس وقت کسی اور ہی رنگ میں نمایاں ہوتا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا لیکن جہاں ایک طرف جدید یورپ کے حد علم تک کوئی مطلق العنانی لوئی چہاردہم کی مطلق العنانی سے زیادہ مکمل نہیں تھی، وہیں دوسری طرف یہ بھی تھا کہ کمتر ہی مملکتیں ایسی ہونگی جنھیں اس درجہ اتحاد خیال اور اتنی کامل عضویت رہی ہو جیسی اس زمانے کے فرانس میں تھی۔ اس زمانہ میں اپنے بادشاہوں کے ساتھ فرانسیسیوں کی عقیدت کیشی ضرب المثل ہو گئی تھی اور لوئی پانزدہم کے نصف عہد تک اس میں

تزلزل نہیں آیا۔

جس امتیاز کو میں تمہارے ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اسے میں علمی لحاظ سے نہایت درجہ اہم سمجھتا ہوں۔ عمومی تصور کے موافق مطلق العنانی محض ایک بھوت ہے جس کے بوجہ کسی دوسری کسی قسم کی زندگی یا حرکت باقی نہیں رہتی۔ اس کے دباؤ کے نیچے کسی قسم کے اعتراض کا اظہار رکسی قسم کی سیاسی مستعدی بہبود عام کا کوئی خیال، مطلقاً باقی نہیں رہتا، صرف مبتذل غلامی، کاہلی اور موت باقی رہجاتی ہے۔ لیکن یہ امر ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ مطلق العنانی اپنے متعلق اس قسم کے خیال کے اندفاع کرنے کے بجائے اس کی حمایت داری کرتی ہے کیونکہ مطلق العنان اسے پسند کرتا ہے کہ اس کی نسبت یہ سمجھا جائے کہ وہ اپنے اختیارات کو عالم علوی سے حاصل کرتا ہے اور وہ اپنی مفروضہ غیر ذمہ داری پر فخر کرتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ تاریخ کے طالب علم کو مطلق العنانی کچھ اور ہی رنگ میں نظر آتی ہے: اولاً اسے یہ پتا چلتا ہے کہ حکومت کی اس شکل کا بھی زیرین تائید پر اسیقدر مدار ہے جس قدر کسی دوسری شکل کا ہے اسے اپنی تحقیقات کے سلسلے میں کوئی ایسی مطلق العنانی نہیں ملتی جس کی نسبت وہ نہایت ہی وثوق کے ساتھ اُن اغراض یا جماعتہائے اشخاص کا پتا نہ لگا سکے جن کی تائید پر اس کا بھروسہ تھا۔ حکومت کی دو ممیز شکلیں جن میں سے ایک ذمہ دار اور دوسری غیر ذمہ دار، ایک کا منفذ اعلےٰ ہو اور دوسرے کا ادنےٰ۔ یہ تصور آہستہ آہستہ اس کے دل سے محو ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ وہ مطلق العنانی کو مخصوص صورتوں میں عام خیال کے مطابق ہولناک بلکہ بعض وقت اس سے زیادہ ہولناک پاتا ہے، تاہم بظاہر یہ تمام صورتیں ایک ہی صنف یعنی غیر عضوی حکومت کی صنف کے تحت میں آجاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مطلق العنانی جب قوم سے خارج کسی گروہ مثلاً فاتحوں کے کسی غول یا کسی اجیر فوج، کی تائید پر منحصر ہوتی ہے تو ان صورتوں میں اکثر اس کے ظلم و ستم کی کوئی حد نہیں رہتی مگر جب مطلق العنانی عضوی ہوتی ہے اور ایسا ہونا شاذ نہیں ہے تو اس صورت میں یہ کسی نہج سے وہ بے کیف زندگی نما موت کے مترادف نہیں

ہوتی جیسا ہم اُسس کی نسبت خیال کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ دستوری وزیر کیطرح مطلق العنان کو بھی رائے عامہ کا پاس کرنا پڑتا ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اسے کن اغراض کو ہموار رکھنا اور کن طبقات کو آزردہ نہ کرنا اور کن ضروریات عامہ کو پورا کرنا چاہیئے۔ شاہان ٹیوڈر کی تاریخ کا مطالعہ کرو، لوئی چہاردہم کا مطالعہ کرو، جدید پروشیا کا مطالعہ کرو، یہ تمام مطلق العنانیاں عضوی ہیں اور اس لئے اُن سے عضوی زندگی کے تمام حرکات واعمال کا اظہار ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اب ہم معقول طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ملوکیت اور جمہوریت یا دولت عامہ کے درمیان مقبول عام امتیاز غلط ہے، اور اسے ترک کردینا چاہیئے۔ ان دونوں آخری الفاظ سے بظاہر ایک ایسی مملکت کا اظہار ہوتا ہے جس میں حکومت کا مقصود کل کی بہبودی ہو، پس کیوں یہ الفاظ کسی ایسی مملکت کے ظاہر کرنے کے لئے مخصوص ہوں جو شاہی نہ ہو گویا ہر ایک بادشاہ مثلاً الفرڈ یا سینٹ لوئی لازماً (بادشاہ ہونیکی حیثیت سے) ظالم وجفا کار تھے، اور ہر ایک حکمران مجلس مثلاً وینس کی مجلس عظمےٰ یا سلا کے زمانہ کی رومانی مجلس سینات بلازماً نیکدل تھیں۔

ہمارے اس نظم میں "جمہوریت" یا "دولت عامہ" اس حالت کے ظاہر کرنے کے لئے نہایت ہی موزوں اصطلاحات ہیں جنھیں ہمنے عضوی مملکت کہا ہے۔ ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ عضوی مملکت قابل نفرت دباؤ کی مقاومت کے واسطے معاشری عضویت کی سعی یعنی عام بہتری یا بہبود عامہ کے لئے جد وجہد کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی ضد وہ تمام مملکتیں ہیں جنھیں ہم نے غیر عضوی کہا ہے کیونکہ ان کی بنا کسی گروہ یا فرقہ کی اس کوشش پر ہوتی ہے کہ وہ قوم کو اپنے خاص فایدے کے لئے ڈرا کر یا دھمکا کر رکھے۔ میرے پیش نظر خاصکر وہ حالت ہے جہاں یہ گروہ فاتح غول ہو۔ غالباً آگے چلکر میں غیر عضوی مملکت پر زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کرونگا۔ یہ لازمی نہیں ہے کہ یہ مملکت شاہی ہو، مثلاً "مملوکوں" کی حکومت

ایک عددیت تھی۔ لیکن چونکہ فوج پر حکمرانی سپہ سالار کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور چونکہ اس قسم کی مملکت کی نوعیت ایک فوج کی سی ہوتی ہے اس لئے غیر عضوی مملکت کی حکومت عام طور پر شاہی ہوتی ہے کیونکہ وہ حکمراں گروہ کے سپہ سالار کے ہاتھ میں ہوتی ہے جیسے شہنشاہ، خان، سلطان خدیو یا بادشاہ کہتے ہیں۔

یہ بادشاہ فی الحقیقت غیر ذمہ دار نہیں ہوتا، کیونکہ اس کا انحصار تمامتر حکمراں گروہ کی مرحمت پر ہوتا ہے۔ خود سلطان ترکی، جس سے زیادہ کبھی شخصی حکمراں کو اختیارات مطلق حاصل نہیں ہیں وہ بھی "نئے عسکریوں" کی بغاوت میں اکثر ایک لمحہ کے اندر تخت سے اُتار دیا جاتا تھا، مگر عامۃ الناس کے سامنے وہ بالکلیہ غیر جوابدہ تھا۔ اور یہ امر اس کی رعایا کی حد نظر سے رہجاتا تھا کہ لوگوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جس کی مدد کے بغیر بادشاہ کچھ نہیں کر سکتا، لہذا رعایا کے تصور میں وہ زمین پر ایک دیوتا معلوم ہوتا ہے اور جو مظنہ اس تصور ثانیہ سے، جو اس کے حق میں اس درجہ مفید ہے وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ یہ شجرہ اس "شاعرانہ عنصریت" یعنی غیر ذمہ دار بادشاہ کا ہے جسکی حکومت کی بنا منجانب اللہ ہے رعایا میں سے کوئی عنصر اسکا موئید نہیں سمجھا جاتا، اور جسے کہا مایا قادر مطلق انسان تصور کیا جاتا ہے۔

لیکن حقوق ربانی کا دعوے کرنیوالے یورپی بادشاہ اس صنف سے تعلق نہیں رکھتے اگرچہ کسی حد تک وہ اس کا ادعا کرتے ہیں۔ خاندان ٹیوڈر اور لوئی چہار دہم کی بادشاہی کا انحصار ضرورت عامہ پر تھا، رائے عامہ سے اس کی تائید ہوتی تھی اور ایک لمحہ کے لئے انھوں نے یہ دعوی نہیں کیا کہ بہبود عامہ کے سوا اور کوئی امر ان کے پیش نظر ہے؛ مگر انکا دعوے یہ تھا کہ بہبود عامہ کے لئے جو کارروائیاں وہ اختیار کریں اس کے لئے وہ قوم کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں بلکہ صرف خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ یہ ایک وہمی خیالی نظریہ تھا مگر وہ حکومت فی الواقع جس نوع کی تھی اس کے متعلق اس نظریہ کی وجہ سے ہماری رائے پر اثر نہیں پڑنا چاہئے۔ جیمز دوم نے یہ خیال اپنے ذہن میں

قایم کر لیا ہوگا کہ وہ اپنی رعایا کے سامنے جوابدہ نہیں ہے۔ اس کا بہت کچھ افسوس ہے مگر اس سے زیادہ عیاں و بدیہی کوئی امر نہیں ہو سکتا کہ ایسا تصور قایم کرنے میں اس نے اپنے اقتدار کی نوعیت کے سمجھنے میں غلطی کی، اور اگر خود لوئی چاردہم نے یہ خیال کیا ہو کہ اس کے اختیار کا انحصار اس کی قوم پر نہیں ہے تو اس نے بھی اتنی ہی غلطی کی، اگرچہ اس کی غلطی کا اظہار اس قدر پُر زور طریقے پر نہیں ہوا۔

پس شاید ہم ان نتائج کو مسلمہ قرار دے سکتے ہیں اولاً یہ کہ ہر قسم کی تمام ملوکیتوں کا انحصار کسی معقول تعداد کے گروہ پر ہوتا ہے۔ اکثر صورتوں میں یہ گروہ قوم کا ایک جزو ہوگا اگرچہ ایسی صورت بھی ہمارے ذہن میں آسکتی ہے کہ یہ گروہ قوم سے علیحدہ ہو اور دوسرے ملک سے بادشاہ کو مدد بھیجتا ہو: مثال کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بقا ہندوستانی آبادی کے کسی فرقے کی مدد پر منحصر نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے ملک یعنی انگلستان کی آبادی کی مدد پر منحصر ہے۔

ثانیاً یہ کہ ایک شے ایسی عضوی بادشاہی بھی ہے جو عضوی ہونے کے ساتھ ہی مطلق العنان بھی ہو اس میں اگرچہ کوئی پارلیمنٹ نہیں ہوتی مگر اسے شاہی دولت عامہ یا جمہوریت کہہ سکتے ہیں اس قسم کی مطلق العنانی کا انحصار شاید تمام قوم کی مرضی پر تو نہیں مگر کم از کم اس حصۂ قوم کی مرضی پر ضرور ہوگا جسے معاملات عامہ میں دلچسپی ہوتی ہے۔ قطعی الفاظ میں یوں کہئے کہ اسے سیاسی طبقات کی مستعدانہ مرضی اور بقیہ کی خاموشانہ مرضی حاصل ہوتی ہے۔ شاہی دولت عامہ کا فقرہ ایسی پارلیمنٹی حکومت کے ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے جس کا سرتاج کوئی بادشاہ ہو مگر تم دیکھتے ہو کہ میں یہاں اسے ایک دوسرے ہی مفہوم میں اس حکومت پر دلالت کرنے کے لئے استعمال کرتا ہوں جسے اگرچہ عمومی تائید حاصل ہوتی ہے مگر وہ مطلق بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

شاید تم یہ سوال کروگے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم بالارادہ

مطلق العنانی کی تائید کرے گویا اسے غلامی سے الفت ہے؛ اگر فی الواقع قوم کی خواہشوں کو دریافت کیا جائے تو یہ یقینی ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے لئے رائے دیگی۔ میں اس کا جواب یہ دونگا کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اکثر عملی دشواریاں ایسی پیش آجاتی ہیں جو قوم کے حسب خواہ پارلیمنٹ کی تکوین کے مانع ہوتی تھیں چنانچہ زارینہ این کے تخت نشینی کے وقت روس میں کوئی مجلس ایسی قایم نہیں کیجا سکتی تھی جو عدیدی نہ ہوتی کیونکہ روس میں امراء کے نیچے کوئی طبقہ ایسا نہیں تھا جس سے کوئی ایسی مجلس مرتب ہو سکتی مگر وہی قوم نے اس قسم کی عدیدی مجلس کے مقابلہ میں بالقصد ایک مطلق العنان زارینہ کو پسند کیا۔ غالباً اس سے بھی زیادہ کثیر الوقوع حالت وہ ہے جہاں قوم کی اولین ضرورت جنگ کی سرکردگی ہو۔ ایسے وقت میں تمام دوسرے مقاصد تحفظ عامہ کے مقابلہ میں ملتوی کر دیئے جاتے ہیں اور تمام طبقات واغراض اس سردار کی تائید پر متحد ہو جاتے ہیں جو قوم کو فتحمندی تک پہنچانے کے لئے سب سے زیادہ قابل معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ نازک حالت عارضی ہو تو اس سے صرف ایک مختصر المدت آمریت وجود میں آجائیگی لیکن اگر یہ نازک حالت مستقل نوعیت کی ہو جو کمزور سرحد کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو (جیسے پروشیا کی حالت ہے) یا اس قومی عزم کی وجہ سے لاحق ہوئی ہو کہ جب تک کوئی مضبوط سرحد نہ ملے اس وقت تک بالاستقلال جنگ جاری رکھی جائے (جیسی فرانس کی حالت ہے) تو اس سے مطلق العنان بادشاہوں کا ایک سلسلہ وجود میں آجائیگا جو اپنے تخت پر مستحکم ہوگا۔ یہ خیالات روس کے زار، لوئی چاردہم، فریڈرک اعظم اور نپولین سب کے معاملات کی یکساں تشریح کرتے ہیں۔ ان تمام صورتوں میں صرف اتنا ملحوظ رہنا چاہیئے کہ اس طرح پر جو عضوی مطلق العنانی پیدا ہوتی ہے اس میں ہمیشہ یہ امکان رہتا ہے کہ جس ضرورت سے وہ وجود میں آئی تھی اس کے بعد بھی وہ قایم رہجائے۔ اس کے کام کے پورے ہو جانے کے بعد اس کا خاتمہ کر دینا قریب قریب ناممکن کے ہے۔ جس قوم کو اس نے کسی وقت میں بچایا ہوتا ہے اس پر ایک یا دو نسل تک یہ بارکنت کیطرح سے مسلط رہتا ہے۔ عضوی

مطلق العنانی کے مجرب باقیات اکثر ایسے ہی ناقص ہوتے ہیں جیسے خود غیر عضوی مطلق العنانی، اور اس سے ہمارے دلوں میں یہ خیال مشکل سے قایم رہ سکتا ہے کہ مطلق العنانی بھی کسی حال میں حکومت کی کوئی صحت بخش فطری اور نفع رساں صورت ہو سکتی ہے۔

میں اس تمام دوران میں یہ سعی کرتا رہا ہوں کہ ایک خیالی فرق کو رفع کرکے مطلق العنانی اور حکومت بذریعہ مجلس کے درمیان صحیح فرق و امتیاز کے لئے جگہ نکالوں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حکومت اعلےٰ کی وقعت ایک خیال سے زائد نہیں ہے جو اس غیر عضوی حکومت کے غلط تصور سے پیدا کر لیا گیا ہے جس کا انحصار اتفاقاً قوم کے باہر کسی چھوٹے گروہ مویدین پر ہو۔ اجنبی گروہ، اجیر یا غیر ملکی سپاہیوں کے وسیلے سے اس قسم کی حکومت واقعی مطلق العنانی اور ایسی مطلق العنانی ہے کہ تاریخ میں بکثرت پائی جاتی ہے مگر اس صورت میں وہ غیر عضوی ہوتی ہے اور یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں ہے۔ عضوی مطلق العنانی پہلی نظر میں غیر ممکن اور بے ربط معلوم ہوگی مگر مجھے یقین ہے کہ میں نے تم پر ظاہر کر دیا ہے کہ ایسا نہیں ہے اور تاریخ کو جن عظیم ترین اور متمدن ترین مطلق العنانیوں کا علم ہے وہ اسی قسم کی ہیں۔ عضوی ہونیکی وجہ سے قوم کی مرضی پر ان مطلق العنانیوں کا انحصار پالیمنٹی یا جمہوری حکومتوں سے کم نہیں ہوتا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کس لحاظ سے اس قسم کی مطلق العنانیاں حکومت بذریعہ مجلس سے مختلف ہوتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ سوال بہت ہی محیر العقل ہے خاصکر ایک غلطی کی وجہ سے جو علم السیاست کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن علمائے طبعیات کے لئے باعث پریشانی نہیں ہے۔ ماہر علم الاجسام جن حیوانات کا مطالعہ کرتا ہے اگر وہ حیوانات خود اس کے کان میں برابر یہ پھونکتے رہتے کہ خود ان کے خیالات، ان کے نظریات اور ان کی ساخت و تنظیم کیا ہے تو یہ امر اس شخص کے لئے کس قدر دشوار ہو جاتا۔ سیاسی مباحث و ادارات کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے اپنے پیش نظر

اور واقعہ پر توجہ کرتا اس وجہ سے دشوار ہوتا ہے کہ وہ شور نظریہ، اظہار بیان اور غلط بیانی کے شور سے اس کے کان بہرے ہوجاتے ہیں اور وہ اپنے زیرِ تحقیق موضوع سے ہٹ جاتا ہے۔ پارلیمنٹی حکومت کی نوعیت کے متعلق ہمیں سترھویں صدی کی انگریزی پارلیمنٹ کے مباحثات کیطرف رجوع ہونا پڑتا ہے مگر کون نہیں جانتا ہے کہ یہ مباحثے قانونی مفروضات اور از کار رفتہ نظریات سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ اس تہ بر تہ مفروضات میں سے سیدھے سادے واقعات کو نکال لیا جائے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ انگریزی دستور کی رو سے عمومی مجلس نے محاصل عائد کرنے کا حق خود اپنے لئے محفوظ رکھا ہے۔ اس مثال سے عمومی حکومت کے اصل اصول کے طور پر یہ عام قاعدہ اخذ کر لیا گیا ہے کہ کسی شخص پر خود اس کی مرضی کے بغیر محصول نہ لگانا چاہئے۔ یہ کسقدر بھونڈی، بے معرف اور عجوبہ تعمیم ہے، اور اپنے جدید معنی میں یہ بالکل ہی غلط ہے۔ محصول سے ہماری مراد وہ سالانہ چندہ ہے جس پر حکومت کا کلی انحصار ہوتا ہے۔ تاہم اسٹوئرٹ کے زمانہ میں حکومت اپنا گزارہ بالکل ہی دوسری طرح کے سرمایہ سے کرتی تھی اور صرف غیر معمولی حالات ہی میں محصول لگانے پر متوجہ ہوتی تھی۔ پس جیسا کہ ہم خیال کرتے ہیں ان دنوں میں محاصل کے اختیار کے معنی یہ نہیں تھے کہ حکومت جب کبھی غیر ہر دلعزیز روش اختیار کرے تو یہ اختیار حکومت کو بیدست و پا کر دینے کی قوت کا کام دے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس تاریخی غلطی کے علاوہ، اس قسم کے اصول کے معنی کیا ہونگے؟ محصول میں کون ایسا خاص تقدس ہے کہ ہم یہ دعوےٰ کریں کہ دوسرے معاملات میں حکومت اپنی مرضی سے جو چاہے کرے صرف قوم کی جیب سے روپیہ نکالنے کی جرأت نہ کرے۔ یہ صاف عیاں ہے کہ جب ہم اس طرز پر تعمیم کرینگے تو ہم اس نہایت کو جس کے لئے ہمارے بزرگ سعی کرتے رہتے تھے اس ذریعہ کے ساتھ خلط ملط کر دینگے جسے انھوں نے بوقت حاجت صرف اس وجہ سے اختیار کر لیا کہ اتفاق سے ان کا ہاتھ وہاں تک پہنچ گیا تھا۔ ہم محض ایک عملی تدبیر سیاسیات

کی محض ایک اتفاقی ترکیب پردہ جوشش و احترام ضایع کر رہے ہیں جو فی الواقع جلیل القدر ہمہ گیر اصول ہی کو زیب دیتا ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے طریق سے بھی ہم گمراہی میں پڑجاتے ہیں جب ہم یہ قرار دیتے ہیں کہ انگلستان میں پارلیمنٹ اختیار قانون سازی کا اور بادشاہ یا وزیر عاملانہ اختیار کا عضو ہے اور پھر اس کے بعد اس طرف چل نکلتے ہیں کہ سترھویں صدی کی مخاصمت کو اس رنگ میں دکھائیں کہ وہ ایک ایسی کشمکش تھی جس کے ذریعہ سے قانون ساز عضو نے خود کو عاملانہ عضو سے آزاد کرلیا، تو یہ بھی ایک گمراہی ہو گی، یہ یقینی ہے کہ اسے فلسفے کے قالب میں ڈھالنے کی یہ کوشش اس دوسری کوشش کے برابر لغو نہیں ہے، مگر میں اسے کسی طرح صحیح نہیں تسلیم کرسکتا، لیکن افسوس ہے کہ میں اسوقت اس کی جانچ کرنے کے لئے ٹھہر بھی نہیں سکتا۔

اگر یہ صحیح ہو، تو سترھویں صدی کی اس قابل یادگار جد وجہد سے بظاہر ہماری اس کوشش میں بہت کم مدد ملیگی کہ ہم حکومت بذریعہ مجلس اور شخصی حکومت یا مطلق العنانی کے فرق باہمی کی کوئی عام کیفیت بیان کرسکیں، جب تک کہ ہم ان دونوں شکلوں کو غلط فرض نہ کرلیں، کیونکہ ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ ایک طرف شخصی حکومت میں جماعت عاملانہ نے اختیار قانون سازی کو ھضم کرلیا ہے اور دوسری طرف حکومت بذریعہ مجلس میں اختیار قانون سازی میں اختیار عاملانہ جذب ہو گیا ہے۔

میں اس وقت اشارۃً یہ بتانا چاہتا ہوں (اور غالباً دوسری مقامات کے خطبات میں بالتفصیل یہ ظاہر کرونگا) کہ سترھویں صدی کے انقلابات سے نتائج تعمیمی نکالتے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ یہ انقلابات تاریخ کے نہایت ہی دلچسپ باب ہیں مگر اس کے ساتھ ہی مشکل و پیچیدہ بھی ہیں۔ طالب علم کا اس وقت تک اس باب کے سمجھنے کے لئے تیار ہونا دشوار ہے جب تک کہ وہ علل شرعی کے اصول مسلمہ کو نہ سمجھ لے اور یہ نہ سیکھ لے کہ کسی عظیم الشان سیاسی قلب ماہیت کے ہمعصر بیان کی تعبیر کرنے میں

حیل شرعی کی کس قدر رعایت مدنظر رکھنا چاہئے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس مختص مسئلہ زیر بحث کے متعلق زمانۂ گزشتہ کی بہ نسبت خود اپنے زمانہ کے حالات سے زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہے۔

ادھر حال کے زمانہ میں عمومی حکومت نے انگلستان میں بالتخصیص شفاف شکل اختیار کرنی ہے حیلۂ قانونی کم سے کم حد کو پہنچا دیا گیا ہے اور تمام کارروائی کو صاف کرکے دکھا دیا گیا ہے، جس سے یہ کارروائی بہت ہی سادی اور قابل فہم ہوگئی ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ملک پر ایک مدبر حکومت کرتا ہے جس کا لقب وزیر اعظم ہوتا ہے اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ علانیہ طور پر کثرت کی رائے پر اپنا انحصار سمجھتا ہے۔ جب تک یہ رائے اس کی تائید کرتی ہے وہ صاحب اقتدار رہتا ہے۔ جب اس میں تذبذب آجاتا ہے وہ مضطرب و متردد ہوجاتا ہے اور جب یہ رائے اس کے خلاف فیصلہ کردیتی ہے تو پھر وہ کوئی مقاومت نہیں کرتا بلکہ بلاتاخیر اپنے عہدے سے دستکش ہوجاتا ہے اور اس کا جانشین وہ مدمقابل مدبر ہوتا ہے جس کی جانب مروجہ رائے کی وفاداری منتقل ہوجاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں اتنی تفصیل سے ظاہر کرچکا ہوں، عضوی مملکتوں میں ایک حد کے اندر ہمیشہ اس سے بہت کچھ مشابہ طریق کی پیروی کیجاتی ہے کیونکہ اگرچہ تمام مملکتوں میں حکمرانی کا انحصار ہمیشہ مویدین کے کسی نہ کسی گروہ کی حسب خواہ رائے یا پسندیدگی پر ہوتا ہے مگر عضوی مملکتوں میں حکمران اپنا اختیار عام قوم کی جانب سے اخذ کرتا ہے اور ہم اس بات کو طے کرچکے ہیں کہ اس سے سروکار نہیں ہوتا کہ حکمران کس استحقاق پر اپنا مدار کار رکھتا ہے۔ اپنے اقتدار کے متعلق وہ خود کونسا نظریہ اختیار کرتا یا اختیار کرنے کا دعوےٰ کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ یہ دعوےٰ کرے کہ وہ حکمرانی کے منصب کا اس قانونی حق سے وارث ہوتا ہے جس سے کوئی زمیندار اپنے علاقے کا وارث ہوتا ہے، یا یہ کہ وہ خداداد تقرر کی بنا پر حکومت کرتا ہے، خواہ یہ دعوےٰ اس فطری مفہوم میں ہو جیسے باپ بچوں پر حکومت کرنے کے لئے گویا خدا کیطرف سے مقرر ہوا ہے یا یہ دعوےٰ فوق الفطری مفہوم میں ہو جیسا کہ انجیل میں حضرت داؤدؑ کی نسبت کہا گیا ہے کہ انھوں نے "اس شخص کے مثل

حکمرانی کی جو عین خدا کی مرضی کے موافق ہوا"۔ یہ نظریات صحیح ہوں یا غلط، ہر حالت میں وہ موثر صرف اسی صورت میں ہو سکتے ہیں جب قوم کے سامنے بطور دلایل کے پیش کیئے جائیں۔ وہ اس امر کے وجوہ ہیں کہ قوم کیوں اس حکمراں کی تائید کرے جو ان ہی نظریات کو پیش کرتا ہے۔ ان میں بجائے خود یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی امر کی تائید کر سکیں لیکن اگر ان دلایل سے قوم کو یقین آ جائے تو حکمراں اپنی جگہ پر قایم ہو جائیگا۔ اسی صورت میں بالفاظ مختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا قیام فلاں فلاں استحقاق پر ہے مگر حقیقت میں اس کا قیام ان چند اشخاص کی تائید پر ہوتا ہے جو ان وجوہ سے اس کی تائید کرتے ہیں جنھیں وہ اچھا سمجھتے ہیں، اور اس کے سوا اور طرح اس کا قیام ہو نہیں سکتا۔ اگر یہ مملکت عضوی ہوتی ہے تو جن آرا سے حکمراں کی تائید ہوتی ہے یا تو وہ تمام قوم کی مروجہ رائے ہوتی ہے ورنہ کم از کم ان طبقات کی رائے ہوتی ہے جو معاملات عامہ میں دلچسپی لیتے ہیں۔

پس اس حد تک مطلق العنانی اور حکومت بذریعہ مجالس اپنی نہایت ہی جدید اور صاف وخالص شکل تک میں ایک دوسرے سے متفق ہیں تو پھر ان دونوں میں باہمی اختلاف کس امر میں ہے۔ یقیناً یہ اختلاف اس امر میں ہے کہ طریق جدید میں رائے عامہ کا اظہار۔ دتیقن مقررہ اور مسلمہ وسائل کے ذریعے سے ہوتا ہے، یعنی دار العوام کی کثرت رائے کے ذریعہ سے عوام کی پسندیدگی کا اظہار ہوتا اور اس کا اندازہ قایم کیا جاتا ہے اور اسی کثرت کے ذریعے سے عوام کی خواہشوں کا تغیر بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

اسے ایک فقرے میں یوں ظاہر کر سکتے ہیں کہ رائے عامہ کے پاس ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے سے وہ حکومت کی تکوین کرتی، اس کی تائید کرتی اور اسے تباہ کر دیتی ہے۔

اس ضابطہ کو عمومی طریق پر اس طرح بیان کر سکتے ہیں جس سے اس کا انطباق ہر قسم کی مملکتوں پر یکساں ہو سکے خواہ وہ مملکتیں غیر عضوی ہوں یا صرف جزو العضوی ہوں یا ایسی ہوں جن میں سیاسی ادراک کو محض جزوی

طور پر نمو حاصل ہوا ہو (بعد کو یہ ظاہر ہوگا کہ جزواً عضوی ہونے کا نکتہ بھی نہایت اہم ہے) اس اطلاق عام کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام مملکتوں میں ایک قوت مکوّن حکومت ہوتی ہے۔ یہ نام ہم اس جماعت اشخاص کو دیسکتے ہیں جو کم ہو یا زیادہ، اجنبی ہو یا ملکی، بے لوث ہو یا خود غرض، مگر حکومت کا انحصار اس کی تائید پر ہو بس تمام مملکتوں میں یکساں طور پر یہ ہو سکتا ہے کہ اس مکون حکومت طاقت کے پاس کوئی آلہ یا ذریعہ ہو جس کے وسیلہ سے وہ عادتاً عمل کرتی ہو یا اس کے پاس کوئی آلہ یا ذریعہ نہ ہو۔

اب فرض کرو کہ اس کے پاس ایسا کوئی آلہ یا ذریعہ نہیں ہے، جس زمانے میں وہ اپنے خیال کو بدل دے، اس زمانے میں کیا پیش آئے گا؟ جب وہ قوت جس پر مدتوں سے حکومت کا انحصار رہا ہے آئندہ اس کی تائید سے نارضامند ہو جائے، اور اس کے پاس اپنے اس تغیر خیال کے اظہار کا کوئی ذریعہ بھی نہ ہو تو اس صورت میں کیا واقع ہوگا؟ ظاہر ہے کہ مملکت زیر وزبر ہو جائے گی۔ غیر منظم قوت ہیولانی طور پر پھوٹ نکلے گی، جب اینٹنے لادوس تنگ کر حرکت کرتا ہے تو تمام سسلی ہل جاتی ہے۔ یہی وہ شے ہے جسے ہم انقلاب کہتے ہیں یہ اس حکومت گر قوت کا ہیولانی انتشار ہے جس کے لئے اظہار کا کوئی آلہ یا ذریعہ نہیں مہیا کیا گیا ہے۔

چنانچہ روسی حکومت کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ یہ ایک ایسی خودسر حکومت ہے جس کی درستی مزاج قتل سے ہوتی رہتی ہے سچ یہ ہے کہ تمام خودسر حکومتوں، کم از کم خالص خودسر حکومتوں کی درستی مزاج قتل ہی سے ہوتی ہے۔ اگر کسی قسم کی مجلس موجود ہوتی ہے تو حکومت گر قوت اس کے ذریعہ سے عمل کرتی اور اسے ترقی دے کر اپنے کام کا آلہ بنا لیتی ہے لیکن اگر اس قسم کی مجلس کا تخم یا ہیولائے اول مفقود ہو تو پھر کوئی چارۂ کار نہیں ہے اور پر استبدادانہ افعال لامحالہ واقع ہونگے۔ دو نمایاں مثالیں ایسی ہیں کہ دو ایسی وسیع سلطنتوں کے حکمران جنہیں خاص وجوہ سے کوئی مجلس ایسی نہیں تھی جو حکومت گر قوت کا آلہ بن سکے، وہ دونوں حکمران اتفاق سے بالکل مجنون

تھے۔ میری مراد کلیگولا اور زار پال سے ہے۔ ان دونوں صورتوں میں مقید قوت قتل کی شکل میں پھوٹ نکلی۔

انگلستان میں چار سو برس سے کوئی بادشاہ قتل نہیں ہوا ہے اور جب ایسا بادشاہ تخت انگلستان پر بیٹھا، جس کی عقل گاہ بگاہ زایل ہوجایا کرتی تھی تو انگریزوں نے اس کے ساتھ ہمدردی و دقعت کا برتاؤ کیا، چنانچہ وہ ساٹھ برس تک حکومت کرتا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقتدار مذکورہ کو یہاں ایک آلہ یا ذریعہ میسر ہے۔ ہم عادتاً یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ انگلستان میں انقلابات نہیں ہوتے۔ یہ بات سمجھ میں ضرور آتی ہے مگر یہ کہنا صحیح تر ہوگا کہ انگلستان میں ہمیشہ انقلاب ہی ہوتا رہتا ہے شاید ہی کوئی دوسری جگہ ایسی ہو جہاں حکومتوں کا زوال اس کثرت سے اور اس اچانک طور پر ہوتا ہو جس طرح انگلستان میں ہوتا ہے۔ ایسا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ انگریزی حکومت اکثر سلطنتوں کے مقابلہ میں اس قدر غیر معمولی طور پر مستحکم و پایدار معلوم ہوتی ہے۔ یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ انگلستان میں انقلاب نہیں ہوتے بلکہ یہ اس وجہ سے ہے کہ انگریز انقلاب کو ایک نظم کے اندر لے آئے ہیں اور اسے قانونی شکلیں عطا کردی ہیں چونکہ انگلستان میں ہمیشہ ہی انقلاب ہوتا رہتا ہے اور اس لئے ایک مفہوم میں وہاں کبھی انقلاب نہیں ہوتا۔

پس اب مطلق العنانی اور حکومت بذریعہ مجالس کے اختلاف باہمی کو ظاہر کرنے کے متعلق ہم ایک مخصوص طرز بیان پر آگئے۔ سر دست میں اسے محض ایک اشارے کے طور پر پیش کرتا ہوں کیونکہ اس سے قبل کہ ہم اسے قبول کرلیں ضرورت یہ ہوگی کہ اور بہت سی تحقیقات کیجائے اور دونوں طریقوں کی مختلف النوع تاریخی مثالوں پر اور زیادہ غور کیا جائے۔ چونکہ علم السیاست میں عملی حیثیت سے کوئی سوال اس سے زیادہ اہم اور تاریخی حیثیت سے کوئی سوال اس سے زیادہ نمایاں نہیں ہے، اس لئے میں پوری طرح سے اس کی چھان بین کرنے میں کسی طرح کی مشکلات یا صرف وقت سے دریغ نہ کرونگا لیکن مجھے مسرت ہے کہ موجودہ میقات کے اس آخری خطبے میں

میں نے تحقیقات کو اس حد تک پہنچا دیا ہے جس سے کم از کم ایک قابل قبول اصول موضوعہ اخذ کیا جا سکے۔

پس میں اس سلسلے کو حسب ذیل نظر با قی بیان کے ساتھ ختم کرتا ہوں اور جب ہم دوسری مرتبہ یکجا ہونگے تو یہی بیان ہمارے آغاز کار کا کام دے گا۔

۱ حکومت کا انحصار قوت یا تہدید پر ہوتا ہے۔

۲ اکثر صورتوں میں حکومت مجبور ہوتی ہے کہ کم و بیش شاہی شکل اختیار کرے فوج میں ایک سپہ سالار ہوتا ہے، عدالت میں ایک منصف ہوتا ہے یا چند منصف۔

۳ ایک شخص واحد کسی بڑی تعداد پر قوت یا تہدید کو عمل میں نہیں لا سکتا، بجز اس کے کہ اسے کم سے کم معتدبہ تعداد کی مدد حاصل ہو جائے۔

۴ اس قسم کی مدد یا رضا کارانہ دیجائے یا کسی مخصوص عقیدے کی وجہ سے اس سے بحث نہیں کہ جو لوگ یہ مدد دیتے ہیں انکی نیت اچھی ہے یا بری، خود غرضانہ ہے یا بے غرضانہ، ادنیٰ ہے یا اعلیٰ۔

۵ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر ایک قوم میں حکومت اور محکوم صرف یہی دو چیزیں نہ ہونا چاہئیں بلکہ حکومت جماعت موید حکومت، اور محکوم۔

۶ جو شئے حکومت کی تائید کرتی ہے وہ حکومت کی تکوین بھی کرتی ہے اور جب وہ اپنی تائید کو واپس لے لینا چاہتی ہے تو وہ حکومت کو برباد بھی کر دیتی ہے، اس لئے موید حکومت جماعت یا طاقت حکومت گر طاقت ہوتی ہے۔

۷ ہو سکتا ہے کہ یہ طاقت کسی خاص صورت میں بالکلیہ بغیر تنظیم کے ہو یا یہ کہ اس طاقت کی حیثیت سے وہ غیر منظم ہو۔ لوئی چاردہم کی تائید رائے عامہ سے ہوتی تھی جو تقریباً متفق علیہ مگر بالکلیہ غیر منتظم تھی، کرامول کی تائید اس کی فوج سے یعنی فی الواقع ایک منتظم جماعت کیطرف سے ہوتی تھی مگر اس جماعت کی تنظیم بالقصد اس کی تائید کی غرض سے نہیں ہوئی تھی۔

۸ ممکن ہے کہ دوسری صورتوں میں یہ حکومت گر طاقت منتظم ہو،

بالفاظ دیگر یہ کہ بعض مملکتوں میں نہ صرف ایک کوّن حکومت قوت ہوتی ہے بلکہ ایک حکومت گر آلہ یا ذریعۂ کار بھی ہوتا ہے۔

۹ اس قسم کی مملکتوں میں ایک مجلس ہوا کرتی ہے جو اکثر بظاہر حکمراں معلوم ہوتی ہے حقیقت میں یہ علی العموم حکومت نہیں کرتی بلکہ یہ حکومت کو بناتی، اس کی تائید کرتی یا اسے تباہ کرتی ہے۔

۱۰ اول الذکر قسم کی مملکتوں میں اس طرح کی کوئی مجلس نہیں ہوتی۔ حکومت بظاہر تن تنہا قائم ہوتی ہے اس لیئے وہ بہت سہولت کے ساتھ اپنی نسبت یہ ظاہر کرتی اور خود یہ گمان کرتی ہے کہ وہ کسی باطنی خلقی قوت، یا فوق الفطرت یا مشیت الٰہی کی مدد سے حکومت کرتی ہے مگر حقیقت میں اس کی تائید ایک زیریں طاقت سے ہوتی ہے اور چونکہ یہ طاقت منظم نہیں ہوتی اس لئے مرئی بھی نہیں ہوتی۔

۱۱ یہی دراصل مطلق العنانی ہے، دوسری قسم حکومت بذریعۂ مجلس ہے۔

سلسلۂ دوم

خطبۂ اوّل

جس وقت ہم مملکتوں کے اہم ترین امتیازات کی جانچ میں مشغول تھے تعطیلات نے ہمارے کام میں خلل ڈالدیا۔ اگر ہم خالصتہً نفس واقعہ تک محدود رہیں تو یہ فرق سیاسی بحث مباحثہ کے لئے کسی جمعیت کے موجود ہونے اور نہ ہونے کا فرق ہے مگر اس جمعیت سے جو قطعی امر انجام پاتا ہے جب ہم اس کے تعین کی کوشش کریں، اور اس طرح اس جمعیت کی موجودگی اور عدم موجودگی سے مملکت میں جو فرق پیدا ہوتا ہے اس کا اندازہ کرنا چاہیں تو پھر ہمیں مشکلات کا سامنا پیش آجاتا ہے۔ ہم نے یہ خیال کیا تھا کہ ان میں سے بعض مشکلات کو ہم نے رفع کر دیا ہے، اور آخری خطبہ میں، میں اس حد پر پہنچ گیا تھا کہ مملکت کی ان دونوں قسموں کے فرق کا ایک نظریاتی بیان تمھارے سامنے پیش کر دوں جو کم از کم قابل فہم و قابل تصور معلوم ہوتا تھا، اگر یہ ممکن ہے کہ کوئی نظریہ صاف اور واضح تو ہو مگر اس کی بنیاد قوی نہ ہو اور سیاسی جمعیت کے متعلق میں نے جو رائے اختیار کی تھی وہ اس رائے سے مختلف تھی جو رواجاً مقبول ہے۔ اگرچہ یہ نظریہ بعض نمایاں تاریخی واقعات سے مطابق معلوم ہوتا تھا مگر ممکن ہے کہ پہلی نظریں دوسرے تاریخی واقعات سے غیر مطابق معلوم ہوتا ہو۔ یہ نظریہ مختصراً پیش کر دیا گیا اور اس کی تشریح کر دی گئی مگر ابھی اسے ثابت کرنا باقی ہے۔

سب سے زیادہ ہمارے اس فن سیاست کا مقصد یہ ہے کہ وہ تاریخ کے لئے رہبر کا کام دے۔ اب دیکھو کہ یہ خاص سوال یعنی جمعیت کا قایم ہونا، اور اس کے اثر کا بڑھنا

یا لبعض نامسعود عہدوں میں اس کا زوال پذیر و معدوم ہو جانا یہ سوال تاریخ کے طلبا کے لیے تمام دوسرے سوالوں سے زیادہ انہماک و توجہ کا باعث ہے۔ یہ وہ باب ہے جس کا عنوان "آزادی" ہے اور اگرچہ ہم نے اس لفظ کو دوسرے مفہوم میں استعمال کرنا زیادہ باعث سہولت سمجھا ہے پھر بھی ہم یہ دیکھنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ جب سے سیاسی مباحث کا آغاز ہوا ہے یہی سوال سب سوالوں پر فایق رہا ہے۔ انگلستان کی تاریخ میں "منشور اعظم" کے زمانہ سے قانون اصلاح (۱۸۳۲ء) تک پارلیمنٹی حکومت کی نشو و نما مستقل مرکز بحث بنی رہی ہے۔ فرانس کی تاریخ کا بھی انقلاب کے قبل اور انقلاب کے بعد یہی حال رہا ہے اور ہمارے سامنے اس وقت جو مسئلہ ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ان اسباب کا پتا چلایا جائے جن کی وجہ سے مطلق العنانی کو پارلیمنٹوں پر تفوق حاصل ہو گیا تھا۔ قدیم تاریخ میں بادشاہوں کے ناپید ہو جانے اور شہری مملکتوں میں حکومت بذریعہ جمعیت کے قایم ہو جانے پر بحث ہوتی ہے اس سے بعد کے زمانہ میں ان واقعات ناشدنی پر بحث ہوتی ہے جو حکومت بذریعہ جمعیت کو پیش آئے اور جن کی وجہ سے شخصی حکومت بحال ہو گئی۔ اطالیہ کی ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ جس میں شہری مملکتوں کی تجدید ہوئی تھی اس میں بھی کچھ اسی قسم کے سلسلۂ واقعات نظر آتے ہیں یعنی ہر جگہ جمعیت اور اشخاص کے اسی قسم کے تقابل سے سابقہ پڑتا ہے اس لئے ہمارا مقصود یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس فرق کا حال بیان کریں جس سے تاریخ کی اس تمام فضا پر وسیع روشنی پڑے۔ مجھے مجبور ہو کر یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ پہلی نگاہ میں میرا نظریہ دور اسٹوئرٹ کے تنازعات سے زیادہ موافقت نہیں رکھتا اور تاریخ کے اس باب کو بہت حزم و احتیاط سے پڑھنے کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی یقینی ہے کہ کوئی اور باب اس سے زیادہ یادگار دیرا اہمیت نہیں ہے۔ پس ہم اس پر قناعت نہیں کر سکتے کہ تاریخ کے طلبہ کے لئے اس مبحث کو ایسی غیر مطمئن حالت میں چھوڑ دیں۔ جو تاریخی وقوعات اس درجہ غیر معمولی طور پر اہم ہوں اگر ہم ان کی خاطر سے نظریاتی توضیح و تشریح کو معلق کر کے کچھ وقت ان پر صرف کریں اور خاص طور پر یہ فکر کریں کہ جن واقعات کو تاریخ میں سب سے زیادہ نمود حاصل ہو ان پر نظریہ کی بیش از بیش روشنی پڑے تو یہ امر تضییع اوقات میں داخل نہیں ہوگا اس لئے

میں دو تین خطبے انگلستان کی سیاسی تاریخ کے لیے اس غرض سے وقف کردوں گا کہ پارلیمنٹی تحریک کے نظریاتی بیان میں جو دشواریاں لاحق ہیں وہ رفع ہو جائیں۔

میں اس نظریے کو مختصراً از سر نو بیان کر دینا چاہتا ہوں اولاً یہ کہ ہم تمام غیر عضوی مملکتوں کو علٰحدہ کر دیتے ہیں اور صرف ان مملکتوں پر توجہ کرتے ہیں جو حکومت کو بزور کارروائی کے ذریعہ سے نشو و نما دیتی ہیں اور جن میں حکومت خواہ کسی قسم کی ہو مگر وہ ضرورت عامہ کے مقصد کو پورا کرتی ہے اور اس کی تائید احساس عامہ سے ہوتی ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان مملکتوں میں بھی فرق زیر بحث موجود ہوتا ہے۔ یہ مملکتیں بھی دو اصناف میں منقسم ہو جاتی ہیں ایک وہ جن میں جمعیت ہوتی ہے اور دوسری وہ جن میں جمعیت نہیں ہوتی۔ اب ہمارا نظریہ یہ کہتا ہے کہ جمعیت ہی وہ عضو ہے جس کے ذریعہ سے حکومت کی تخلیق، تائید اور بربادی عمل میں آتی ہے اور یہ کہ اس قسم کا عضو ایک قسم کی مملکت میں نمایاں ہوتا ہے مگر بعض دوسری ایسی مملکتیں بھی ہیں جن میں اس عضو کا فقدان ہوتا ہے اور اس لیے ان مملکتوں میں حکومت کا انحصار کم و بیش محض تائید پر ہوتا ہے (کیونکہ تائید کا ہونا تو ہر حال میں ضروری ہے) اور اگر رائے عامہ کا مطالبہ تغیر حکومت کا ہوتا ہے تو یہ تغیر صرف براشتداد طور پر ہو سکتا ہے۔ اول الذکر صنف میں مباحثہ و اصلاح کی بہت آزادی ہوتی ہے مگر انقلاب سے بھی بہت زیادہ مامونیت رہتی ہے۔ ثانی الذکر صنف میں عدم تحرک اور انقلاب کے بین بین کوئی دوسری تدبیر نہیں ہوتی کیونکہ ان میں تعمیر جدید کے آلہ کی کمی ہوتی ہے۔ اب غور کرو تو یہی وہ نظریہ ہے جو پہلی نظر میں سترھویں صدی کے عظیم الشان تاریخی واقعات سے تطابق نہیں رکھتا۔ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ انگلستان کو متعدد جد و جہد کے بعد ۱۶۸۸ء کے انقلاب کے ذریعہ سے پارلیمنٹی حکومت کے قائم کرنے میں کامیابی ہوئی اور اس نے معقول حد تک دوسری نوع یعنی شخصی حکومت کو پس پشت ڈال دیا۔ تاہم اس انقلاب کے ذریعہ سے یقین کے ساتھ یہ متعین نہیں ہو گیا تھا کہ پارلیمنٹ کو حکومت کی تخلیق و بربادی کا اختیار حاصل ہے۔ زیادہ سے زیادہ جس امر کا دعوے کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ ایک حکمران جس نے اپنے افرادوں کے متعلق انتہائی درجہ کی بے پروائی کا اظہار کیا تھا، اسے برطرف

کر دیا جائے۔ صرف انتہائی حالت میں اور حفاظت ذات کی بناء پر پارلیمنٹ حکومت کو تباہ کر سکتی تھی اور اس پر بھی نئی حکومت وراثت کے حقیقۃ قانون کے عملدر آمد سے از خود وجود میں آگئی اور پارلیمنٹ نے اپنے اختیار کو کام میں لانے کی صرف اتنی ہمت دکھائی کہ نئے حکمران کے ساتھ اس کے شوہر کو بھی شریک کر دیا اس پر بھی اس کے قبل کہ پارلیمنٹ ایسے غیر اہم اختیار کو کام میں لا سکے۔ (جو حکومت کی تخلیق و بربادی کے اختیار سے بہت کچھ گھٹے ہوئے تھے) سلطنت نیخ وبن سے ہل گئی اور یہ کہا گیا کہ اس طرح عمل پیرا ہونے میں پارلیمنٹ نے اپنے معمولی فرض کو انجام نہیں دیا ہے بلکہ اس انتہائی طاقت کو کام میں لائی ہے جو مملکت کے تحفظ و بقا کے لئے اس کے ہاتھ میں محفوظ کر دی گئی تھی۔

پس بظاہر مجھے اس میں کسی قدر دشواری ہو گی کہ میں نے جس نظریئے کا خیال پیش کیا ہے اسے ان واقعات سے مطابقت دوں جو اس نظریئے سے اس قدر منافی معلوم ہوتے ہیں مگر یہ نظریہ ایک ایسی کلید ہے جو ہمارے موجودہ نظم کے قفل میں بہت ٹھیک بیٹھی ہے آج کل انگلستان میں ایک وزیر اعظم حکمرانی کرتا ہے اور اس کا انحصار پارلیمنٹی کثرت کی تائید پر ہوتا ہے جس کے جاتے رہنے سے اسے فوراً زوال ہو جاتا ہے چنانچہ غالباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ بدرجۂ اول دوسرے فرائض کے ساتھ حکومت کی تخلیق و بربادی کا فرض بھی پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ بہر نوع اگر اس نظریہ کا آج کل کے طرز حکومت پر اطلاق کیا جائے تو اس پر وہ اعتراضات وارد نہیں ہوتے جو اس وقت عائد ہوں گے اگر اس کا اطلاق سترھویں صدی کے انگریزی نظام سلطنت پر کیا جائے۔ ہمارا موجودہ نظم ایک شئے ہے اور ہمارا قدیم نظم بالکل دوسری شئے ہے پس میری تجویز یہ ہے کہ اس موجودہ خطبے میں میں صرف اول الذکر ہی کے متعلق گفتگو کروں اور ثانی الذکر کو کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھوں۔ آج کے دن سوال محض اتنا ہے کہ آیا اس نظریئے سے انگلستان کی اس موجودہ زمانہ کی پارلیمنٹ کا حال روشن ہوتا ہے یا نہیں۔

ہم یقیناً اس امر سے آگاہ ہیں کہ بہت سے لوگوں کا خیال اس سے بالکل مختلف ہے پارلیمنٹی کثرت آراء کی مسلسل تبدیلیوں کے موافق حکومتوں کے عروج و زوال

سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر عام طور پر یہ ظاہر نہیں کیا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ کے قیام کا منشا ہی یہ ہے کہ اس کے آتار چڑھاؤ کی وجہ سے حکومت میں تبدیلی کی جائے بلکہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ نتائج پارلیمنٹ کے دوسرے فرائض کی انجام دہی سے ضمناً پیدا ہو جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ دوسرے فرائض کیا ہیں؟ ہم سے کہا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ "جماعت مقننہ" ہے۔ بلیکسٹن ہمیں یہ بتائینگے کہ مملکت میں دو طاقتیں ہیں ایک مقننہ دوسری عاملہ وہ کہتے ہیں کہ عاملانہ اختیار بادشاہ کی ذات میں مرکوز ہے مگر بادشاہ اس کا نفاذ ذمہ دار وزراء کے ذریعہ سے کرتا ہے۔ دوسری طرف اختیار قانون سازی بادشاہ، امراء اور عوام میں مرکوز ہے جب کہ وہ متفقاً کام کر رہے ہوں۔ یہ تو رسمی بیان ہوا لیکن اگر ہم واقعات ہی کو پیش نظر رکھیں تو ہمیں یہ اضافہ کرنا چاہیئے کہ وضع قوانین میں بادشاہ کا حصہ خارج العمل ہو گیا ہے۔ اس لیئے کہ ولیم سوم کے عہد کی ایک خاص تاریخ کے بعد سے ہر دو ایوان نے جو قانون منظور کر دیا ہے اسے بلا مخالفت و تعویق شاہی منظوری حاصل ہو گئی ہے۔ پس تاج کے اس اختیار کے ساقط العمل ہو جانے اور ظاہراً اس کی تجدید کی کوئی توقع باقی نہ رہنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب جماعت مقننہ بادشاہ اور پارلیمنٹ پر نہیں بلکہ صرف پارلیمنٹ پر مشتمل ہے۔ پارلیمنٹ کے دو ایوان ہیں مگر میرا خیال ہے کہ موجودہ بحث میں دونوں ایوانوں پر علٰحدہ علٰحدہ غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس وقت معمولی حالت میں پارلیمنٹ کی توضیع قانون کے معنی عملاً دارالعوام کی توضیع قانون کے ہوتے ہیں۔ پس بنظر سادگی میں پارلیمنٹ کا ذکر اس طرح کرونگا گویا وہ تنہا دارالعوام ہی پر مشتمل تھی۔

اب اگر انگریزی دستور ایسا ہی ہے جیسا بیان کیا گیا ہے تو پھر ایک نہایت ہی ترغیب دہ تعمیم از خود سامنے آجاتی ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جماعت عاملہ میں شخصی عنصر حاوی ہے اور جمعیت تشریعی اختیار قانون سازی پر متصرف ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں اختیارات میں فرق کیا ہے؟ ہمیں ان کا تقابل باہمی بہت کچھ ویسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے نظریہ اور عمل یا اصول اور تفصیل کا فرق ہوتا ہے۔ ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ قانون سازی میں حکومت کے اصول متعین کیئے جاتے ہیں۔

اور اس کے بعد جماعت عاقلانہ ان اصول کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ اس وقت معاً ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ پہلے کام کے لیے جمعیت کی ضرورت ہوتی ہے مگر دوسرا کام افراد کے ہاتھوں زیادہ بہتر طریقہ پر انجام پا سکتا ہے۔ انجمنوں اور بزمگاہوں کے متعلق ہمارا تجربہ یہی ہے کہ اول ہمیں (مجلس انتظامی) یا جلسۂ عام سے واسطہ پڑتا ہے جو بہ طرز بالا قانون وضع کرتی ہے۔ اس کے بعد ہمیں مستعد کار، صحیح العمل پابند وقت معتمد سے واسطہ پڑتا ہے جو جلسہ کی خواہشوں کو عملی صورت میں لاتا ہے۔ اس طرز پر بحث کرنے سے ہم حکومت کے ایک ایسے نظریہ پر پہنچ جاتے ہیں جو بہت ہی خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس خیال کی طرف مائل ہو جاتے ہیں کہ فی الحقیقت حکومت ایک بہت ہی سادہ شے ہے، اور اس کے لیے صرف کسی قدر معاملہ فہمی اور دیانت داری کی حاجت ہے اور بس۔ ضرورت صرف اتنی ہے کہ شہری مملکت یا زمانہ جدید کی مملکت میں ان کے نمایندے یکجا ہو جائیں اور یہ سوچ لیں کہ وہ اپنے اوپر کسی عام تجویز کے مطابق حکومت چاہتے ہیں اور ان کی کثرت رائے جس وقت اس تجویز کا تصفیہ کر دے وہ اسی وقت منتشر ہو سکتے ہیں۔ البتہ انھیں یہ چاہیے کہ اپنے عقب میں چند افراد کو چھوڑتے جائیں جن کا کام یہ ہو کہ جو قرارداد ہو گئی ہے اسے وہ عمل میں لائیں اور جو ضروری جزئیات فروگزاشت ہو گئے ہوں انھیں اپنی معاملہ فہمی سے پورا کر لیں۔ پس اس طرح ایک ذی عقل متمدن حکومت میں قوانین کا نفاذ و انصرام افراد کو حوالہ کر دیا جائے گا اور ان قوانین کا تغیر ان میں سے ناقابل اطمینان قوانین کی ترمیم و تنسیخ اور دوسرے ذی مصلحت قوانین کی توضیع یہ سب کام ایک جمعیت کے ہاتھ میں ہوگا۔ لیکن اگر دیانت داری کی کمی ہو یا وحشیانہ طریق کار رائج ہو تو پھر یہ سادہ انتظام معرض خلل میں آ جائے گا۔ کوئی فرد واحد اپنی حیثیت، اپنی ہمہ وقت کی موجودگی برمحل، اپنی اعلیٰ علمیت، اپنی رسائی دولت ان سب فواید فایقہ سے کام لے کر، مجلس کے ارکان کو ڈرا دھمکا کر یا انھیں رشوتیں دے دے کر مجلس پر اپنا اقتدار جما لیتا ہے۔ کبھی وہ یہ منظور کرا لیتا ہے کہ باضابطہ کارروائی کے لیے اس مجلس کا اجتماع بالکلیہ مسدود ہو جائے۔ اس طرح حکومت کی دوسری طرز یعنی شخصی حکومت اندر ہی اندر قدم بڑھاتی جاتی ہے۔

یہ درحقیقت کوئی دوسری طرز نہیں ہے بلکہ اس ایک صحیح طرز کی تخریب ہے اور یہ تخریب اس طرح ہوتی ہے کہ دو اختیارات جنھیں علٰحدہ علٰحدہ قایم ہونا چاہیئے وہ دونوں خلط ملط کر دیئے گئے اور ایک نے مداخلت بیجا سے دوسرے کو دبالیا۔ بس مطلق العنانی یہی ہے کہ اختیار عاملانہ مداخلت بیجا سے تشریعی اختیار پر غالب ہو جائے۔

پس اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ کی اس توجیہ کے متعلق کیا اعتراض ہو سکتا ہے یا اس بیادی تقریب الحصول توجیہ کے ہوتے ہوئے کسی دور دست توجیہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت کیا ہے۔

میں تمھیں ایک تاریخی واقعہ بتاؤں گا، جس سے یہ اچھی طرح سے ذہن میں آجاتا ہے کہ اس نظریہ میں کچھ سقم ہے۔ گزشتہ صدی کے اواسط میں مونٹسکیو کی تائید سے اسے بہت شیوع حاصل ہو گیا تھا۔ اس سے تیس برس بعد وہ دور شروع ہوا جو دنیائے جدید کا دستوری عہد کہا جا سکتا ہے، امریکہ نے اپنے لئے ایک دستور مرتب کیا اور فرانس نے بعجلت تمام اس مثال کی تقلید کی۔ اس نے چودہ برس کے اندر اپنے لئے چار دساتیر مرتب کئے، یعنی پہلے دستوری بادشاہی، پھر بغیر صدر کے جمہوریت، بعدازاں مع رئیس یا قنصل اول کے جمہوریت، اور آخر میں شہنشاہی قایم کی۔ امریکہ اور فرانس دونوں ملکوں میں دستور کے بنانے والوں کے سامنے انگریزی دستور موجود تھا اور انھوں نے اس کے اہم خط و خال کا نقش اتارنے کی سعی کی تھی۔ انھوں نے یہ قرار دے لیا تھا کہ انگلستان میں بادشاہ کو عاملانہ اختیار حاصل ہے اور پارلیمنٹ کو تشریعی اختیار، نتیجہ کیا ہوا؟ دونوں ملکوں میں ان لوگوں نے نتیجہ یہ اخذ کر لیا کہ وزارت کو پارلیمنٹ میں نشست نہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ممالک متحدہ امریکہ میں وزرا اس وقت کانگرس میں نشست نہیں کرتے، اور فرانس میں جب پہلا دستور سلطنت ۱۷۹۱ء میں عمل میں آیا تو پارلیمنٹ جمعیت مقننہ کہلائی اور اس جمعیت میں وزرا کو نشست کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔

یہ فرانسیسی دستور یقیناً اپنی اسی تخصیص کی وجہ سے برباد ہوا۔ حکومت اور پارلیمنٹ میں کسی رابطہ کے نہ ہونے کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے

خون کے پیاسے ہوگئے اور ایک برس کے اندر اندر یہ نظم خون و خاک میں غلطاں و پیچاں نظر آیا۔ امریکہ میں اس قسم کی ناکامی نہیں ہوئی مگر اچھا یا برا ایک نظم ایسا پیدا کر لیا گیا جو انگریزی نظم کے مطابق نہیں ہے بلکہ وہ ایک بالکل ہی دوسرے طرز پر عمل کرتا ہے۔ اس سے زیادہ عیاں کوئی امر نہیں ہو سکتا کہ اگر انگریزی پارلیمنٹ سے وزرا کے اخراج کا اصول جاری کر دیا جائے تو انگریزی سیاسیات کی جو عمارت ہم دیکھ رہے ہیں وہ فوراً ہی بیٹھ جائے گی۔ پس کیا ہم یہ تصور اپنے ذہن میں قایم کر سکتے ہیں کہ دستور انگلستان کا کوئی ایسا نظریہ درست و بجا ہو سکتا ہے جس سے فرانسیسیوں اور امریکیوں دونوں کو یہ نظر آیا کہ باستدلال منطقی اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ انھوں نے کیوں یہ نتیجہ اخذ کیا۔ انھوں نے بطریق ذیل استدلال کیا۔ وزرا کا فرض انتظام کرنا ہے۔ ان کا اختیار عاملانہ ہے، اس لیے بالطبع وزرا کیلیے پارلیمنٹ میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر دونوں اختیارات کے خلط ملط کے خطرۂ عظیم کا اندیشہ ہے تو پھر یہ ابتری اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ شروع نہیں ہو سکتی کہ وزرا کو پارلیمنٹ میں نشست کی اجازت دیدی جائے۔

میرا خیال ہے کہ اس استدلال کی قوت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ باایں ہمہ یہ بالکل قطعی نہیں ہے کیونکہ ہم اس کا جواب بطرز ذیل دے سکتے ہیں۔ یقیناً وزرات کی حیثیت سے پارلیمنٹ میں وزرا کی کوئی جگہ نہیں ہے اور بلا خطر انھیں ایسی جگہ دی بھی نہیں جا سکتی مگر دوسری طرف عملاً یہ نہایت ہی سودمند ہے کہ پارلیمنٹ میں ان کی نشستیں ہوں اور یہ سودمندی اس خطرے سے کہیں زیادہ وزنی ہے۔ ان کو پارلیمنٹ میں جگہ دینے سے اصول کی قطعی خلاف ورزی بھی نہیں ہوتی کیونکہ محض اس وجہ سے کہ کوئی شخص وزیر ہے اور اسے عاملانہ اختیار حاصل ہے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ نمایندہ نہ ہو سکے اور اسے تشریعی اختیار نہ حاصل ہو خاصکر جب کہ انتخاب ثانی کے ذریعے سے اس کے انتخاب کنندگان کی رضامندی بھی لے لی جائے۔ پس انگریزی نظم کو اس طرح بہ ظاہر کیا جا سکتا ہے گویا اس کی بنا عاملانہ و تشریعی اختیار کے مناسب امتیاز پر ہے، مگر اس میں نہایت ہی خوشگوار عملی توازن بھی شامل ہے جس نے دونوں اختیارات کی ہم آہنگی کے زایل ہو جانے اور ان کے

ایک دوسرے سے متضاد ہو جانے کو روک دیا ہے۔

ہم ایک توضیح کے لئے پھر کسی بزمگاہ یا انجمن کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی انجمن میں کوئی تنخواہدار معتمد ہو جو مجلس انتظامی کا رکن نہ ہو اور مجلس میں اس کی رائے شامل نہ ہو مگر یہ معتمد نہ صرف اس مجلس کے جلسوں میں شامل ہوگا بلکہ مجلس کے جلسوں کے لئے اس کی ضرورت دیگر ارکان سے زیادہ سمجھی جائیگی اور اسے محال قرار دیا جائیگا کہ انجمن کے معاملات پر بحث کی جائے اور جو شخص ان معاملات سے لازماً سب سے بہتر طور پر واقف ہو اسی کی صلاح سے انکار کر دیا جائے۔ پس انگریزی نظم عملی معاملہ فہمی کے اسی اصول کو اختیار کرتا ہے۔ وہ پارلیمنٹی مباحث سے ایسے لوگوں کو خارج نہیں کرتا جنھیں ان کی سرکاری واقفیت کی بنا پر اس میں شریک ہونے کا بہترین حق ہے۔ یہ مقصد اس طرح حاصل نہیں ہوتا کہ ان لوگوں کو پارلیمنٹ میں موجود رہنے اور گفتگو کرنے کی اجازت دیدے، اور رائے کی اجازت نہ دے بلکہ انھیں یہ اجازت دی جاتی ہے کہ وہ قلمدان وزارت کو اپنے ہاتھ میں رکھیں اور ساتھ ہی ساتھ حلقہائے انتخاب کی نمایندگی بھی کریں۔

الغرض انگریزی طرز حکومت کو اسی طرح ظاہر کیا جا سکتا اور اسی طریق پر اس کی تائید ہو سکتی ہے مگر یہ تائید محض تہی باطن ہوگی اور یہ اظہار حالت حقیقت سے بالکل غیر مشابہ ہوگا۔ اس بیان کے مطابق وزرا کو وزارت کی حیثیت سے پارلیمنٹ سے کچھ سروکار نہیں ہوتا، وہ خوبی قسمت سے محض اتفاقاً وہاں جا پڑے ہیں۔ پارلیمنٹ گویا ایک طرح کی بزمگاہ ہے، جہاں وہ اپنا شام کا وقت گزارتے ہیں، وہ ایک دوسرے مجلس میں وہاں ہوتے ہیں، یعنی وزیر کی حیثیت سے وہاں نہیں ہوتے بلکہ لورڈز یا مذکوہین کے رکن کی حیثیت سے وہاں ہوتے ہیں۔ چونکہ اتفاق سے وہ وہاں موجود ہوتے ہیں اور ان معاملات کے مباحث کو سنتے ہیں جن کے متعلق انھیں بہت اچھی واقفیت ہوتی ہے، اس لئے وہ اپنی رائے دینے سے باز نہیں رہ سکتے اور یہ رائے بالطبع وقعت کے ساتھ سنی جاتی ہے مگر ان کا فیصلہ کسی جہت سے ان کا کام نہیں ہوتا یا بہتر طور پر یوں کہئے کہ ان کی ذمہ داری

چھ سو ستر رایوں میں سے صرف ایک رائے تک ہوتی ہے۔ کیا کسی امرِ واقعہ کا کوئی بیان اس سے زیادہ بیباکانہ یا غلط ہو سکتا ہے۔؟

ہم شکل ظاہری کی وجہ سے گمراہی میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وزیر اعظم یا وزیر خزانہ دار العوام میں محض کسی قصبہ یا ضلع کے نمایندہ ہونے کی حیثیت سے نشست کرتا ہے۔ عہدے کی بنا پر اسے کوئی جگہ (دار العوام میں) نہیں ملتی مگر اس سے زیادہ غیر صحیح کوئی امر نہیں ہو سکتا کہ وہ دار العوام میں وزیر کی حیثیت سے کام نہیں کرتا بلکہ صرف کسی خاص مقام کے رکن کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اس کے برخلاف حقیقت میں اول امیر خزانہ' بہ حیثیت وزیر کے دار العوام کی سرگردہی کرتا اور وزیر خزانہ اسی حیثیت میں موازنہ کی تحریک کرتا ہے۔ دار العوام میں نہ صرف ان کے عاملانہ فرض سے غفلت برتی جاتی بلکہ اسی پر تمام کارروائیوں کی بنا ہوتی ہے۔ وہی اس کل کھیل کا پلاٹ ہوتا ہے۔ درحقیقت مناسب الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ انگلستان کے پارلیمنٹی اجلاسوں کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ تشریعی مباحث کے سلسلے ہیں جن میں وزرا اپنے عہدے کے معلومات سے نفع پہنچاتے ہیں۔ اس قسم کی تشریح سے اصل خصوصیت نظر انداز ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اجلاس حکومت عاملانہ اور قوم کے نمایندوں کے درمیان ایک طرح کے مسلسل مستشارات ہیں۔

پس فرانس و امریکہ میں جن واضعان قوانین نے انگریزی دستور کے اجرا کی کوشش کی' ان سے محض یہی غلطی نہیں ہوئی کہ انھوں نے مباحث میں وزرا کی موجودگی و شرکت کی خوش اسلوبی کو نظر انداز کر دیا بلکہ وہ اسے بھی نظر انداز کر گئے کہ انگریزی نظم کا جوہر اصلیہ اسی میں مضمر ہے کہ پارلیمنٹ میں وزرا کی موجودگی و سرگرہی کسی دوسری حیثیت سے نہیں بلکہ وزارت ہی کی حیثیت سے ہوتی ہے اور پارلیمنٹ کا سارا کام ہی یہی ہے کہ ان سے اپنی کہے اور ان کی سنے۔ میرابو کی بڑی ناکامی کی یہی غلطی باعث ہوئی۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ جس طرح اس نے پٹ اکبر کو انگلستان کی سیاسیات پر مسلط دیکھا تھا' اسی طرح وہ خود انقلاب فرانس پر مسلط ہو جائے یعنی ایک ہی شخص کی ذات میں ایک ذی اثر عام پسند مقرر اور ایک جلیل القدر منظم ملکی کے اوصاف کو جمع کرے مگر اس قسم کا اجتماع اوصاف کسی ایسے وزیر کے لئے

ممکن ہی نہیں تھا جو مجلس سے خارج ہو اور اگر وہاں ہو بھی تو کسی دوسرے مجلس میں ہو۔ اس کے لیے ایسے وزیر کی ضرورت تھی جو بہ حیثیت وزیر کے ایوان کی سرگرمی کرتا ہو۔ لیکن اگر یہ سب کچھ تسلیم کر لیا جائے تو پھر میرے خیال میں اس کے بعد وہ تمام نظریہ جو پارلیمنٹ کو تشریعی امتیاز کا خاص عضو قرار دیتا ہے، خاک میں مل جائے گا کیونکہ اس ادارے کا اصلی اصول زیادہ تر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاملانہ اختیار کے ساتھ ایک طرح کی گفت وشنود یا مکالمت کے ذریعے سے معاملات طے کئے جائیں

یہ درست ہے کہ قانونی مسودے کے ذریعے سے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں منظور ہوئے بغیر کوئی نیا قانون نہیں بن سکتا (کیونکہ میں اس امر واقعہ پر زور نہیں دینا چاہتا کہ کسی قدر قانون ججوں کے فیصلے کے ذریعہ سے بھی وجود میں آجاتا ہے) یہ بھی صحیح ہے کہ وزرا اپنے اپنے محکموں میں عاملانہ اختیار سے کام لیتے ہیں۔ پارلیمنٹ کو تشریعی اختیار حاصل ہے اور وزرا کو عاملانہ۔ مگر یہ درست نہیں ہے کہ صحت کے ساتھ پارلیمنٹی اختیار کو تشریعی اور وزارتی اختیار کو عاملانہ کہا جائے کیونکہ پارلیمنٹ کا اختیار جس طرح تشریعی ہے اسی طرح عاملانہ بھی ہے اور وزارت کا اختیار جس طرح عاملانہ ہے اسی طرح تشریعی بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تشریعی اور عاملانہ کا فرق نظریاتی حیثیت سے شاید ناقابل اعتراض ہو مگر عملی حیثیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ یا وزارت اور پارلیمنٹ کے اختیار کے متعین کرنے میں اس پر بالکل لحاظ نہیں کیا گیا۔

پارلیمنٹ کا خاص کام کیا ہے؟ نظم ونسق ملک کے سالانہ اخراجات کے لیے روپیہ کا عطا کرنا۔ پارلیمنٹی میقات کو جس طریقے سے ترتیب دیا جاتا ہے اگر تم اس کو نظر غور سے دیکھو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ ہر ایک امر اسی خاص کام پر منحصر و متعلق کر دیا جاتا ہے اور یہ کام میقات بھر برابر ہوتا رہتا ہے۔ یہ اب بھی ممکن ہے کہ اس قدیم نظم کے اثرات کے کچھ نقش نظر آجائیں جس کے بموجب قانون سازی پارلیمنٹ کا کام ہونے کے بجائے ایک طرح کی مراعات تھی، جو عطا کردہ رقم کے بدل کے طور پر بادشاہ سے بزور حاصل کی جاتی تھی جیسا کہ میں نے کہا ہے اس

نشست کی کیفیت ایک کانفرنس یا جلسہ مکالمت کی ہے۔ اس کے فریقوں میں ایک جانب حکومت ہے اور دوسری جانب قوم کے نمایندے ہیں۔ یہ لوگ معاملت کے ان شرایط کو طے کرتے ہیں جن کے بموجب کچھ رقم منظور کی جائے گی اور بعض شکایات رفع کئے جائیں گے۔ شکایات کا رفع کرنا تو وضع قوانین ہے مگر رقم کی منظوری کو صحیح طور پر وضع قوانین نہیں کہہ سکتے۔ کم از کم یہ کہ اگر توضیع قانون کے لفظ کی ایسی مجہول تعریف کی جائے کہ حکومت کی ضرورت کے لئے ایک برس کے اندر کچھ رقم کی وصول کی اجازت بھی اس میں شامل ہو جائے تو پھر اس لفظ کے کوئی ممیز معنی باقی نہیں رہتے اور اس لئے کار عاملانہ سے اس کا کچھ امتیاز نہیں رہ جاتا۔ پس پارلیمنٹ کا اصل یا خاص کام ایک ایسا کام ہے جس کی تعریف صحیح طور پر مقننہ کے لفظ سے نہیں ہو سکتی۔ حق یہ ہے کہ یہاں ہمارے اوپر ایک طرح کی دوری بحث کا اثر پڑ رہا ہے ہم رقم کی منظوری کو وضع قانون کہنے کے عادی ہو گئے ہیں کیونکہ یہ کام اس جماعت کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے جسے ہم جماعت مقننہ کہتے ہیں لیکن اگر تم اب بھی یہ گمان کرتے ہو کہ قانون اور وضع قانون کی کوئی ایسی تعریف کرنا ممکن ہے جس میں محصولوں کی منظوری بھی شامل ہو تو پھر میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ اگر محصول کی منظوری کے لئے قانون سازی کی ضرورت ہوتی ہے تو کیا جنگ کے لئے وضع قانون کی ضرورت نہیں ہوتی؟ یقیناً یہ دعوے بالکل لغو ہے کہ اول الذکر فعل میں قانون کی نوعیت ثانی الذکر سے زیادہ ہے۔ لیکن جب جنگ ہونے والی ہوتی ہے تو انگلستان میں اس کا اعلان پارلیمنٹ کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ وزارت کی طرف سے ہوتا ہے۔ تم یہ ملحوظ رکھو گے کہ میں یہ سوال نہیں اٹھاتا کہ آیا یہ قرین عقل ہے یا خلاف عقل کہ چھوٹے سے چھوٹا محصول لگانے کے لئے تو پارلیمنٹی اختیار کی ضرورت پیش آئے اور بڑی سے بڑی جنگ کے اعلان کے لئے اس کی ضرورت نہ پڑے۔ میں صرف دریافت یہ کرتا ہوں کہ پارلیمنٹی اور وزارتی اختیار کا فرق کس امر میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم دو میں سے ایک بات کو تسلیم کرو گے یا تو محصولوں کی منظوری وضع قانون نہیں ہے مگر اس

صورت میں پارلیمنٹ کے قبضۂ قدرت میں جو خاص اختیار ہے وہ محض تشریعی نہ رہے گا یا تم یہ تسلیم کرو گے کہ جنگ کا اعلان بھی وضع قانون ہے مگر اس صورت میں وزارت کو بھی تشریعی اختیار حاصل ہو جائے گا۔

میں جس نظریئے پر بحث کر رہا ہوں، اس سے تو یہ ظاہر ہوگا کہ وزارت اور پارلیمنٹ ہر ایک کے اپنے اپنے حدود عمل ہیں جس میں ایک دوسرے کو دخل ہی کا حق نہیں ہے مگر ہمارے دستوری نظم کا عین جوہر اس کی نفی اور اس اصول میں مضمر ہے کہ وزارت اور پارلیمنٹ کے مقصد و شغل کے موضوعات قطعاً ایک ہی ہیں۔ نپولین جب کاری ضرب لگانے کی فکر میں تھا، اس وقت اس نے ایبے سی ایز کو جو یادگار زمانہ خط لکھا تھا اس سے یہ فرق نمایاں طور پر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اس خط میں اس نے لکھا تھا کہ مجھ سے زیادہ کوئی بھی اختیار قانون سازی کی آزادی کی وقعت نہیں کر سکتا مگر وضع قوانین کے معنی مالیات، نظم و نسق کی تنقید اور سو میں سے ننانوے وہ کام نہیں ہیں جن میں پارلیمنٹ مشغول رہا کرتی ہے جماعت مقننہ کو قانون بنانا چاہئے یعنی اسے چاہئے کہ اصول قانون کے حکمیاتی طریق پر اعلیٰ قوانین مدون کرے مگر اسے یہ بھی چاہئے کہ جس طرح وہ خود اپنی آزادی کی وقعت کی خواہاں ہے اسی طرح وہ جماعت عاملانہ کی آزادی کی وقعت کرے، اسے حکومت پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہ کرنا چاہئے اور چونکہ اس کے تشریعی اشتغال فی الاصل حکمیاتی نوعیت کے ہیں اس لئے اس کی بھی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اس کے مباحثوں کی اطلاعیں شائع کیوں کی جائیں

تم اس سے معاً یہ دیکھو گے کہ اس کے پیش نظر ایک ایسا طرز حکومت تھا جو انگلستان کے نظم سے بالکل ہی برعکس تھا۔ ہمارے یہاں حکومت جو کچھ کرتی ہے وہ ایوان کے مباحثے کے لئے ایک موضوع بن جاتا ہے حکومت کے کسی محکمے کی طرف سے کوئی ایسا تقرر نہیں کیا جا سکتا، کوئی ایسی گشتی شائع نہیں ہو سکتی جس پر پارلیمنٹ میں رد و قدح نہ ہو سکے اور جب کسی وزیر سے اس طرح جواب طلب ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں کرتا کہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو جائے اور جناب صدر سے یہ پوچھے کہ آیا یہ قواعد کے مطابق ہے کہ ایک مجلس مقننہ میں

ایسے معاملات کا ذکر یا ان پر بحث کی جائے جن کا تعلق صرف عاملانہ اختیار سے ہو سکتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ اپنا بیان اضطراب آمیز انکسار کے ساتھ پیش کرتا ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ زبردست حکومتیں اسی قسم کے اتفاقی واقعات سے خطرے میں پڑ جاتی ہیں، کہ ایک وزیر نے درشت جواب دیدیا یا دوسرے نے کسی تقریر میں کچھ بدنیتی دکھائی یا تیسرے نے کسی قانون سے پہلو تہی کی مختصر یہ کہ پارلیمنٹ کو ہر ایسے امر سے دلچسپی ہے جسے کوئی وزارت عمل میں لائی ہو۔ اس کے تصفیئے اس کی بلا مشت و اقتضائی فریادیں جن میں وضع قانون کے جھلک تک نہیں ہوتی وہ بھی اتنی ہی اہم اور دلچسپی اس بنا پر اس سے زیادہ ہوتی ہیں جتنی پارلیمنٹ کی عظیم الشان تشریعی کارگزاریاں اہم ہو سکتی ہیں۔

اب وزارت پر نظر کرو۔ کیا وہ خود کو عاملانہ اختیار کے نافذ کرنے تک محدود رکھتی ہے؟ درحقیقت اس قسم کے سوالات اٹھانے کے لئے مجھے معذرت کرنا چاہیے۔ کون نہیں جانتا کہ جب کوئی نئی حکومت برسر اقتدار آتی ہے تو کس قدر شور و شغب نہیں برپا ہوتا ہم کس طرح یہ پوچھنے لگتے ہیں کہ یہ لوگ کیا کریں گے ان کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟ آیا فی الواقع ان کی کوئی مخصوص حکمت عملی ہے؟ یا فی الواقع ان کی حکمت عملی یہ ہے کہ وہ بغیر کسی حکمت عملی کے پارلیمنٹ کے سامنے آئیں؟ پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکمت عملی کیا شئے ہے؟ عام طور پر اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ پارلیمنٹ میں ایک تعداد مسودات قانون کی پیش کی جائے۔ بالفاظ دگر اس کے معنی ہیں وضع قوانین۔ ہم جس شئے کو حکومت کی حکمت عملی کہتے ہیں وہ کسی نہج سے بھی عاملانہ اختیار کا نفاذ نہیں ہے۔ جو وزارت خود کو اس حد تک محدود رکھے اس کی نسبت کہا جائے گا کہ وہ ہیچ ہے۔ ذرا یہ تصور ذہن میں قایم کرو کہ اگر کوئی وزیر ایوان کی درخواستوں کے جواب میں یہ کہے کہ وہ اپنے دفتر میں محنت سے کام کرتا ہے اور وہ ایسا ہی کرتا رہے گا یہی اس کی حکمت عملی ہے اور بہ حیثیت وزیر کے اس کی کوئی دوسری حکمت عملی ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ بہ حیثیت وزیر کے اسے صرف عاملانہ اختیار حاصل ہے اپنی تشریعی حیثیت کے اعتبار سے اس پر ایوان کے دوسرے ارکان سے زیادہ ذمہ داری نہیں عاید ہوتی اور بہ حیثیت رکن کے اس کی حکمت عملی یہ ہوگی کہ وہ اپنے حلقہ

انتخاب کے اغراض ومقاصد کی نمایندگی وفاداری کے ساتھ کرتا رہے۔ سوچو کہ اس جواب کا کیا اثر ہوگا۔

حق یہ ہے کہ وزارت کو (اور وزارت ہی کی حیثیت سے) پارلیمنٹ سے بدرجہا زیادہ اعلیٰ مفہوم میں اور بدرجہا زیادہ وسیع حد تک تشریعی اختیار حاصل ہے۔ تقریباً تمام اہم وضع قوانین کی ابتدا کرنا اسی کو (ورزارت) کرنا اور اس کے جزئیات کو طے کرنا اسی کا کام ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کوئی قانون ایوان کی کثرت کی رضامندی کے سوا اور کسی طرح پر منظور نہیں ہوسکتا مگر یہ غور کرو کہ یہ اختیار کن شرایط کے تحت میں عمل میں آتا ہے۔ تقریباً تمام ہی اہم صورتوں میں مسودۂ قانون وزارت کی ذمہ داری پر پیش ہوتا ہے لیکن وزارت کو ایوان میں کثرت حاصل ہوتی ہے ورنہ وہ وزارت نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اہم صورت حالات میں کثرت کی رضامندی کا یقین پہلے ہی سے ہو جاتا ہے کم از کم یہ تو معلوم ہے کہ اگر پارلیمنٹ کسی اہم مسودۂ قانون کی منظوری سے انکار کردے تو اس فعل سے وہ وزارت کو عہدے سے خارج کردیگی کیونکہ وزارت کسی اہم مسودۂ قانون کو ہاتھ میں لینے سے خود اپنی ہستی کو اس کی کامیابی پر معلق کردیتی ہے۔ وہ یہ روا رکھیگی کہ اس مسودہ کے چھوٹے چھوٹے ضوابط کے طے کرتے میں ایوان کو کسی حد تک آزادی رہے۔ ایوان کو بعض امور کے تغیر کی اجازت ہوگی مگر مسودہ کے خاص حصص کے اعتبار سے ایوان اس مسودہ کو منظور کرے یا وزارت کے برطرف کر دینے کے لیے تیار ہوجائے مگر انگریزی نظم کی نوعیت ہی کی وجہ سے ایوان ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ کیونکہ وزارت کو برطرف کر دینے میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ مخالف فریق کو برسر اقتدار کردیا جائے لیکن اصول موضوعہ کے اعتبار سے اکثریت وزارت کی طرفدار اور اس کے مخالفوں کے خلاف ہوتی ہے۔ یہ لوگ پارلیمنٹ میں اسی غرض سے بھیجے جاتے ہیں کہ وہ وزرا کی موافقت اور ان کے مخالفوں کی مخالفت کریں۔ اب اگر اختیار قانون سازی کے معنی اس آزادانہ اختیار کے ہیں کہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ کونسا امر قانون ہو اور کونسا قانون نہ ہو تو پھر سوال یہ ہے کہ آیا وزرا کے ساتھ دارالعوام کا جو موجودہ

تعلق ہے اس کے اعتبار سے دارالعوام وزرا سے علیحدہ فی نفسہٖ کچھ زیادہ تشریعی اختیار رکھتا ہے، کسی خاص تجویز کے متعلق اسے بہت کم آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اس کا ایک اہم اختیار یہ ہے کہ جن وزرا سے وہ فی الجملہ اتفاق رکھتا ہے انھیں خارج کردے اور جن وزرا سے وہ فی الجملہ اختلاف رکھتا ہے انھیں مقرر کردے۔ اس قسم کے اختیار کو تشریعی اختیار کہنے کی بہ نسبت غالباً یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ اسے توضیع قوانین کا حق امتناع کہا جائے اور حق امتناع بھی ایسا جس کا استعمال عملاً آسان نہیں ہے۔

الغرض کہا یہ جاتا ہے کہ پارلیمنٹ کو تشریعی اختیار حاصل ہے اسے عاملانہ اختیار نہیں ہے لیکن حقیقت میں اسے توضیع قانون پر ایک طرح کا حق امتناع حاصل ہے جسے وہ بہت سی مشکلات کے تحت میں عمل میں لاتی ہے، اس کے سوا مسودات کے معمولی جزئیات کے تغیر کا بھی اسے حق ہے۔ مگر اس کے علاوہ جماعتِ عاملانہ کی کارروائیوں پر نظر ڈالنے اور ان پر تنقید کرنے کا بھی ایک بہت ہی زبردست حق اسے حاصل ہے۔ پھر یہ کہا جاتا ہے کہ وزارت کو عاملانہ اختیار حاصل ہے تشریعی اختیار نہیں حاصل ہے عاملانہ اختیار انھیں ضرور ہے مگر اس پر ایوان کی سخت رقیبانہ نگرانی قایم ہے وزارت کو اختیارِ قانون سازی ایوان سے بھی زیادہ حاصل ہے تاآنکہ خود ایوان کو اسی قدر تشریعی اختیار حاصل ہے جس قدر وزارت اس کے لئے جایز رکھے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح عمل کے متعلق وزارت ایوان سے خایف رہتی ہے اسی طرح وضع قانون کے متعلق ایوان مہلک حد تک وزارت سے خایف رہتا ہے۔

اس مغالطہ کا منبع یہ ہے کہ اصطلاحاً وزراء انگلستان ایوان کے ارکان بھی ہیں، اس سے ہم اس خیال کی طرف مایل ہو گئے ہیں کہ قانون سازی کے معاملہ میں وزرا وزارت کی حیثیت سے کام نہیں کرتے بلکہ ارکان کی حیثیت سے کام کرتے تھے مگر اس سے زیادہ بڑی کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔

پس اس تمام غور و فکر کا ماحصل یہ ظاہر کرنا ہے کہ پارلیمنٹ کی یہ مرغوب تصویر کہ وہ کسی انجمن کے مجلس عام کے مشابہ ہے اور وزیر اس کے تنخواہ دار معتمد کے

طور پر کام کرتا ہے جو ارکان کی ظاہر کردہ خواہشوں کو عمل میں لاتا ہے، یہ تصویر نہایت درجہ گمراہ کن ہے۔ وزیر پارلیمنٹ کا خادم نہیں ہے بلکہ اس کا بادشاہ ہے وہ دوسرے کی خواہشوں کو عمل میں نہیں لاتا بلکہ خود اپنی خواہشوں پر عمل کرتا ہے۔ اگر وزیر محض پارلیمنٹ کی خواہشوں کو ملحوظ رکھ کر اپنی رائے کو ترک کر دے تو یہ سلطنت کے خلاف گویا ایک طرح کی بڑی غداری ہوگی۔ اگر اسے کچھ ترک ہی کرنا ہے تو اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی رائے کو ترک نہ کرے بلکہ اپنے عہدے کو ترک کر دے۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ وزیر اگر پارلیمنٹ کا خادم نہیں بلکہ اس کا بادشاہ ہے تو پھر پارلیمنٹ کیا ہے؟ میں نے ابھی جو خیال ظاہر کیا ہے اس سے اس جواب کا اشارہ مل جائے گا۔ پارلیمنٹ بادشاہ گر ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے بادشاہ کو منصب سے محروم بھی کر سکتی ہے۔ پارلیمنٹ اس سے آمرانہ طور پر یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیا کرے بلکہ اس کے برعکس وہ پارلیمنٹ سے آمرانہ طور پر ایسا کہتا ہے مگر پارلیمنٹ اسے کنارہ کش ہو جانے کا حکم دے سکتی اور اس کے بجائے دوسرے وزیر کو مقرر کر سکتی ہے اور یہی اس کا خاص فرض ہے جیسا کہ میں زور دے چکا ہوں اس کا اختیار حقیقی ہونے کی بہ نسبت زیادہ تر برائے نام ہے مگر یہ درحقیقت صحیح ہے کہ وزیر صرف اس وجہ سے وزیر ہے کہ پارلیمنٹ کی یہی مرضی ہے اور پارلیمنٹ جب یہ چاہتی ہے کہ وہ وزیر نہ رہے تو وہ وزیر نہیں رہتا۔

انگلستان میں ہم لوگ پارلیمنٹ کی کارروائی پر جس طرح نظر لگائے رہتے ہیں یہ ایک بہت ہی خاص بات ہے بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ بہت ہی نادر بات ہے۔ اگر پارلیمنٹ نہ ہو تو ہم لوگوں کی آپس کی گفتگو کا موضوع کیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں سب صم بکم ہو جائیں گے، اس کی توجیہ اکثر اس قول سے کی جاتی ہے کہ انگریز سیاسی حیوان ہیں اور شاہ لوئی فلپ کہا کرتا تھا کہ اگر انگریزوں کی طرح فرانسیسی بھی کھانے کے بعد سیاسیات پر گفتگو کرنے کی عادت اختیار کر لیتے تو انھیں اتنے انقلابات سے سابقہ نہ پڑتا مگر واقعی سبب دوسرا ہے مسٹر ووڈرو ولسن

نے دستور امریکہ کے متعلق اپنی دلچسپ کتاب "کانگریسی سیاسیات" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ امریکہ میں کوئی شخص بھی موتمر کے مباحث کو نہیں پڑھتا۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکہ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو انگلستان کے مباحث کو پڑھتے ہیں مگر کانگریس کے مباحث پڑھنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ یقینی ہے کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اہل امریکہ کا سیاسی ذوق انگریزوں سے کم ہے بلکہ اس کی وجہ بالیقین یہ ہے کہ کانگریس صرف ایک جمعیت مقننہ ہے ایسی جمعیت نہیں ہے جو حکومت کو بناتی اور بگاڑتی ہو۔ یہی واقعہ ہے۔ امریکہ میں رئیس جمہوریہ عام انتخاب سے چار برس کے لئے منتخب ہوتا ہے۔ وہ اپنی پسند سے اپنے وزیر مقرر کرتا ہے جنھیں کانگریس میں کوئی جگہ نہیں ملتی اور عام قاعدے کے طور پر ان وزرا کا انحصار موتمر کی رائے پر نہیں ہوتا۔ لیکن جب ایسا ہے تو پھر انگریزی پارلیمنٹ کے اجلاس کی طرح کانگریس کے اجلاس کی نوعیت کسی دلچسپ کھیل کی نہیں ہوتی۔ اور اس میں کوئی اہم امر طے نہیں پاتا۔

پس اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہم خود پارلیمنٹ کی اہمیت کس امر میں محسوس کرتے ہیں۔ ہم کیوں اس کے مباحث کو پڑھتے ہیں؟ محض یہ دیکھنے کے لئے کہ حکومت کا قیام اغلب ہے یا اس کا اخراج۔ ہم پارلیمنٹ کے اجلاس پر بالکل ویسی ہی دلچسپی سے نظر لگائے رہتے ہیں جیسی کشتیوں کی دوڑ پر۔ اور تقسیم آرا کی متسلسل فہرستوں سے ہم پر یہ ظاہر ہوتا رہتا ہے کہ آیا فریق مخالف حکومت پر غلبہ حاصل کر رہا ہے یا نہیں؛ اس میں شک نہیں کہ گاہ بگاہ ہمیں کسی خاص مسودۂ قانون کے ہست و نیست سے بھی دلچسپی پیدا ہو جائے مگر جو امر غیر متزلزل اشتیاق کے ساتھ ساری قوم کی توجہ کو پارلیمنٹ کی کارروائیوں کی طرف منعطف کر دیتا ہے وہ یہ ہے کہ دستور انگلستان کے موافق کوئی اہم مسودۂ قانون اپنے ساتھ حکومت کو بھی غرق کئے بغیر ناکامیاب نہیں ہو سکتا۔

پس مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے جو نظریہ تجویز کیا ہے اس کی تائید ہمارے موجود الوقت نظریہ سے پوری طرح ہوتی ہے اور نیز یہ کہ موسٹیکوئنگ کے وقت میں اس کے مخالف نظریہ کا غلط ہونا واضح ہو سکتا تھا لیکن میں یہ دعوے

نہیں کرتا کہ مونٹسکیو کے وقت میں پارلیمنٹ کی حکمراں گری کے اختیار کا پوری طرح دیکھ لینا ممکن تھا۔ موجودہ نظم اس وقت ہنوز ہیولانی حالت میں تھا۔ گوڈولفن اور والپول ایسے حکمران نہیں تھے جیسے موجودہ وزرا ہیں، نہ وہ اپنے منصب کے لیے اس حد تک پارلیمنٹ پر انحصار رکھتے تھے۔ جن لوگوں نے اٹھارھویں صدی کے اختتام کے قریب ممالک متحدۂ امریکہ کا دستور مملکت ترتیب دیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس سے آگاہ نہ تھے کہ بادشاہ کا اختیار کس قدر زوال پذیر ہو گیا ہے مثلاً یہ کہ اس کا حق امحا خود محو ہو گیا ہے، نہ وہ اس سے آگاہ تھے کہ وزیر کس حد تک بادشاہ کی جگہ لیتا جاتا تھا۔

دستور انگلستان کی اٹھارھویں صدی اور نیز سترھویں صدی کی ہیئتیں علحدہ بحث کے لیے محفوظ رہنا چاہئیں

خطبۂ دوم

ہفتۂ گزشتہ میں میں نے ایک امتیاز پیدا کیا تھا جو تمھیں کسی قدر باریک معلوم ہوا ہوگا، میں نے کہا تھا کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ حکمرانی کرتی اور وزیر صرف پارلیمنٹ کا خادم ہوتا ہے۔ ایسا مطلق نہیں ہے، وزیر حکمرانی کرتا اور وہ پارلیمنٹ اور قوم دونوں کا حکمراں ہوتا ہے نہ کہ خادم، مگر پارلیمنٹ ہی اسے حکمراں بناتی اور وہی اسے معزول بھی کر سکتی ہے۔ شاید تم کہوگے کہ یہ امتیاز بغیر کسی بین فرق کے ہے، اگر پارلیمنٹ اپنی مرضی سے کسی وزیر کو برطرف کر سکتی ہے تو اس سے عیاں ہے کہ وہ برطرفی کی دھمکی سے وزیر کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتی ہے، یعنی یہ ظاہر ہے کہ وزیر اپنے عہدے کو قایم رکھنے کی غرض سے پارلیمنٹ کی مرضی کو عمل میں لائے گا۔

لیکن ایک نمایندے اور ایک وکیل کے درمیان دنیا بھر کا فرق اسی میں مضمر ہے۔ اس فرق کو ہم پارلیمنٹ کے ارکان کے معاملہ میں تسلیم کرتے ہیں۔ ارکان پارلیمنٹ میں اس غرض سے بھیجے جاتے ہیں کہ وہ اپنے انتخاب کرنے والوں کی رائے کا اظہار کریں، لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ خود اپنی رائے کا اظہار نہ کریں؟ ہرگز نہیں۔ وہ حلقۂ انتخاب کی نمایندگی اس طور پر نہیں کرتے کہ اس کی رائے کے لیے اپنی رائے سے دست بردار ہو جائیں بلکہ اس وجہ سے ایسا کرتے ہیں کہ ان کی خود بھی وہی رائے ہوتی ہے لہذا ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر کسی نمایندہ

کی ایمانداری کے ساتھ کوئی ایسی رائے ہو جو اس کے انتخاب کنندوں کی رائے سے مختلف ہو تو اس کا اپنی رکنیت سے کنارہ کش ہو جانا مناسب ہو یا نہ ہو مگر اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کو برطرف کر کے غلامانہ طور پر اپنے انتخاب کنندوں کی رائے کو اختیار کرلے۔ بالفاظ دیگر محض نمایندہ ہونے سے وہ کسی معنی میں انتخاب کنندگان کا غلام نہیں ہو جاتا اور ہر صورت میں اس کا یہ فرض ہے کہ وہ خود جو کچھ درست سمجھتا ہو اس پر عمل کرے نہ کہ اس پر جو اس کے انتخاب کنندے درست سمجھتے ہوں۔

یہ امر وزیر کے بارے میں بدرجہا زیادہ صحیح ہے۔ اس کی رائے وہی ہوتی ہے جو پارلیمنٹ کی رائے ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ وزیر ہوتا ہے۔ گر اس نے ان کی رائے کو قرض نہیں لیا ہے۔ پارلیمنٹ کے ارکان اس کا انتخاب اس وجہ سے نہیں کرتے ہیں کہ وہ بہت مسکین ہوتا ہے نہ اس وجہ سے کہ اس کی خود کوئی رائے نہیں ہوتی اور وہ بہت آمادگی کے ساتھ ہر ایک اس رائے سے اتفاق کرتا ہے جو ارکان میں رائج ہو بلکہ وہ اس کا انتخاب اس سے بالکل ہی مختلف وجہ سے کرتے ہیں یعنی اس وجہ سے کہ اس کے عزایم غیر معمولی طور پر مستحکم ہوتے یا کم از کم یہ کہ ایسے معلوم ہوتے ہیں نیز اس وجہ سے کہ وہ اسے ایسا سمجھتے ہیں جس میں اس شخص کی سی مستعدی و قوت ہوگی جسے اپنے کام سے دلبستگی ہو۔ اسے ہمیشہ نظم وزارت کی تخریب سمجھی جاتی ہے کہ وزیر ایوان کی خوشنودی مزاج کا متوقع رہے۔ وہ اپنے تجاویز کو واپس لیلے یا انھیں ترمیم کر کے پیش کرے۔ اور ایوان سے یہ کہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ کام غلط ہے پھر اسے کیوں قبول کیجئے۔ میں ہمہ تن بندۂ فرماں ہوں آپ جس طرح چاہیں اسے قبول کریں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے تخریب کیوں کہا جائے یا اسے تخریب کیوں نہ کہا جائے۔ اگر ایوان فرمانروا اور وزیر صرف اس کا معتمد ہوتا تو یہ روش کسی انجمن کے معتمد کی روش کی طرح معقول و طبعی ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وزیر کا انتخاب ایوان کی طرف سے ہوتا ہے مگر اس کا انتخاب حکمرانی کے لئے ہوتا ہے خدمتگزاری کے لئے نہیں ہوتا۔ شاید ہماری اس غلط رائے پر خود لفظ وزیر کا بھی کچھ شائبہ سا آ گیا ہے کیونکہ وزیر کے معنی خادم کے ہیں۔ مگر مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ وزیر

پارلیمنٹ کا وزیر نہیں ہوتا بلکہ بادشاہ کا وزیر ہوتا ہے۔ پس فی الجملہ انگریزی وزیر ایک حکمراں ہے اگر اس کا انحصار ایسے دوسرے اشخاص پر ہے جو اسے بناتے اور بگاڑتے ہیں تو جیسا کہ میں ایک سابق خطبہ میں ظاہر کر چکا ہوں، یہ حال ہر ایک حکمراں کا ہے۔ اس کے منصب سے متعلق جو امر خاص طور پر عجیب ہے وہ صرف اس کل کے پرزوں کی عجیب و غریب نزاکت ہے جس کے ذریعہ سے حکومت ساز قوت اپنے حسب مرضی وبلا تاخیر اس اختیار کو عمل میں لاسکتی ہے۔

یہ قوت اگرچہ تمام ہی مملکتوں میں ہوا کرتی ہے کیونکہ اس کا ہونا لازمی ہے مگر جیسا کہ میں ظاہر کر چکا ہوں، مملکتوں کی بہت بڑی تعداد میں اس کے لئے کوئی آلۂ کار نہیں ہوتا اس لئے یہ عمل میں اسی وقت آتی ہے جب بہت بڑا دباؤ پڑتا ہے اور پھر اس وقت یہ نہایت ہی ہیجانی زیادتی کے ساتھ عمل کرتی ہے لیکن میں نے اس نظریہ کو شرح وبسط سے بیان کیا ہے کہ جہاں کہیں ہم کسی جمعیت کو معاملاتِ عامہ میں پیش پیش دیکھیں وہاں ہمیں اس جمعیت کو حکومت ساز طاقت کا آلہ خیال کرنا چاہئے اور اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ نظریہ ایک نمایاں مثال کی کافی توجیہ پیش کرتا ہے۔ اس مثال میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس عضو کا ایک خاص طریقِ عمل ہے یعنی حکمراں اگر کسی جمعیت میں کثرتِ رائے حاصل کرنے میں ناکام رہے تو وہ معزول کر دیا جاتا ہے لیکن چونکہ یہ نظم بہت ہی مخصوص ہے (یعنی یہ صرف انگلستان اور ان بعض یورپی سلطنتوں میں پایا جاتا ہے، جنھوں نے حال میں انگلستان سے نقل کر کے اسے اختیار کر لیا ہے) اور سیاسی مجلس کسی نہج سے غیر معمولی شے نہیں ہے، تو اب ہم یہ سوال کریں گے کہ حکومت ساز عضو اپنے فرض کو بالعموم کس طریق پر ادا کرتا ہے سر دست ایسی مشکل صورتوں کو جن کے لئے خاص تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہے نظر انداز کر کے، مجھے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرنا چاہئے کہ عمل کا کوئی ایسا سادہ طریقہ بتاؤں جو معمولی دستوری یا جمہوری مملکت میں اس نازک کل کا کام دیتا ہے اور اس طرح یہ نظریہ بہت وسعت کے ساتھ قابلِ اطلاق ہو جاتا ہے میرا خیال ہے کہ میں بسہولت ایسا کر سکتا ہوں۔

انگریزی دستور میں بہت سے غلافوں اور حیران کن مغالطہ آمیز ناموں کے اندر اصلیت کا پتہ چلانا پڑتا ہے۔ حکمراں حکمراں نہیں کہلاتا، وہ تو وزیر ہوتا ہے، ایسے نظم و نسق کے مرتب کرنے کے لئے ملکۂ معظمہ کا حکم ملتا ہے۔ خدانخواستہ حکمراں کا تقرر پارلیمنٹ کے طرف سے نہیں ہوتا، حکمران تو موروثی حق کی رو سے جانشین ہوتا ہے۔ اس سے (بڑھ کر یہ) پارلیمنٹ اسے معزول نہیں کر سکتی کیونکہ در حقیقت دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اسے معزول کر سکے۔ جب ہم بجہد تمام ان ادعات کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور بعزم بالجزم اپنی نگاہ کو واقعات پر جما دیتے ہیں اس وقت ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ جو شخص وزیر یعنی خادم کہلاتا ہے زیادہ مناسب طور پر اس کو حاکم یا حکمراں کہنا چاہیئے اور یہ کہ اسماً نہیں مگر اصلاً اس کا تقرر اور نیز اس کا عزل پارلیمنٹ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ [1]

[1] تمھیں چاہیئے کہ آغاز اس طرح کرو کہ جدید انگلستان میں جو دو مہتم بالشان ارتقائت ہوئے ہیں ان میں امتیاز قایم کر دو۔ ایک ارتقا وہ ہے جس نے نمایندہ جمعیت کو اس قدر اختیار دیدیا ہے اور دوسرا ارتقا وہ ہے جس نے وزیر کو اس قدر اختیار دیدیا ہے تمھیں یہ بھی خیال کرنا چاہیئے کہ وہ اس اختیار کو فریقانہ نظم کے قواعد کے بموجب عمل میں لاتا ہے یہ امور بالکلیہ ممیز ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ پارلیمنٹ اعلیٰ اختیار حاصل کر لیتی اور پھر بھی وزیر تاجدار کی جگہ نہ حاصل کرتا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ امور وقوع میں آتے مگر وہ سخت فریقانہ نظم نہ قایم ہوتا جسے ہم دیکھتے ہیں اور جس کے تحت میں پارلیمنٹ کے سرگروہ اور وزارتی محکموں کے اعلیٰ عہدہ دار وہ اشخاص ہوتے ہیں۔ جو اس زمانے کے اہم مسائل کے متعلق متفق الرائے ہوا کرتے ہیں۔

ہمارے لئے یہ تینوں امور یکجا ہیں اور انھیں کا مجموعہ کل وہ ہے جس سے اس زمانہ کا انگریزی دستور سلطنت بنتا ہے (۱) تمام مسایل کا فیصلہ ایک نمایندہ جمعیت کی رائے سے ہونا۔ (۲) وزارتی کابینہ کے غیر محدود اختیارات اور اس کے ساتھ شاہی کا برائے نام قیام (۳) فریقانہ نظم۔ یہ تمام امور براعظم یورپ کی بعض سلطنتوں مثلاً بلجیم اور اطالیہ میں بھی اب ظہور پذیر ہو رہے ہیں فرق اتنا ہے کہ وہاں فریقانہ نظم نے اس انضباط کے ساتھ

اب دیکھو کہ دوسری مملکتوں میں ایک سیدھی روش اختیار کی گئی ہے۔ حکمراں واقعی جمعیت کی طرف سے منتخب ہوئے ہیں اور یہی ان کے تقرر کا طریقہ ہے۔ لیکن معزولی وزرا زیادہ مشکل کام ہے۔ اس شخص پر کس طرح سے مقدمہ چلایا جائے جو بر وقت مملکت کے تمام اختیارات پر قابض ہو؟ اس مشکل کا تدارک ایک سادی تدبیر سے کیا گیا ہے یعنی حاکم کا تقرر ایک بہت ہی قلیل میعاد کے لئے کیا جائے۔ قوم حکمراں کی بدروش بلکہ انتہائی بدروش کی متحمل ہو سکتی ہے بشرطیکہ اسے یہ اعتماد ہو کہ اس کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی میں جب امریکی آبادکاروں نے یہ کوشش کی کہ انگریزی نظام سلطنت کے اصل حقیقت کی نقل کریں مگر جن قانونی مفروضات میں وہ ملبوس ہے اسے ترک کر دیں تو انھوں نے ایک رئیس جمہوریہ کا عہدہ قایم کیا جس کا تقرر عام انتخاب سے ہونا قرار پایا۔ ہو سکتا تھا کہ اس انتخاب کے فرض کو وہ موتمر کے تفویض کر دیتے اور بعضوں کا خیال ہے کہ انھیں ایسا کرنا چاہیئے تھا۔ مگر انھوں نے یہ سوچا کہ وہ شخص کل قوم کا حکمران ہوگا اور اس کا مدار عام مرضی پر ہوگا اس لئے کل قوم کو اس کے انتخاب میں حصہ لینا چاہیئے۔ یہاں تک تو حکمران کے تقرر کی نسبت ہوا۔ اس کی معزولی کے لئے انھوں نے مواخذہ کا ایک طریقہ قایم کیا مگر چونکہ انھوں نے اسے کافی نہ سمجھا اس لئے انھوں نے یہ بھی فیصلہ کر دیا کہ رئیس جمہوریہ اپنے عہدے پر صرف چار برس کے لئے رہے تاکہ ممالک متحدۂ امریکہ کے شہریوں کو یہ یقین رہے کہ ان کے وقایع میں بدترین عہد حکومت انگلستان کے جیمز دوم کے عہد سے زاید طویل نہیں ہوگا۔

ایتھنز اور روما کی جمہوریتوں میں جس شئے کو آزادی کہا جاتا ہے اس کی تاریخ سے پوری طرح اس نظم کے ارتقا کا اظہار ہوتا ہے۔ موروثی بادشاہی

(بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ) عمل نہیں کیا ہے۔ دو عظیم الشان رقیبانہ فریق جو انگریزوں میں عام طور پر ایک دوسرے کے مقابل رہا کرتے ہیں ان کے بجائے وہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔“

سے ابتدا کرکے ہم قدم بقدم اس نظم کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے جس کے بموجب عمومی جمعیتیں ایک ایک برس کے لئے حکمراں کو منتخب کرنے لگیں۔ ایتھنز اور روما دونوں کی دستوری تاریخ میں یہ امر مشترک ہے مگر ایتھنز کے دستور میں کچھ خصوصیات ایسے ہیں جن کے لئے خاص تشریح کی ضرورت ہے۔ میں ایک ساعت کے لئے رومانی دستور سے بحث کرتا ہوں تاکہ یہ ظاہر کردوں کہ ہمارا نظریہ کیسے سہل اور فطری طور پر اس دستور پر عاید ہوسکتا ہے۔

رومانی جمعیتیں "کومی تیہ" comitia یا مجالس کہلاتی تھیں۔ وہ تعداد میں تین تھیں مگر تاریخی دور میں ان میں سے ایک بیکار ہوچکی تھی۔ دوسری دو میں کچھ فرق ــــــ تھے جن پر بحث کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ ان مجلسوں کے پہلو بہ پہلو ایک اور مجلس تھی جو نہ عمومی تھی نہ نیابتی بلکہ قدیم انگریزی مجلس عقلا یا جدید دارالامرا کے مثل تھی۔ اسے مجلس "سینیات" کہتے تھے۔ لفظ "قوت" کے تلطی معنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیاسی قوت۔ عمومی جمعیتوں کے اندر محدود تھی سینات کے ہاتھ میں جو کچھ تھا لاطینی میں (auctoritus) کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے یعنی وہ ایک اعلیٰ قسم کا اثر تھا جسے بعض مباحث کے متعلق بمنزلہ قانون کے سمجھا جاتا تھا۔ جب ہم ان مجلسوں کا مقابلہ انگریزی پارلیمنٹ سے کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا خاص فرض وہ تھا جسے نہ تو انگلستان کی پارلیمنٹ انجام دیتی ہے نہ انتخاب کنندگان وہ فرض حکام کا منتخب کرنا تھا۔ رومانی اور انگریزی دونوں سیاسیات میں عمومی انتخاب ایک بہت ہی نمایاں مبحث ہے مگر انتخاب سے جو عہدے پر کئے جاتے ہیں وہ بالکل مختلف ہیں۔ انگلستان میں پارلیمنٹ کے ارکان کا انتخاب کیا جاتا ہے مگر روما میں (جیسا کہ میں گزشتہ خطبات میں کہہ چکا ہوں) ہر شہری پارلیمنٹ کا رکن کہا جاسکتا تھا اور سیاسیات مطلقاً انتخابی نہیں تھی۔ روما میں انتخابات ان عہدوں کے لئے ہوتے تھے جنھیں ہم عاملانہ کہتے ہیں۔ ان عہدوں کو مختصراً وزارت کہنا چاہئے۔ اگرچہ رومانی انھیں بہت صحیح طور پر عہدہ ہائے حکومت کہتے تھے اور انھیں انتخابات کا کرنا جمعیتوں کا خاص کام تھا۔

پس انگلستان کی بہ نسبت روما میں جمعیت بہت زیادہ صریحی طور پر حکومت ساز قوت تھی۔ وضع قوانین میں اس کا حصہ زیادہ تر ویسا ہی تھا جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انگلستان میں پارلیمنٹ کا ہے۔ جس طرح انگلستان میں وضع قوانین کا عملی و تعمیری حصہ وزارت سے تعلق رکھتا ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ روما میں اس کا تعلق حکام سے تھا۔ دونوں مملکتوں میں جمعیت کے پاس صرف عاطلانہ کام یعنی حق توثیق رہجاتا ہے لیکن حکومت کی تکوین جو یہاں انگلستان میں جمعیت کا بالمعنی فرض ہے وہاں وہ جمعیت کا مسلمہ فرض تھا تا آنکہ لفظ کومی تیہ (comitia) جو روما کی مجالس کا نام تھا وہ انتخاب کے لئے لاطینی کا مسلمہ لفظ ہے۔

پس جمعیت حکومت کو بناتی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا وہ حکومت کو بگاڑتی اور تباہ بھی کرتی تھی یا نہیں۔؟ جواب یہ ہے کہ نہیں لیکن رومانی تاریخ کے اس دور میں جس کا ہمیں پوری طرح علم ہے حکام کا انتخاب صرف ایک برس کے لئے ہوتا تھا۔ قناصل یا معتمدین مملکت پریٹر یا عادل ایڈائل یا مامورین امور عامہ و کوتوالی کویسٹور یا خزانہ دار ٹریبون یا محافظین پیپ یعنی سینسر کے سوا اور تمام حکام ان سب کی میعاد سالانہ ہوا کرتی تھی (اور سینسر کا عہدہ اکثر معدوم رہا کرتا تھا) لہذا ان لوگوں کی نقصان رسانی کی قوت قطعی طور پر محدود تھی۔ اس میں شک نہیں ان کی وسعت اختیار نہایت ہی فراخ تھی۔ حاکم کے فرمان سے بہت سے امور کا فیصلہ اس طرح ہو جاتا تھا کہ اس کا مرافعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً یہ کہ قانونی کارروائی کا تمام نظم قطعاً پریٹر کی مرضی پر منحصر معلوم ہوتا ہے۔

پریٹر اپنی میعاد کے آغاز میں ایک فرمان شایع کرتا تھا اور ممکن تھا کہ یہ فرمان تمام پیشیر رسم و رواج قانونی کو الٹ دے مگر بقول لارڈ کیمیڈن یہ صرف ایک چلہ کی مطلق العنانی ہوا کرتی تھی زمانہ ہر ایک ممکن مضرت کو بہت سرعت کے ساتھ بدل دیتا تھا اور اس تحدید کا وقوف حاکم کے حوصلوں کو پست و فرو رکھتا تھا۔

جس تدریجی کارروائی سے اس دستور کا ارتقا ہوا اس سے ہمیں صرف ناکمل واقفیت ہے لیکن یہ روایتی بیان کہ خاندان ٹارکوئین کے اخراج کے بعد رومانیوں

نے بادشاہی کے منسوخ کرنے اور جمہوریت کے قایم کرنے کا عزم کر لیا تھا، یہ بیان غالباً لفظاً یا معناً بالکلیہ صحیح نہیں ہے۔ میں پہلے ہی یہ بحث پیش کر چکا ہوں کہ بادشاہی اور جمہوریت کا فرق غیر حقیقی فرق ہے اور اگر یہ کوئی حقیقی فرق ہو بھی تو بھی اغلب یہ ہے کہ اولین زمانہ کے جن رومانیوں نے خاندانِ ٹارکوین کو نکالا تھا انھیں یہ فرق بالکل ہی نامعلوم تھا۔ مزید براں خود اس قصہ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جو تغیر کیا گیا وہ آناً فاناً نہیں ہوا بلکہ بتدریج ہوا، کیونکہ ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ٹارکوین کے فرار کے بعد اس خاندان کا ایک رکن کولاٹی نوس عہدۂ قنصلی پر قابض ہو گیا اور شہر کو اس سے نجات دلانے کے لئے ایک دوسرے انقلاب کی ضرورت پڑی۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا، جیسے ۱۸۳۰ء میں خاندانِ بوربون کے زوال کے بعد اس خاندان کی شاخ اصغر کا ایک فرد لوئی فلپ اٹھارہ برس تک صاحبِ اقتدار رہا۔ جب ہم اس قصے پر نزدیک سے نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ گمان کرنے کی مطلق کوئی وجہ نہیں ہے کہ ٹارکوین کے فرار کے بعد جو اولین حکام مقرر ہوئے تھے وہ ایسے قناصل تھے جن کے عہدے کی میعاد ایک برس کی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ قنصلیت کے قایم ہونے کا قصہ ایک مبہم سی روایت ہے جس کی کوئی مسلسل تاریخ نہیں ہے۔ بعد کے زمانے کے رومانیوں نے جب قناصل کے بارے میں پڑھا تو وہ اپنے زمانے کے قنصلوں کے طرح ابتدائی قنصلوں کو بھی سالانہ عہدہ دار سمجھنے لگے۔ یہ نہایت ہی اغلب معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسا طوفانِ عام نہیں آیا تھا جیسا کہ روایات میں بیان ہوا ہے، نہ بادشاہ کے منصب کی کوئی فوری تنسیخ ہوئی تھی اور نہ سالانہ قنصلیت کی فوری تخلیق بلکہ جس طرح انگلستان میں مشاہدہ ہو چکا ہے، اسی طرح شاہی اختیار بتدریج زوال پذیر ہوتا گیا۔ ٹارکوین کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کولاٹی نوس موروثی حق کی بنا پر اس کا جانشین ہوا۔ خواہ وہ قنصل کہلاتا رہا ہو یا نہ کہلاتا رہا ہو مگر یہ اغلب ہے کہ اس کے عہدے کی میعاد ہنوز محدود نہیں ہوئی تھی اس کے بعد غالباً مسلسل تغیرات سے شاہی عہدہ گھٹتے گھٹتے بعد کے زمانہ کی سالانہ قنصلیت کی صورت میں آ گیا اور یہ قنصلیت درحقیقت اپنی شکل اور اپنے لوازم

کے اعتبار سے ہمیشہ بادشاہی کے مشابہ رہی۔ اگر ہمارا خیال صحیح ہے تو پھر ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ ارتقا دو امور پر مشتمل تھا، اولاً یہ کہ شاہی منصب بجائے موروثی ہونے کے انتخابی بنا دیا گیا، دوسرے یہ کہ اس کی میعاد ایک برس کے لئے محدود کر دی گئی۔

پس اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نظریئے کی تصدیق جس طرح جدید انگلستان کی مثال سے ہوتی ہے اسی طرح قدیم روما کی مثال سے بھی ہوتی ہے آئندہ سے قدیم روما کے آئینی ارتقا کو مختصراً بیان کرتے وقت ہمیں اس بے معنی خیال کو مسترد کر دینا چاہیے کہ شاہی منسوخ کر دی گئی اور جمہوریت قایم ہو گئی۔ اس وقت سے ہمیں اس قول کو ترجیح دینا چاہیئے کہ ایک حکومت ساز عضو کو نشو و نما حاصل ہو گیا تھا اور اس کے عمل کے واسطے جگہ نکالنے کی غرض سے بادشاہی انتخابی بنا دی گئی اور ایک برس کی میعاد کے لئے محدود کر دی گئی۔

جب بعد میں اس طرز حکومت کا زوال ہوا جسے جمہوریت کہتے ہیں اور (نام نہاد) بادشاہی کی تجدید ہوئی تو دراصل پرانا طرز از سر نو عود کر آیا۔ آگسٹس خود کو سال بہ سال منتخب کراتا تھا، بالفاظ دیگر یہ کہ شاہی اختیار کی تجدید کی علامت یہ تھی کہ محدود میعاد منسوخ کر دی گئی۔ دوسرے عہدوں پر بھی شہنشاہ اسی طریقے پر سال بسال مقرر ہوتا تھا اور سکوں پر شہنشاہ کے عہد کا دسواں برس "ٹربیون دسویں بار" کے الفاظ سے ظاہر کیا جاتا تھا۔

جیسا کہ میں نے وعدہ کیا تھا، اب میں انگلستان کی دستوری تاریخ کی طرف پلٹتا ہوں تاکہ میں اس دستور کی اس قدیم تر ہیئت کی تحقیق کروں جس میں اگرچہ یہ یقینی ہے کہ زمانۂ جدید کے مانند ایسا وزیر ہنوز نہیں تھا جسے پارلیمنٹ نے ملک پر حکومت کرنے کے لئے پسند کیا ہو اور پارلیمنٹ ہی اپنی مرضی سے اسے معزول کرتی ہو تاہم ایک پارلیمنٹی حکومت موجود تھی، اور وہ نہایت ہی نمایاں کامیابی کے ساتھ مطلق العنانی کی مقاومت کرتی رہتی تھی۔ دستوریت کو اس سے بڑی فیروزمندی کب حاصل ہوئی ہے جیسی سنہ ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے حاصل ہوئی۔ اب پر بھی سنہ ۱۶۸۸ء میں پارلیمنٹ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کا وجود حکومتوں کے بنانے اور بگاڑنے

کی غرض سے ہے بلکہ اس نے زیادہ سے زیادہ یہ دعویٰ کیا کہ ایک مایوس کن انتہائی حالت میں وہ یہ جرأت کر سکتی ہے کہ ایک خفیف حد تک وہ اس مقررہ قانون میں مداخلت کرے جس کے بموجب سلطنت میں حکمران کی جانشینی کا اسی طرح انضباط ہوتا تھا جس طرح زمیندارانہ علاقوں میں ان کے مالکوں کی جانشینی کا انضباط ہوا کرتا تھا۔ پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بغیر کسی حکومت ساز عضو کے دستوریت کا وجود ہو سکتا ہے۔ لیکن یہی وہ عضو ہے جس سے ہمارے نظریہ کو دستوریت کی حقیقی صورت ملتی ہے۔ اب میں اس اعتراض پر بحث کروں گا۔

میں ابتدا ہی میں بہت ہی آزادی کے ساتھ ان واقعات کو تسلیم کیے لیتا ہوں جن پر اس اعتراض کی بنا ہے۔ ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ ہیلم اور میکالے کے زمانے سے تاریخ انگلستان کے متعلق وھگ نقطۂ خیال نے ۱۶۸۸ء کے انقلاب کی اہمیت میں اس درجہ مبالغہ کر دیا ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ موجودہ وزارتی نظم ٹھیک اسی تاریخ سے جاری ہو گیا ہو گا۔ ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ شاہی اختیار کی معدومیت اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے جس تاریخ سے ولیم سوم کے عہد میں شاہی حق امحاء کا استعمال ترک ہوا ہے اور میکالے فریقانہ طریق کے عروج کو بھی اسی دور تک پہنچاتا ہے۔ میری رائے اس سے بالکل ہی مختلف ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب کی وجہ سے شاہی اختیار میں ضعف نہیں آیا تھا اور یہ کہ ولیم اور این اپنے پیشروؤں ہی کی مانند زوردار بادشاہ تھے بلکہ بعض اعتبارات میں ان سے بھی زیادہ زوردار تھے۔ میں شاہی اقتدار میں کسی قسم کے زوال کے علامات جارج دوم کے عہد تک نہیں دیکھتا اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد بھی شاہی کو ایک تجدید کا زمانہ مل گیا۔ میری رائے میں فریقانہ اصول کا شیوع خاندانِ ہانوور کی تخت نشینی کے وقت سے ہوا گر اس سے ایک مدت بعد تک یہ اصول ہمارے زمانہ کے فریقانہ اصول سے بہت کچھ مغایر تھا۔ اس کے بجائے کہ جدید نظم کا سراغ انقلاب یعنی سترھویں صدی تک پہنچے، اٹھارھویں صدی میں بھی اس کا کچھ زیادہ پتہ نہیں چلتا اور اس کی یہ موجودہ شکل زیادہ تر پہلے قانونِ اصلاح کے وقت سے پیدا ہوئی ہے۔

جدید انگلستان کا دستوری ارتقا ایک واحد تحریک نہیں ہے جس کا انجام انقلاب پر ہوگیا ہو بلکہ یہ دو جداگانہ تحریکیں ہیں جن میں سے ایک کا تعلق زیادہ تر سترھویں صدی سے اور دوسرے کا تعلق کچھ اٹھارھویں صدی سے اور کچھ انیسویں صدی سے ہے۔ ان تحریکات سے جو نتیجہ حاصل ہوا ہے ان کو میں پہلے ہی بیان کرچکا ہوں ایک بہت ہی پر زور حکومت قایم ہوگئی ہے اور اس کے پہلو میں ایک حکومت ساز عضو بھی پیدا ہوگیا ہے جو بہت ہی ذی حس اور خاص سہولت سے کام کرنے والا ہے۔ یہ حکومتِ وزارت کہلاتی ہے اور ایک بادشاہ کے ذریعہ سے جسے وزیر اعظم کہتے ہیں، باہم مربوط رہتی ہے لیکن وزیر اعظم اور وزارت کو جس ارتقا نے یہ خصوصیت عطا کی ہے وہ بعد کا ارتقا ہے۔ سابق کا ارتقا نہیں ہے۔ مجھے کچھ زحمت اٹھاکر اسے واضح کرنا چاہیئے۔

ہم نے خود اپنے زمانہ میں بڑے بڑے جلیل القدر وزرا کو دیکھا ہے مگر شاید تم یہ کہوگے کہ اٹھارھویں، سترھویں بلکہ سولھویں صدی میں بھی بڑے بڑے عالی مرتبت وزرا گزرے ہیں، ہر دو پٹ، گوڈولفن، والپول، مالبرو، کلیرنڈن، اسٹیفرڈ، بکنگھم، برلے، یا وولزی اس زمانہ کے وزیروں سے کس بات میں گھٹے ہوئے تھے کہ انھیں ایک بالکل ہی جداگانہ صنف میں شامل کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف ایک بات میں گھٹے ہوئے تھے لیکن یہی ایک بات سب کچھ ہے، وہ یہ کہ پارلیمنٹ پر ان کا انحصار اس اعتبار سے مطلق نہ تھا کہ وہ رائے عامہ کا آلہ ہے۔

یہ تغیر بتدریج ہوا ہے، وزیر کا انحصار اب بالکلیہ پارلیمنٹ اور قوم پر ہے ایک تقلیبی دور بھی ہو گزرا ہے جس کی نسبت یہ سمجھنا چاہیئے کہ کم و بیش وہ جارج سوم کے کل عہد پر حاوی تھا، اس زمانہ میں عمومی اثر وزیر کے لئے نہایت ہی کار آمد تھا اور بعض وزرا کا انحصار مختصر زمانہ کے لئے بالکلیہ اسی پر ہوتا تھا مگر اس زمانہ میں بادشاہ کی تائید بھی اتنی ہی بلکہ اکثر صورتوں میں اس سے زیادہ ضروری و لازمی تھی اور صرف ایسے ہی وزرا کی حیثیت مستحکم رہتی تھی جن پر (پٹ اصغر کی طرح) بادشاہ اور قوم دونوں کی نظر عنایت ہو، لیکن اگر ہم اس دور سے اور اوپر چلیں یعنی پٹ اکبر کے زمانہ سے آگے بڑھیں (جو رائے عامہ کا پہلا وزیر تھا)

توپھر ہم ایک ایسے زمانہ پر پہنچ جاتے ہیں جب کہ وزیر کا انحصار بادشاہ پر ہوتا تھا نہ کہ قوم یا پارلیمنٹ پر' جب کہ وہ اسماً اور واقعاً دونوں طرح پر اعلیحضرت کا وزیر ہوا کرتا تھا' (اور یہ حال ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے ستر برس بعد کا ہے۔) انگلستان کے تمام وزرا کا یہی حال تھا تا آنکہ ۱۷۸۳ء میں ولیم پٹ نے بہ امداد قوم اختیار کے دروازوں کو بزور کھول دیا۔ اس زمانہ میں یہ ضروری نہیں تھا کہ وزیر کسی نہج سے اِس زمانہ کے وزرا سے کم شان و شکوہ رکھتا ہو۔ ہو سکتا تھا کہ اس زمانہ میں جو بادشاہ اسے مقرر کرتا ہو وہ شان میں اس سے بھی اسی طرح بڑھ جاتا ہو جس طرح اس زمانہ میں وہ پارلیمنٹ سے بڑھ جاتا ہے جو اس کا تقرر کرتی ہے۔ فرانس میں مطلق العنان بادشاہوں کے تحت میں' رشلیو' مازارین' فلیوری وغیرہ کے ایسے جلیل القدر وزرا' آزاد انگلستان کی بہ نسبت بھی زیادہ کثرت سے ہو گزرے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں بادشاہوں کو ان کی حدِ خواہش تک اختیارات حاصل ہوتے ہیں' وہاں وہ اکثر اس میں خوش رہتے ہیں کہ حکومت کا بار جزءً یا کلاً کسی عقلمند شخص پر ڈال دیں' گو اس کا انحصار ان کی مرضی پر رہے۔ اور انس قدیم نظم کے تحت میں مارلبرو' برلے' یا والزی کے ایسے بڑے سے بڑے وزیر بھی صحیح معنی میں حکمران نہیں کہلائے جا سکتے تھے کیونکہ ان کے اختیار کا انحصار ایک شخص کی طبیعت پر تھا' اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خاص صورتوں میں اس شخص کو ان کی رائے کے مسترد کر دینے کی آزادی ہمیشہ حاصل ہوتی تھی۔ جو شخص یہ سمجھنا چاہیئے کہ انقلاب کے مدتوں بعد تک بھی وزیر کا انحصار پارلیمنٹ پر کس قدر کم اور بادشاہ پر کس قدر زیادہ تھا' اسے میں یہ صلاح دوں گا کہ وہ فاکس کی حیات مارلبرو میں اس تغیرِ وزارت کا مطالعہ کرے جو ۱۷۱۰ء میں واقع ہوا۔ اس زمانہ میں گوڈولفن کی وزارت کا خاتمہ ہوا اور ہارلے اس کی جگہ پر آیا۔ تم دیکھو گے کہ اس فیصلہ کا انحصار کس مکمل طور پر ملکہ این کے ہاتھ میں تھا' ملکہ کو ایک مشیر کی ضرورت تھی اور اس نے ہارلے کو چن لیا گوڈولفن نے آٹھ برس اس کی خدمت کی تھی مگر اب ان دونوں میں وہ موافقت نہیں رہی تھی جو پہلے تھی' ملکہ کو اب اس پر وہ اعتماد نہیں تھا جو پہلے تھا' اب اسے یہ خواہش پیدا ہو چلی کہ وہ کسی دوسرے کی

صلاح کو سنے یہ افواہ سنی جانے لگی کہ ملکہ ہارلے سے تنہائی میں باتیں کیا کرتی ہے۔ ڈیوک شروزبری لارڈ چیمبرلین (حاجب) مقرر ہوا، اور گو شروزبری فریق مخالف کا رکن نہیں تھا، پھر بھی یہ تقرر کسی قدر عجیب معلوم ہوتا تھا اور گوڈولفن اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ اس طرح شبہات بڑھے اور ملکہ و وزیر کے درمیان افتراق وسیع ہوتا گیا، تاآنکہ وزیر کو آخرالامر ملکہ کی جانب سے ایک خط ملا، جس میں ملکہ نے اسے یہ لکھا کہ اس کا منشاء ہے کہ خزانہ کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں دیدے مگر وہ اسے (گوڈولفن کو) چار ہزار سالانہ کا وظیفہ دیگی اور وہ یہ کر سکتا ہے کہ اپنا عصا ملکہ کے پاس واپس بھیجنے کے بجائے اسے توڑ ڈالے، یہ "ہم دونوں کے لئے زیادہ آسان ہوگا"۔ اول سے آخر تک پارلیمنٹ یا رائے عامہ کا ایک لفظ بھی کہیں نہیں آیا، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس وقت بھی یہ صحیح تھا کہ ایک معمولی عقل کے بادشاہ کو رائے عامہ کے تغیرات پر توجہ رکھنا مناسب تھا اور یہ کہ سیکے ویرل کے مقدمہ سے اگر اضطراب نہ پیدا ہو گیا ہوتا تو ممکن تھا کہ گوڈولفن کے ہاتھ میں قلمدان وزارت ابھی اور زیادہ دنوں تک رہتا۔

پس ملکہ این کے زمانہ میں انگلستان کس معنی میں دستوری ملک تھا کیونکہ وزیر محض ایک صلاح کار تھا اور جب بادشاہ کا دل اس سے بھر جاتا تھا تو وہ برطرف کر دیا جاتا اور اس پر بھی انگلستان کی آزادی کے خلاف ورزی کرنے کے لئے ملکہ این نے خود اپنے باپ کو نکالنے میں مددوی تھی اور عین اسی وقت میں انگریزی قوم کو خود رایانہ اقتدار سے محفوظ رکھنے کے لئے وہ اپنے بھائی کو اس کی وراثت سے محروم کئے ہوئے تھی۔

ایک لفظ میں میرا جواب یہ ہے کہ اس وقت پارلیمنٹ مسلمہ طور پر حکومت ساز عضو نہیں تھی اور یہ عقیدہ نفرت کے ساتھ مسترد کر دیا جاتا کہ پارلیمنٹ ملک کے ایک حکمراں کو برطرف کر سکتی ہے اور دوسرے کو اس کی جگہ پر مقرر کر سکتی ہے لیکن ہمیں: نہ تو اس امر سے انکار کی ضرورت ہے کہ انگلستان اس وقت میں ایک دستوری ملک تھا اور نہ ہمیں اپنے نظریئے کے ترک کرنے اور آئینیت کے لئے کسی اور تعریف کے تلاش کرنے کی حاجت ہے، کیونکہ پارلیمنٹ اس زمانے

میں جس اختیار کا دعوے کرتی تھی اور جس پر وہ انقلاب کے وقت میں قطعی طور پر جمی رہی وہ اگرچہ باعتبار مدارج نسبتاً بہت ہی معتدل تھا مگر تھا اسی قسم کا۔ پارلیمنٹ یہ دعوے نہیں کرتی تھی کہ حکومت کے بنانے، بگاڑنے کا غیر محدود اختیار اسے دیدیا جائے، یہ اس سے بہت بعید تھا البتہ اس کا یہ دعوے تھا کہ بعض حالات میں حکومت کے بنانے، بگاڑنے کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہے اور کسی دوسرے اختیار مثلاً تشریعی اختیار کی بنا پر نہیں بلکہ اس اختیار کی بنا پر جو پارلیمنٹ کو حاصل تھا انگلستان کو ایک دستوری ملک کہا جاسکتا تھا۔

بہت ہی بے ثبات الفاظ میں، گو بغیر کسی عملی تذبذب کے پارلیمنٹ نے ایک بادشاہ کو معزول کر دیا تھا اور اس طرح عمل کرنے سے اس نے حکومت کو تباہ کرنے کا حق قایم کر دیا تھا۔ کسی حکومت کے قایم کرنے کے دعوے کے متعلق بھی وہ اسی قدر مذبذب تھی، اس کا ارادہ یہ تھا کہ خالی شدہ تخت پر کسی کے متمکن کرنے کے لئے قواعد توریث کی پابندی کی جائے۔ میری جیمز کی بالکل اس طرح جانشین ہونے والی تھی گویا جیمز مر گیا یا اس نے خلع کر دیا ہے مگر پارلیمنٹ کو اپنے منشاء سے کچھ زیادہ تیز چلنا پڑا اور اسے مجبور ہو کر ولیم کو بھی بادشاہ بنا دینا پڑا۔

پس پارلیمنٹ ظاہری ادعا جو کچھ بھی کرے مگر حقیقتاً وہ ایک حد تک ایک حکومت ساز عضو تھی۔ اس میں شک نہیں کہ صرف انتہائی صورت میں مگر پھر بھی ایک خاص صورت میں جب کہ بادشاہ نے اپنے منصب کے تمام روایات کو ترک کر دیا ہو، وہ بادشاہ کو معزول کر سکتی تھی، اور بہت ہی تنگ حدود کے اندر وہ بادشاہ کا انتخاب بھی کر سکتی تھی۔ یہ دعویٰ پارلیمنٹ نے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں کیا کہ وہ تاج کو انتخابی بنا دے گی، نہ اس نے کسی ایسے اقتدار کا خواب دیکھا کہ وہ پیلیفکس، یا ڈینبی، یا چرچل کو جیمز دوم کی خالی کردہ جگہ پر نصب کر دے۔ البتہ اس نے یہ جرأت دکھائی کہ ایک شخص جو نسب و مناکحت دونوں اعتبار سے شاہی خاندان کا ایک رکن تھا اسے سلطنت کی بے بہا خدمت انجام دینے کے بعد منصب شاہی عطا کر دیا۔

حکومت کا بنانا اور بگاڑنا ہمہ وقت ایک بہت ہی غیر معمولی معاملہ ہے جسے آسان

سمجھ کر ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا تھا لیکن جدید نظم میں یہ کام درحقیقت ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ کسی نئی حکومت کو صاحب اقتدار ہوتے دیر نہیں لگتی کہ ہم فہرست تقسیم آرا۔ اس غرض سے دیکھنے لگتے ہیں کہ آیا اس حکومت کا خارج ہو جانا اغلب ہے یا نہیں۔ لیکن اس زمانے میں بھی جب کہ پارلیمنٹ کی حکومت ساز قوت اس قدر بلند و برتر ہے اور اسکی کل اس سہولت کے ساتھ عمل کرتی ہے، اگر وزارت کو موقع نہ دیا جائے اور ادنیٰ سے عذر پر پارلیمنٹ وزرا کی تائید سے دستکش ہو جائے اور ان کے موافق کثرت انھیں چھوڑ دے تو حکومت کا چلانا غیر ممکن معلوم ہوگا۔ ملکہ این کے زمانے کے متعلق بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ پارلیمنٹ کو بھی اختیار حاصل تھا مگر اس اختیار کے استعمال کی کراہت (جس کا کچھ شائبہ اب بھی موجود ہے) اس زمانہ میں بے انتہا بڑھی ہوئی تھی۔ جدید دستوریت کے معنی یہ ہیں کہ انگلستان میں جب کوئی حکومت غیر مقبول ہونا شروع ہو جاتی ہے تو پھر اس کے زوال میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ ملکہ این کے زمانے میں دستوریت کے معنی یہ تھے کہ جو بادشاہ ناپسندیدہ و نامقبول ہو جاتا تھا یعنی وہ ایک خاص حد سے تجاوز کر جاتا تھا، اسے پارلیمنٹ برطرف کر سکتی تھی اور کر دیتی تھی اور اپنے حسب صوابدید تاج شاہی خاندان کے کسی دوسرے رکن کو دیدیتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فرق بہت بڑا فرق ہے مگر پھر بھی یہ صرف درجے کا فرق ہے۔ مطلق العنان سلطنتوں کے مقابلہ میں ملکہ این کے زمانے کے انگلستان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسی صنف سے متعلق تھا، جس صنف سے ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کے انگلستان کا تعلق ہے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، حکومت ساز عضو کی حیثیت سے پارلیمنٹ کا فرض اب بھی کسی قدر پوشیدہ ہے۔ پارلیمنٹ اب بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ وہ قانون بنانے والی جماعت ہے، روپیہ عطا کرنے والی جماعت ہے، یعنی کم و بیش سب کچھ ہے مگر حکومت ساز جماعت نہیں ہے۔ ملکہ این کے زمانہ میں یہ پردہ اس قدر گہرا اور ناقابل گزر تھا کہ کسی شخص کو یہ خیال بھی نہ آتا کہ وہ پارلیمنٹ کی نسبت یہ کہے کہ وہ حکومتوں کی بنانے والی اور بگاڑنے والی ہے۔ ایک صدی کے اندر اس نے صرف دو مرتبہ حکومت کو برباد کرنے کی ہمت دکھائی تھی۔ اس نے جیمز دوم

کی حکومت کو برباد کر دیا تھا اور اس سے قبل چارلس اول کی حکومت کو بھی برباد کیا تھا اگر چارلس اول کے ساتھ اس نے جو برتاؤ کیا اس پر اس نے بعد کو بہت سخت اظہار افسوس کیا۔ چارلس کی حکومت کے بجائے اس نے جو انقلابی حکومتیں قائم کیں، ان پر بھی اس نے اظہار افسوس کیا۔ دو مواقع پر اس نے انگلستان میں دیرپا حکومتیں بھی قائم کیں۔ اس نے ولیم کو بادشاہ بنایا اور صوبیہ والیۂ ہانوور کے وارث کو بھی تاج عطا کیا۔ شاہان اسٹوارٹ کے دور کے تقریباً دو ثلث زمانے میں پارلیمنٹ کے اجلاس کم و بیش برابر ہوتے رہے اور اس نے بہت جانفشانی سے کام کیا، اس پر بھی صرف انھیں شاذ واقعات میں، اور محض منطقی ضرورت کے عذر پر اس نے حکومت ساز عضو ہونے کا ادعا کیا۔

بایں ہمہ حقیقی اہمیت میں یہ چند مستثنیٰ اعمال ایک صدی کے عطائے محاصل اور رفع شکایات سے بڑھ گئے تھے ۱۶۸۸ء کے انقلاب جیسی واحد کامیاب نظیر نے انگلستان میں حکومت کی تمام خصوصیت کو بدل دیا کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے حکومت کو ذمہ دار بنا دیا؟ ہمیں اس نتیجہ کو یاد کرنا چاہیے جس پر ہم گزشتہ میقات میں پہنچے تھے تمام شاہی حکومتیں ذمہ دار ہیں کیونکہ اس قسم کی تمام حکومتوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کا انحصار اشخاص کی کسی جماعت کی رضامندی پر ہو اور اس رضامندی کا کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا ضروری ہے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ شاہان ٹیوڈر کے زمانہ میں جب کہ پارلیمنٹ کی طاقت ناقابلِ لحاظ تھی، حکومت ذمہ دار تھی اور رائے عامہ سے اس کی تائید ہوتی تھی تا آنکہ وہ اس قابل ہو گئی تھی کہ فوج کی تائید سے بھی بے نیاز ہو جائے۔ پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے کونسی نئی شئے جاری ہوئی۔

ہمارے نظریہ سے اس کا جواب خود بخود مل جاتا ہے مملکتیں دو قسم کی ہوتی ہیں بعض ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں جو طاقت حکومت کی تائید کرتی ہے وہ مخفی ہوتی ہے اور اس کا کوئی آلہ عمل نہیں ہوتا۔ اس قسم کی مملکتوں میں حکومت کی ذمہ داری جیسی کچھ ہوتی ہے وہ خفیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ فی الواقع حکومت پر اقتدار رکھنے کے قابل ہوتے ہیں وہ اس قوت سے آگاہ نہیں ہوتے۔ حکومت غیر ذمہ داری کا ایک اندازا ختیار

کر لیتی ہے، یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ حق خداداد کے بموجب حکمرانی کرتی ہے اور ہر طریق پر خود اپنی دست نگری کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسری قسم کی مملکتوں میں جو قوت حکومت کو بناتی ہے اس کے پاس ایک آلۂ عمل ایسا ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ باقاعدہ اور قانونی ضابطہ کے ساتھ عمل کر سکتی ہے۔ جہاں اس قسم کا آلہ موجود ہوتا ہے، وہاں حکومت کی ذمہ داری پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتی یہاں یہ آلہ مملکت کی دوسری قسم کی بہ نسبت کچھ زیادہ حقیقی و واقعی ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہویدا اور ناقابلِ انکار بھی ہوتا ہے۔

۱۶۸۸ء کے انقلاب کے وقت انگلستان مملکتوں کی اسی قسم میں داخل ہو گیا۔ اس انقلاب سے یہ ظاہر کر دیا گیا کہ نہ صرف حکومت سے جواب طلب ہو سکتا ہے بلکہ قانونی ضابطے کے مطابق اور ایک مستند آلہ کے ذریعے سے اس سے جواب طلب ہو سکتا ہے۔ انگلستان میں اڈورڈ دوم، رچرڈ دوم، رچرڈ سوم، چارلس اول بہت سے بادشاہوں کو جوابدہی کرنا پڑی ہے۔ اگر کسی کو اس معاملہ میں شک رہا ہو تو ان بادشاہوں کی قسمت نے اس معاملہ کو کافی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ ایک شخص بے غل وغش ہزاروں پر جور و ظلم نہیں کر سکتا۔ گو یہ انقلابات بیرون حدود قانونی اور ہولناک ہوئے ہیں اور انھوں نے قوم کے ضمیر کو مضطرب کر دیا ہے۔ ان میں سے آخری انقلاب جس نے چارلس اول کا تختہ الٹ دیا، سب سے زیادہ خلافِ قانون معلوم ہوتا ہے اور یہ خاص اس وجہ سے کہ اس انقلاب نے الفاظِ قانون کے مطابق بننے کی کوشش کی۔ پارلیمنٹ کو حرکت دی گئی گو یہ ایک مصنوعی پارلیمنٹ تھی جس میں سپاہیوں نے قطع و برید کر دی تھی۔ لہٰذا اس کے بعد ایک شدید رجعت عمل واقع ہوئی اور شاہی کے عدم ذمہ داری کا جامع اقتدار عقیدہ کچھ دنوں کے لیے معقول ہو گیا۔ انگلستان اس وقت تک مملکتوں کی اس قسم سے متعلق رہا جس میں کوئی حکومت ساز آلہ نہیں ہوتا۔

۱۶۸۸ء کے انقلاب کے وقت انگلستان مملکتوں کی اس قسم سے نکل گیا۔ اس وقت حکومت کے بنانے اور حکومت کے بگاڑنے کے ایک ایسے ذریعے کا اکتشاف ہوا جو اتنا قانونی و باضابطہ تھا کہ اس سے قوم کا ضمیر مطمئن ہو سکتا تھا۔ اس مرتبہ یہ امکان

پیدا ہو گیا کہ بغیر پرخطر خطرناک تحریف و تصحیف کے پارلیمنٹ سے حکومت ساز عضو کا کام لیا جا سکے ایک ایسا انقلاب واقع ہوا۔ جو مدتوں بعد اطمینان، پسندیدگی اور فخر کی نظر سے دیکھا جا سکتا تھا اور جس پر اس زمانہ کے بعد سے اظہار پسندیدگی کرنا ہماری سیاسی حق پرستی کا لفظ خاص بن گیا ہے۔

پس ایک لفظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ موجودہ انگلستان ملکہ این کے انگلستان سے بہت ہی مختلف ہے مگر پھر بھی وہ دونوں مملکت کی ایک ہی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور مطلق العنانی کے بالمقابل دونوں کو یکساں طور پر دستوری کہہ سکتے ہیں کیونکہ دونوں میں یکساں طور پر پارلیمنٹ کی ذات میں حکومت ساز عضو پایا جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ موجودہ نظم کے تحت حکومت یعنی وزارت کا انحصار بالکلیہ پارلیمنٹ کی مستعدانہ تائید پر ہے اور اس تائید کے جاتے رہنے سے معاً اس کا زوال ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف قدیم طرز کی حکومت میں بادشاہ کا انحصار پارلیمنٹ کی عاطلانہ تائید پر تھا اور اس کا زوال صرف اس وقت ہوتا تھا جب پارلیمنٹ مستعدانہ مخاصمت پر اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ غالباً ہم اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ نظم میں حکمران کی تائید کے لیے پارلیمنٹ کے عمل کی ضرورت ہے، برخلاف ازیں سابق دستور میں حکمران کے عزل کے لئے پارلیمنٹ کے عمل کی ضرورت ہوتی تھی۔

خطبۂ سوم

ہم ایسی اشیا کی ترتیب میں مشغول ہیں جنھیں ہم زندہ عضویات یعنی ممکنتیں خیال کرتے ہیں۔ زندہ عضویات کی حیثیت سے ان چیزوں کے متعلق یہ توقع ہو سکتی ہے کہ ان میں یہ خصوصیات ہونگے کہ وہ تقریباً نامحسوس تدریج کے ساتھ ایک دوسرے میں داخل و شامل ہو جائیگی کیونکہ زندگی اسی طریقے پر جاری و ساری ہے جب ہم غیر عضوی اشیا یا مجردات سے بحث کرتے ہیں تو ترتیب و تقسیم کا کام نسبتاً ایک سہل کام ہو جاتا کیونکہ یہاں فرق وسیع و صاف ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی مہندس کے لیے مثلث اور مستطیل کا فرق بیان کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے اور اسے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ وہ غلطی سے ایک کی جگہ دوسرے کو سمجھ لیگا اسی طرح کیمیا دان کو یہ خطرہ نہیں ہے کہ وہ ہوا کو پانی سے اور نائیٹروجن کو آکسیجن سے خلط ملط کر دے گا۔ لیکن حیوانات و نباتات کا حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں تمہارے سامنے لاتعداد چھوٹے چھوٹے تنوعات ہوتے ہیں۔ بعض افراد میں ایک دوسرے سے بہت وسیع فرق ہوتا ہے مگر ان دونوں کے بیچ کا فاصلہ درمیانی شکلوں سے بھرا ہوتا ہے اور چونکہ زندگی کے میدان میں ہم ہر جگہ ارتقا کو عمل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اس لئے ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ ہم صرف مکمل اعضا بلکہ اعضا کی ایسی ابتدائی حالتیں بھی پاتے ہیں جو ہنوز پورے طور پر ظاہر نہیں ہوئی ہیں اور اعضا کے ایسے باقیات بھی ملتے ہیں جو بیکار ہو چکے ہیں۔

زمانۂ سابق کے سیاسی فلاسفۂ مملکتوں پر علم عضویات کے ان تصورات کا انطباق بہت زیادہ نہیں کرتے تھے۔ وہ مملکتوں کے اقسام میں بہت ہی سادے اور بے لوچ امتیازات قائم کرتے تھے اور اس کے طبیعی نتیجہ کے طور پر انھوں نے تاریخی انقلابات کو (یعنی جب مملکتیں اپنی شکل کو بدلتی ہیں) اس سے بدرجہا زیادہ ناگہانی سمجھا جتنا تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ آخری خطبہ میں میں نے اس کی ایک مثال تمھیں اس موقع پر دی تھی، جہاں روما کے دور اولین میں شاہی کے زوال کا ذکر کیا ہے۔ مورخین نے اسے اس طرح ظاہر کیا ہے گویا وہ گلہ بان، جنگ آور لوگ جو پیلیٹائن اور کیپیولائن کے مندروں کے گرد جمع ہوئے تھے، مملکتوں کے متعلق ارسطو کی ترتیب و تقسیم سے پوری طرح مانوس تھے اور جب واقعات نے شاہی کے نقائص پر زبردست روشنی ڈالی تو پھر انھوں نے اس کے نتیجے کے طور پر کسی ایک مخصوص دن یہ قرار دیا کہ اس سیاسی شکل کو ساقط کر کے وہ دوسری شکل اختیار کی جائے جسے جمہوریت کہتے ہیں۔ میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ فی الحقیقت یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آیا ہو، شاید کہ بادشاہی کی فسخ بالارادہ بالکل واقع ہی نہ ہوئی ہو، بلکہ تدریجی کارروائی سے بادشاہی زوال پذیر ہوتی گئی ہو یہاں تک کہ کچھ مدت (بالفرض سو برس) کے گزر جانے کے بعد گویا کہ شاہی باقی نہیں رہی، اور میں یہ خیال بھی ظاہر کر چکا ہوں کہ بالکل اسی تدریجی طریق پر جب اپنی باری میں جمہوریت کا زوال ہوا تو ماریوس اور آگسٹس کے درمیانی زمانے میں چھوٹے چھوٹے تغیرات کے سلسلے سے شاہی پھر بحال ہو گئی۔

اگر سیاسی ارتقا کی عام کیفیت و نوعیت یہ ہے تو مملکتوں کی ترتیب و تقسیم کے باب میں ہمیں اس امر کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ ہمیں ایک بہت بڑی تعداد ارتقائی شکلوں کی ملے گی۔ جن مملکتوں میں اعضا کامل طور پر نشو و نما پا گئے ہیں، انھیں کے پہلو بہ پہلو ہمیں ایسی مملکتوں کے ملنے کا بھی متوقع رہنا چاہئے جن میں یہ اعضا ہنوز ابتدائی حالت میں ہیں اور اگر یہ عام طور پر صحیح ہے تو حکومت ساز عضو کے بارے میں بھی صحیح ہوگا جس کے متعلق ہم حال میں غور کر رہے تھے۔ ہم نے یہ قرار دیا ہے کہ بعض مملکتوں میں یہ عضو موجود ہوتا ہے اور بعض میں نہیں ہوتا۔ آخر الذکر کو ہم شخصی مملکت

کہنے میں اور مقدم الذکر کو ہم غالباً دستوری کہہ سکتے ہیں۔ مگر اب ہمیں یہ قرار دینا چاہئے کہ بعض مملکتوں میں اس عضو کی نشو ونما بالکل غیر مکمل ہوتی ہے اور بعض میں اس قدر غیر مکمل ہوتی ہے کہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آیا اس میں یہ عضو ہے بھی یا نہیں پس سترھویں صدی کے آخر میں انگلستان کے متعلق عام اعتبار سے میری بھی رائے ہے۔ انگلستان اس وقت میں دستوری مملکت تھی گر اس کا ارتقا غیر مکمل تھا۔ حکومت ساز عضو کا پتہ چلتا تھا مگر ابھی اس میں تفرق کم ہوا تھا۔

اگر یہ واقعہ ہے تو اس سے زیادہ طبعی کوئی امر نہیں ہو سکتا کہ بروقت اسے غلط سمجھا گیا اور غلط بیان کیا گیا۔ اس وقت پارلیمنٹ جس حالت میں تھی اور اب ڈیڑھ صدی کے مزید ارتقا کے بعد وہ جس حالت پر پہنچی ہے، ہم نے ان دونوں کا مقابلہ کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ مگر سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے فلاسفہ یہ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور اس لئے پارلیمنٹ کی اصلی غرض کے سمجھنے میں ان سے غلطی کا ہونا ممکن تھا اور یہ امکان اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھا کہ دوسری مملکتوں کے مقابلے سے انھیں کوئی مدد نہیں ملتی تھی۔ انگلستان کی پارلیمنٹ کا ارتقا اگرچہ غیر مکمل تھا مگر پھر بھی طبقات کی ان جمعیتوں سے وہ بہت آگے بڑھی ہوئی تھی جو دوسرے ملکوں میں پائی جاتی تھیں۔

نیز کوئی امر اس سے زیادہ طبعی بھی نہیں ہو سکتا کہ اس تفرق کی کارروائی بے انتہا آہستگی کے ساتھ ہو، اور وہ ایک صدی سے زاید پر وسیع ہو جائے۔ کسی بڑی ملکی سلطنت میں ارتقا بہت سست رفتار اور دشوار ہوا کرتا ہے اور انگلستان کو اسکاٹلینڈ اور آئرلینڈ کے تعلق کی وجہ سے بھی دقت درپیش تھی۔ تعجب یہ نہیں ہے کہ اس تفرق کی تکمیل اس قدر سست کیوں ہوئی بلکہ تعجب یہ ہے کہ اس کا امکان ہی کیسے پیدا ہوا۔ تیرھویں صدی سے سولھویں صدی تک پارلیمنٹ موجود رہی مگر وہ حکومت ساز عضو نہیں تھی اور دوسرے ملکوں میں بھی صدیوں تک ایسی جمعیتیں موجود تھیں جو اصلاً و حقیقتاً اس سے مختلف نہیں تھیں اور انھوں نے بھی اس امر خاص میں ترقی نہیں کی۔

لیکن چونکہ انگلستان کی پارلیمنٹ، پارلیمنٹ کی مقدم ترین مثال ہے

اس لیے اس غرض پر کچھ وقت صرف کرنا خالی از منفعت نہیں معلوم ہوتا کہ نہ صرف اس پارلیمنٹ کے فرائض کے متعلق ایک صاف تصور قایم کیا جائے بلکہ اس کی تاریخ اور اس کے مدارج ارتقا کے متعلق بھی ایسا ہی صاف و صریح خیال قایم کیا جائے۔

گزشتہ خطبہ میں میں نے کسی قدر زحمت اٹھا کر ارتقا کے اس درجے کو بیان کیا تھا جو اٹھارھویں صدی کے آغاز میں پارلیمنٹ کو حاصل ہوا تھا اور اس سے قبل اس درجہ کو بیان کیا تھا جو خود ہمارے زمانے میں پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔ اب میں اس تاریخ کے خاکے کو اس طرح بھر دینا چاہتا ہوں کہ قدم بقدم اس کا پتہ چلاؤں کہ کن مدارج کو طے کر کے پارلیمنٹ اٹھارھویں صدی میں اپنی حالت پر پہنچی اور اس کے بعد پھر کن مزید مدارج سے ترقی کرتے ہوئے وہ اس حالت پر آگئی جس میں ہم اسے اس وقت دیکھتے ہیں۔ یہ تم سمجھ گئے ہوگے کہ میں مسلسل تاریخ کے بیان کرنے کی کوئی سعی نہیں کروں گا، بلکہ میں صرف اس پر قناعت کروں گا کہ مختلف دوروں کو واضح اور مختلف ہیئتوں کو ممیز کر دوں۔

سترھویں صدی میں پارلیمنٹ کا نشو و نما تاریخ انگلستان میں اس طرح پر سب سے مقدم جگہ لیئے ہوئے ہے کہ اس سے قبل کی جن تین صدیوں میں پارلیمنٹ موجود تھی، ان میں اسے کبھی یہ رتبہ نہیں حاصل ہوا تھا۔ سولھویں صدی میں ہم دیکھتے ہیں کہ پارلیمنٹ تاج کی مطیع و منقاد بنی ہوئی تھی۔ اس کے بعد جیمز اول کے عہد کے آخری حصے میں اسے کچھ زور حاصل ہو گیا اور اس نے جارحانہ انداز اختیار کیا۔ چارلس اول کے مقابلہ میں اس نے باغیانہ روش اختیار کی اور ایک جنگ برپا کر دی جس میں وہ کامیاب ثابت ہوئی مگر وہ خود اسی آن فوجی قوت سے مغلوب ہو گئی، ملک پر آمریت کا جوا رکھ دیا گیا تا آنکہ خود فوجی قوت اپنی باری میں اندرونی مناقشے سے ٹوٹ گئی۔ رجعت شاہی کے بعد پھر ایک مرتبہ بادشاہ اور پارلیمنٹ اسی طرح ایک دوسرے سے برو در رو ہوئے جس طرح خانہ جنگی کے شروع ہونے کے عین ما قبل تھے اور خانہ جنگی کا عہد تا حد امکان باطل و فراموش کر دیا گیا۔ مگر کچھ زمانے کے بعد چارلس کے دوسرے بیٹے اور پارلیمنٹ کے درمیان ایک دوسری کشمکش شروع ہوئی۔ یہ اس کشمکش سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی جس میں چارلس

تو وہ مبتلا ہو گیا تھا گو یہ اس سے مختصر اور اس سے کم مصیبت ناک تھی۔ سابق کشمکش کا خاتمہ اس طرح ہوا تھا کہ اول پارلیمنٹ کو کامل فتح حاصل ہوئی اور پھر اسے شکست نصیب ہوئی اور اطاعت کرنا پڑی مگر اس کے برخلاف یہ دوسری کشمکش جو زیادہ اعتدال کے ساتھ جاری کی گئی تھی اس کا انجام پارلیمنٹ کی پائدار و قطعی فتح پر ہوا۔

یہ وہ سطحی و سرسری واقعات ہیں جنھیں ہر شخص جانتا ہے اس طولانی معرکہ آرائی کا مجموعی نتیجہ جو کچھ ہوا وہ عام طور پر سمجھا نہیں گیا ہے گو میں مختصر طور پر اس مسئلہ کے متعلق پہلے ہی بحث کر چکا ہوں اب میں اس تحقیق کی طرف رجوع ہوتا ہوں کہ کن مدارج سے گزر کر اور کس طریق پر سترھویں صدی کی کشمکش سے یہ نتیجہ حاصل ہوا۔

پہلی کشمکش یعنی چارلس اول کے دور کی کشمکش میں ہم ایک دلیرانہ تجربے سے دوچار ہوتے ہیں، گو یہ تجربہ ایسا تھا کہ برضائے عام اس کا خاتمہ فی الجملہ ناکامی پر ہوا۔ پارلیمنٹ نے حکومتوں کے بنانے اور بگاڑنے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ بادشاہ کی نسبت فیصلہ کرنے بیٹھی، اس نے شاہی منصب کو منسوخ کر دیا اور نئی قسم کی حکومت قایم کی گو یہ تجربہ اس قدر مہلک طور پر ناقص ثابت ہوا کہ دوسری نسل میں تمام قوم نے اسے باطل قرار دیا اور اس وقت کی مروجہ رائے صرف یہی نہیں تھی کہ ایک غلط طریقہ اختیار کر لیا گیا تھا بلکہ فی الواقع ایک غلط مقصد کی پیروی کی گئی تھی اور پارلیمنٹ کو کسی جہت سے یہ ادعا نہ کرنا چاہیئے تھا کہ حکومت کا بنانا بگاڑنا اس کا کام ہے، مطلب یہ ہے کہ حکومت کو غیر ذمہ دار ہونا چاہیئے۔ لیکن دوسری کشمکش کے ذریعے سے اس ناکامی کی کسی قدر تلافی ہو گئی۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ہر نوع پارلیمنٹ حکومت کے بنانے، بگاڑنے کے کسی قدر اختیار کا ادعا کر سکتی ہے مگر صرف اس شرط کے ساتھ کہ اس طاقت سے مناسب اختیار کے ساتھ کام لیا جائے۔

پس اس حد تک یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی کشمکش کو صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ اس نے ایک سوال پیش کر دیا گو اس کا صحیح جواب معلوم کرنے میں وہ بالکلیہ ناکام رہی۔ کیا واقعی یہ کلی ناکامی تھی؟ کیا رجعت شاہی کے وقت پارلیمنٹ نے وہی حیثیت اختیار کی تھی جو اس تصادم کلی کے شروع ہونے کے وقت میں تھی اور اس

نے شاہانِ اسٹوارٹ کو ٹیوڈروں کے شہنشاہی کے تخت پر بٹھا دیا تھا۔ ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی ایسا خیال نہ کرنا چاہیئے۔

۱۶۶۰ء میں رجعت شاہی کے بعد جو نظم قایم کیا گیا وہ اس سے بالکل ہی مختلف تھا جو ۱۶۴۰ء میں طویل العہد پارلیمنٹ کے اجلاس کے قبل رائج تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی تاریخ کے متعلق جو خیال میکالے نے مقبول و مروج کر دیا ہے وہ رجعتِ شاہی کی اہمیت کو بہت گھٹا کر ظاہر کرتا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا بعض اعتبارات سے وہ انقلاب کی اہمیت کو بہت بڑھا کر ظاہر کرتا ہے، میں اس معاملے کو اس طرح سمجھتا ہوں کہ انقلاب کے وقت بلکہ رجعت شاہی کے وقت انگلستان کی ملوکیت اور اس کے نظمِ حکومت نے وہ شکل اختیار کی جو اٹھارھویں صدی میں مسلسل قائم رہی۔

میں ایسے بہت سے تغیرات بتا سکتا ہوں جو رجعتِ شاہی کے وقت سے شروع ہوتے ہیں، مگر جب ہماری تاریخ پر وسیع نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رجعتِ شاہی کی خصوصیت یہ چھوٹے چھوٹے تغیرات نہیں بلکہ ایک نہایت ہی اہم تغیر ہے وہ یہ کہ یہی وہ عہد ہے جس سے پارلیمنٹ کے دوام کی ابتدا ہوتی ہے۔

اس کے قبل کہ پارلیمنٹ ایک پرزور رکن حکومت عضو بن جاتی یہ ضروری تھا کہ ہمارے نظم سیاسیہ میں اسے ایک مقررہ دائمی حیثیت حاصل ہو جاتی رجعتِ شاہی کے وقت اسے یہی خصوصیت حاصل ہو گئی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسی میں وہ مستحکم و دیرپا نفع مضمر ہے جو قوم کو چارلس کے ساتھ جد و جہد کرنے سے حاصل ہوا تھا۔

یہ سچ ہے کہ اس سے بہت قبل کے عہد یعنی شاہانِ پلان ٹے جنٹ کے تحت میں پارلیمنٹ کو یہ خصوصیت حاصل ہو چکی تھی۔ پروفیسر اسٹبز تمہیں یہ بتائیں گے کہ چودھویں صدی میں پارلیمنٹ بالعموم ہر برس منعقد ہوا کرتی تھی اور اکثر سال میں ایک مرتبہ سے زائد بھی ہوتی تھی۔ لیکن اگر میں پارلیمنٹ کی ابتدائی صدیوں کی تحقیقات میں پڑوں تو میں بہت دور نکل جاؤں گا اور اس لیے میں صرف اتنا کہہ دینے پر قناعت کرتا ہوں کہ شاہانِ ٹیوڈر کے تحت میں یہ صورت باقی نہیں رہی تھی:

مثلاً ملکہ الزبتھ کے عہد میں پارلیمنٹ کے کاغذات کا لاحظہ کرو، یہ دریافت کرو کہ اس عہد میں پارلیمنٹ کتنی مرتبہ طلب کی گئی اور اس کی نشستوں کی مدت کتنی کتنی تھی۔ تم بالیقین یہ دیکھو گے کہ ان زمانوں کی پارلیمنٹ نہ صرف قوت میں کم تھی بلکہ ہمارے زمانے کی پارلیمنٹ سے اس کی بالکل ہی مختلف تنظیم تھی، اب پارلیمنٹ میں ایک دائمی وحدت ہے اور اس کی ایک مسلسل تاریخ ہے، یہ ایک زندہ شئے ہے۔ اور سیاسی طور پر کہا جائے تو اس حیثیت میں وہ انگلستان کی ہر ایک دوسری شئے سے اعلیٰ درجے پر ہے۔ یہ حالت اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ میں اکثر یہ شکایت کرتا ہوں کہ مؤرخوں کی نظر میں پارلیمنٹ ہر ایک دوسری شئے کو ماند کر دیتی ہے اور آج کل جس شئے کو انگلستان کی تاریخ کہتے ہیں وہ اکثر صرف پارلیمنٹ کی تاریخ ہوتی ہے۔

لیکن اب پارلیمنٹ ہر برس جمع ہوتی اور نصف سال نشست کرتی ہے۔ اب ملکہ الزبتھ کی پارلیمنٹ پر نظر کرو، میرا خیال ہے کہ پینتالیس برس کے عہد حکومت میں پارلیمنٹ تقریباً دس مرتبہ جمع ہوئی اور ہر مرتبہ اس کی نشست صرف ایک یا دو مہینے تک رہی۔ اس پینتالیس برس میں پارلیمنٹ کی نشست کا تمام زمانہ شاید ڈیڑھ برس کا تھا، اور ان مختصر و معدودے چند اجلاسوں کے درمیان تین تین چار چار برس کے وقفے ہوتے رہتے تھے۔

پس میں کہتا ہوں کہ اس قسم کی پارلیمنٹ کو "عضو مملکت" کے نام سے موسوم کرنا ہی دشوار ہے اس کی کوئی حکمت عملی، کوئی باقاعدہ طرز عمل کوئی مجتمعہ خصوصیت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس قسم کی جمعیت ہماری پارلیمنٹ سے اس درجہ مشابہ نہ تھی جس درجہ قدیم فرانسیسی شاہی کی مجلس طبقات سے مشابہ تھی، فرانس میں بھی کبھی کبھی مجلس طبقات کے اجلاس ہوا کرتے تھے اور یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ یہ جلسے غیر اہم ہوتے تھے، مگر یہ جلسے بہت طولانی وقفوں کے بعد ہوا کرتے تھے یعنی شاید ایک عہد میں ایک مرتبہ یا ایک صدی میں تین چار مرتبہ ہوتے تھے، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مجلس طبقات فرانسیسی دستور کا کوئی جزو تھے۔ فرانسیسی سیاسی زندگی کی معمولی رفتار میں ان "طبقات" کی کوئی جگہ نہیں تھی، اس کا فرض نہ خود حکمرانی کرنا تھا اور

نہ حکومت پر نگرانی رکھنا تھا، اس کی طلب غیر معمولی حالات میں ہوتی تھی یعنی جب کسی اساسی تغیر یا کسی نئی خرابی کے نئے تدارک کی ضرورت پڑتی تھی، اس وقت وہ طلب ہوتی تھی۔ جس طرح آخری مرتبہ ۱۷۸۹ء میں ہوا اسی طرح سابق کی صدیوں میں بھی ہوتا رہا تھا۔ اور جب سلطنت میں خلفشار پیدا ہو جاتا اور لوگ گھبرا جاتے تو اس وقت یہ مجلس طلب کی جاتی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ الیزبتھ کے عہد میں انگلستان کی پارلیمنٹ کا اجتماع فرانس کی "مجلس طبقات" سے زیادہ ہوتا تھا گر پھر بھی اتنی کثرت سے نہیں ہوتا تھا کہ پارلیمنٹ کو سلطنت کی معمولی کل کا ایک پرزہ سمجھنا بجا ہو۔ اب ہم اکثر یہ کہتے ہیں کہ انگلستان پر پارلیمنٹ حکومت کرتی ہے۔ ملکہ این کے زمانہ میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ ملکہ اور پارلیمنٹ دونوں مل کر انگلستان پر حکومت کرتی ہیں گر میرا خیال ہے کہ ملکہ الیزبتھ کے وقت میں انگلستان کی حکومت کے بیان میں پارلیمنٹ کا کسی قسم کا ذکر عادتاً نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ یہ کہ پارلیمنٹ بالکلیہ مطیع و منقاد تھی، بلکہ عام طور پر پارلیمنٹ کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا تھا

گیا کلیسا کی عبادت بھی ہمارے سامنے انگلستان کی یہی ہیئت پیش نہیں کرتی۔ کرینمر کی تالیف "لیتانیہ" (کتاب ادعیہ) میں ملک کے تمام ادارات پر دعاؤں کے سلسلے میں نظر ڈالی گئی ہے گر پارلیمنٹ جو آجکل ہماری نظر میں بے مثل اور اہم ترین تنظیم ہے اس کا ذکر تک نہیں ہے۔ کرینمر جب بادشاہ، خاندان شاہی امرا اور دوسرے ارکین مجلس شاہی، حکام اور تمام طبقۂ اعیان کے لئے دعا کر چکا تو اسے اطمینان ہو گیا، اگر خدا کی رحمت ان سب پر رہے تو بس کافی ہے اور چاہئے ہی کیا۔

اس میں شک نہیں کہ پارلیمنٹ کے لئے "جس زمانے میں وہ اپنا اجلاس کر رہی ہو" کتاب ادعیہ" میں ایک دعا موجود ہے گر یہاں بھی اس کے فرض کے بیان کرنے کے لئے جو الفاظ منتخب کئے گئے ہیں ان کا اطلاق زبانۂ حال کی پارلیمنٹ کے مانند کسی حکمراں یا حکومت ساز جماعت پر اس درجہ نہیں ہوتا جس درجہ کسی ایسی مجلس ترکیبی پر ہوتا ہے جو غیر معمولی حالت میں اساسی تغیرات کے لئے جمع کی گئی ہو،

اس دعا کے الفاظ یہ ہیں کہ "ان کی کوششوں سے تمام امور کا نظم و قرار بہتریں و قوی ترین بنیادوں پر ہو جائے"

جب ہم اس قدیم صورت حال کو سمجھ لیتے ہیں اور پھر اس کے بعد رجعت شاہی کے دور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو پھر (میرا خیال ہے کہ) ہم ایک لمحہ میں یہ دیکھ لیتے ہیں کہ چارلس اور پارلیمنٹ کی کشمکش سے کیا نتیجہ نکلا تھا۔ پارلیمنٹ کا یہ بلند حوصلہ تجربہ ناکام ہو گیا کہ وہ بغیر کسی پردے کے صاف، صاف حکومت ساز عضو بن جائے گر ایک بہت بڑا قدم اٹھا دیا گیا تھا۔ پارلیمنٹ اس وقت حکومت ساز عضو نہیں بن گئی گر اس وقت سے وہ فی الحقیقت ایک عضو ضرور ہو گئی۔ سترھویں صدی کے وسطی دور کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت دونوں طویل العہد پارلیمنٹیں ہیں۔ پہلے "عہد بغاوت" کی طویل العہد پارلیمنٹ کا زمانہ آیا، جس نے کرامویل کے ہاتھوں منتشر ہونے کے قبل تیرہ برس نشست کی اور "محمیت" کے زوال کے بعد پھر مجتمع ہو گئی اس کے بعد زمانۂ رجعت کی طویل العہد پارلیمنٹ کا دور آیا، جس نے سترہ برس نشست کی، اگرچہ اس دوران میں اسے بعض طولانی التوا سے بھی سابقہ پڑا۔

اس زمانے کا سب سے بڑا مطمح نظر یہ تھا کہ پارلیمنٹ کو دوام و استحکام حاصل ہو جائے، اس تخیل کو ان کاہل پسند اور قبل از وقت کے خوابوں سے صاف طور پر ممیز رکھنا چاہیے جو گاہ بگاہ نظر آ جاتے ہیں۔ ایک دمدار ستارہ کے مانند ہونے کے بجائے جو کبھی کبھی شاذ و نادر سیاسی آسمان کو قطع کر جاتا ہو، پارلیمنٹ اب گویا ثوابت کے زمرے میں آنا چاہتی تھی، اس نے خود اپنے دوام کے اعلان سے اس کا آغاز کیا، اور رجعت شاہی کے بعد اس کی کارروائیوں میں سے ایک کارروائی یہ تھی کہ اس نے قانونِ سہ سالہ منظور کیا، جس کا مقصود یہ تھا کہ قدیم نظم کی تجدید کا امکان باقی نہ رہے اور بادشاہ کو مدتہائے دراز تک پارلیمنٹ کے بغیر کام چلانے کی کوشش سے روکا جائے۔ اس قانون کے مطابق جو خاص انتظام کیا گیا تھا وہ اگرچہ رائج نہیں ہوا مگر جو تخیل اس کی تحریک کا باعث ہوا تھا وہ رائج ہو گیا "عہدِ رجعتِ شاہی" کی طویل العہد پارلیمنٹ نے "عہدِ بغاوت" کی طویل العہد

پارلیمنٹ کی تقلید اور حسب حال اس کی توثیق بھی کی، اس کے بعد سے انگلستان کے اداراتمیں پارلیمنٹ کو بھی دوام حاصل ہوگیا اور اگرچہ چارلس دوم کے آخری برسوں اور جیمز دوم کے عہد میں (جو ایک غیر معمولی و انقلابی دور تھا) کچھ وقفہ پڑا مگر اس وقت سے پارلیمنٹ برابر قایم ہے۔

لیکن ہر چند کہ "عہد رجعت" کی یہ پارلیمنٹ قوت و استقامت میں ملکہ الیزبتھ کی پارلیمنٹ سے وہی نسبت رکھتی تھی جو ایک جوان شخص کو ایک بچے سے ہوتی ہے پھر بھی یہ اس ناکامی کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی جس کے باعث فوج کا جوا اس کے کاندھوں پہ رکھدیا گیا، اور وہ مجبور ہوگئی تھی کہ وہ ایک مرتبہ پھر شاہی کے قدموں پر اپنا عجز و انکسار ظاہر کرے، اس کے بعد ایک دوسرا انقلابی دور شروع ہوا جو ۱۶۷۸ء سے ۱۶۸۸ء تک دس برس پر محتوی تھا، یہ ملوکیت کے ساتھ دوسری کشمکش تھی اور جب تک چارلس دوم زندہ رہا اس کشمکش میں ملوکیت کا پلہ بھاری رہا مگر بعد میں جیمز دوم کی خود رائی کی وجہ سے پارلیمنٹ نے فتح پائی اور اس فتح نے ایک بڑی حد تک سابقہ شکست کی یاد کو محو کر دیا۔ ۱۶۸۸ء کے انقلاب کے وقت نظم انگلستان اس نقطہ پہ پہنچ گیا جو دستوری ارتقا کا فیروزمندانہ انجام و اختتام معلوم ہوتا ہے، حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کے بعد کا تمام ارتقا محض تدریجی اور سہل طور پر ہوا ہے اور تاریخ کا رخ نئے انقلابات سے خراب نہیں ہوا بلکہ ہمارے قانون دستوری پر مستقل سے کوئی بدیہی اثر پڑا کہ جیسا میں ظاہر کر چکا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید نظم اگرچہ اس نظم سے بالکل ہی مختلف ہے جو انقلاب کے وقت میں قایم ہوا تھا، لیکن اس کے بعد جو کچھ تغیرات ہوئے ہیں، وہ بغیر کسی صریحی قانون سازی کے عمل میں آئے ہیں یہ امکان تھا کہ بغیر وضع قوانین انقلاب کے بعد کے دور میں مملکت انگلستان ایک ایسی مملکت بن گئی جسے محدود بادشاہی کہتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے، بادشاہ دستوری موانع کا تابع ہوگیا یعنی بعض امور ایسے قرار پاگئے جنھیں وہ نہیں کر سکتا۔ قانونی نقطۂ نظر سے سوال یہ ہوگا کہ شاہی امتیاز خاص کے یہ تحدیدات کیا ہیں؟ مگر ہمارے نقطۂ نظر سے سوال یہ ہوگا کہ یہ موانع اپنا عمل کیونکر کرتے ہیں، بالفاظ دیگر یہ کہ بادشاہ اگر ان حدود سے تجاوز کر جائے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟

جواب یہ ہے کہ وہی سلوک کیا جائے گا جو ۱۶۸۸ء میں کیا گیا تھا۔ مختصر اً یہ کہ پارلیمنٹ اسے معزول کر دیگی اور دوسرے کو بادشاہ بنا دے گی۔ بس پارلیمنٹ جو چارلس کے کشمکش کے نتیجہ کے طور پر مستحکم اور دایمی ہو گئی تھی، ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے وہ مذکورۂ بالا حد تک حکومت ساز عضو بن گئی۔

اس کی وجہ سے ایک توازن قرار گرفتہ کی کیفیت پیدا ہوئی جو عرصۂ دراز تک رہی۔ بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان ایک غایت درجہ سہولت کا مناسب طریق کار قایم ہو گیا تھا۔ یہ طریق دونوں فریق کا پسندیدہ تھا، اس سے سکون عامہ کا تیقن ہو گیا اور یہ اس قدر مقبول عام ہو گیا کہ بعد کے زمانہ میں جب مزید تغیرات کی ضرورت لاحق ہوئی تو رولج یہ ہو گیا کہ ان تغیرات کو حیل قانونی کے ذریعہ سے چھپایا جائے، چنانچہ اس موجودہ زمانہ تک ہم نے یہ یقین ترک نہیں کیا ہے کہ ہم انقلاب والے نظم کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں حالانکہ فی الحقیقت وہ نظم معلوم نہیں کتنے پیچھے رہ گیا ہے۔

میں نے حکومت بذریعہ وزیر کے اس جدید نظم کا بیان کیا ہے جو اس مذکورۂ بالا نظم کی جگہ قایم ہو گیا ہے۔ یہ کس طرح سے ترقی پاکر اس درجے تک پہنچا اس کا حال میں آئندہ خطبے میں درجہ بدرجہ بیان کروں گا۔ اس اثنا میں اس طریقے کے متعلق کچھ کہوں گا جس کے بموجب درمیانی نظم یعنی محدود شاہی یا محدود پارلیمنٹی اقتدار کا نظم عملاً اپنا کام کرتا رہا ہے۔

کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ قدیم شاہی کو اپنے امتیاز خاص کی بنا پر حکمرانی کرنے میں جب ناکامی ہوئی تو اس نے حکومت بذریعہ اثر کے نظم کو اختیار کیا اور یہ نظم کچھ زمانے تک کامیابی سے چلتا رہا مگر یہ کتابیں اس نظم کے مبداء و آغاز کو کسی قدر مبہم چھوڑ دیتی ہیں۔ یہ مسلمہ ہے کہ اس نظم کو جارج سوم کے زمانے میں بہت نمود حاصل تھی، اس عہد میں اس جانب توجہ مبذول ہوئی، اس کا نام رکھا گیا، اس کی توضیح کی گئی، اس کا تجربہ کیا گیا اور پھر اسے مردود قرار دیا گیا؛ مگر یہ یقینی ہے کہ یہ نظم اس سے بہت پہلے سے رائج تھا، اور یہ خیال یہ ہے کہ رجعت شاہی کے بعد ہی سے یہ نظم قایم ہو گیا تھا اس میں بس اتنی ہی دیر لگی کہ اس واقعہ (یعنی رجعت شاہی)

کے لازمی نتائج سمجھ میں آجائیں میں کہہ چکا ہوں کہ رجعت شاہی کے وقت ہی میں یہ ہوا کہ پارلیمنٹ انگریزی سلطنت کا ایک دائمی و قرار یافتہ عضو بن چلی۔ اب میں اس پر یہ اضافہ کرتا ہوں کہ اثر، محض وہ نیا اوزار تھا، جس سے بادشاہ اس تغیر یافتہ صورت حالات میں کام لے سکتا تھا۔ پارلیمنٹ جب تک ہنگامی جمعیت رہی، اس وقت تک بادشاہ اپنے امتیاز خاص کو استعمال کرتا رہا مگر جب پارلیمنٹ نے وہ قوت حاصل کر لی جو دوام سے پیدا ہوتی ہے تو پھر بادشاہ بالطبع اثر سے کام لینے پر مائل ہو گیا۔

"اثر" ان تمام مختلف ذرائع ترغیب کا نام ہے، جنھیں بادشاہ اپنی عظمت، اپنی شان و شوکت، اپنی دولت اور اپنی سرپرستی کی بنا پر افراد کے متعلق کام میں لا سکتا ہے۔ یہ اثر اسی وقت اپنا کرشمہ دکھا سکتا ہے، جب کوئی فرد واحد اس کی دسترس تک پہنچ جائے یا اس سے چھو جائے، اب جب کہ پارلیمنٹ دائمی ہو گئی تو بادشاہ کو اس کا معاوضہ یہ ملا کہ پارلیمنٹ بھی اس کی دسترس کے اندر آ گئی اور اس طرح وہ بھی اس کے اثر کے تابع ہو گئی۔ مفصلات کے وہ شرفا و امرا جو سابقہ دور ہائے حکومت میں زیادہ تر مفصلات میں رہتے اور صرف چوتھے پانچویں برس دو ایک مہینے کے لئے پارلیمنٹ کی شرکت کے لئے آ جاتے تھے وہ اب سال کے ایک حصے کے لئے لندن کے مستقل باشندے ہو چلے، اس طرح وہ دربار کے جوار میں آ گئے اور چارلس دوم کو یہ موقع مل گیا کہ وہ انگلستان میں اس تجربہ کی آزمائش کرے جو اس حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ رود بار انگلستان کی دوسری جانب اس کے بھائی لوئی چہار دہم کے ہاتھوں کامیاب ہو رہا تھا۔ وہ تجربہ یہ تھا کہ حکمراں اعیانی طبقہ کو درباری بنا لیا جائے۔ پس چارلس دوم کے تحت میں دربار کو سابق سے زیادہ نمود حاصل ہو گیا۔ دربار کے محاسن و معائب بادشاہ کے انداز و اطوار اور دلفریبی گفتار اس عہد کے مورخوں کے بہت پسندیدہ مبحث ہیں۔

اثر مبتذل ہو کر رشوت بن جاتا ہے، جارج سوم کے عہد میں مصلحین کی بہت بڑی شکایت یہ تھی کہ بادشاہ کے ہاتھ میں اس قدر دولت کا اختیار، اس قدر عہدوں کا تقرر اس قدر وظائف کا عطا کرنا ہے کہ (بالفاظ برنتھم) وہ کل

قوم کے لئے ایک طرح کا صدر "مخرّب" بن جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے میں اُس استبدادی اصلاح کے واسطے اس طرح کا بہت شور وغوغا برپا تھا جو بادشاہ کی رشوت دہی کے سرمائے کو کم کر دے۔ یہ سوال اکثر زیر بحث آیا ہے کہ پارلیمنٹ کے ارکان کو کب سے رشوت دینا شروع کیا گیا؟ یہ صاف ظاہر ہے کہ جارج سوم کے عہد میں اس کا آغاز نہیں ہوا کیونکہ والپول کے زمانے میں بھی رشوت دہی کے خلاف اسی قدر شور بلند تھا، گو یہ بھی اتنا ہی صاف ظاہر ہے کہ والپول کے زمانے میں بھی اس کا آغاز نہیں ہوا کیونکہ ولیم سوم کے عہد میں نہ صرف اس کے خلاف شور برپا تھا بلکہ خاص مضر اثر ـــــ کے خلاف ایک پُرزور اور باقاعدہ فریقانہ تحریک موجود تھی۔ جس شورانگیزی کے نتیجہ کے طور پر "قانون منصب داراں" (Place Bill) اور "قانون سہ سالہ" وجود میں آئے وہ شورانگیزی اسی مشاہدہ سے پیدا ہوئی کہ پارلیمنٹ کے ارکان مغلوب کن اثر سے دبے ہوئے تھے اور کسی حلقۂ انتخاب کو یہ امید نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کا نمائندہ جسے وظیفہ و منصب کا طعمہ پیش کیا جا رہا ہو، زیادہ دنوں تک ایمانداری کے ساتھ اپنے حلقے کی خدمت کرے گا۔ اس طرح ہم انقلاب تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ انقلاب نے یہ عیب نہیں پیدا کیا تھا اور جب ہم اس کے دوسری طرف نظر دوڑاتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رجعت شاہی کی طویل العہد پارلیمنٹ رشوت خواری میں اس درجہ مبتلا تھی کہ وہ "وظیفہ خوار پارلیمنٹ" کہلاتی تھی اور ایک روایت میں تو یہ کہا گیا ہے کہ پہلا وزیر جس نے پارلیمنٹ کے ارکان کو رشوت دی وہ کلیفرڈ تھا۔ جو "کابال" نامی وزارت میں مالیات کا انتظام کرتا تھا۔

اب "کابال" کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پہلی وزارت تھی جس نے ارادۃً خود کو اس جدید صورت حالات کے موزوں بنا لیا جو رجعت شاہی سے پیدا ہوئی تھی کیونکہ چارلس کے پہلے وزیر کلیرنڈن نے کوئی جدت نہیں کی تھی بلکہ وہ محض پرانے متروک طریق پر ہی چلا ہوا تھا۔

اور اس طرح تم یہ دیکھتے ہو کہ تاریخی طور پر حکومت بذریعہ اثر کا آغاز اسی وقت سے ہوا جب سے پارلیمنٹ کو دوام حاصل ہونے لگا۔

بادشاہ پر پارلیمنٹ کی محدود نگرانی اور پارلیمنٹ پر بادشاہ کا خفیہ اثر یہی وہ دو چیزیں ہیں جنھیں ایک ساتھ ملاکر رکھنے سے ہمیں انگریزی دستور مملکت کی اٹھارھویں صدی کی ہیئت کا تصور حاصل ہوتا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ اس کی بنیاد رجعت شاہی کے زمانے میں پڑی، اس وقت پارلیمنٹ دائمی ہوگئی اور پھر شاہی نے اس نئی صورت کی اہمیت کو بتدریج معلوم کر کے اس کا مقابلہ اثر کے جدید و بے خطا اسلحہ سے کیا۔ چارلس دوم کا عہد بعض اجزا میں اٹھارھویں صدی کے عہد سے بہت مشابہ ہے مگر یہ نظم مستحکم طور پر اس وقت تک نہیں قایم ہوا جب تک کہ وہ ۱۶۸۸ء کی آتشیں آزمائش سے نہ گزر گیا۔ جسے ہم انقلاب کہتے ہیں وہ درحقیقت ایک دوسرے انقلاب کا سدراہ ہوا تھا۔ اس نے اتنے جدید امور جاری نہیں کیے جتنا ان امور کو جو پہلے جاری ہو چکے تھے، مصدق کر دیا اور انھیں ہیبت ناک تباہی سے بچا لیا۔ جب یہ طوفان ایک مرتبہ فرو ہوا تو پھر جہاز بندرگاہ کی طرف روانی کے ساتھ چل نکلا۔ دستوری سکون کا ایک طولانی دور شروع ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں نے جو نظم بنایا ہے اسے مکمل سمجھنے سے وہ کبھی اکتاتے نہیں اور ساتھ ہی یہ نظم اردگرد کی قوموں کے لیے مایۂ حسد بھی تھا۔ درحقیقت یہ دیکھنا بہت ہی تعجب خیز معلوم ہوتا تھا کہ اتنی آزادی ہو اور پھر اس قدر کم شور و شر۔ تجارت کو روز افزوں نشو و نما ہوتا جا رہا تھا، فوجی قوت حاوی و غالب تھی، تمام قوموں میں یہی قوم سب کی مقدمۃ الجیش تھی اور پھر یہ سب کچھ ایسے انتظام و اطمینان اور قدیم اشکال اور عزیز الوقت ادارات کو اس سہولت و خوشگواری کے ساتھ برقرار رکھتے ہوئے عمل میں آ رہا تھا کہ باید و شاید۔

بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان جس طرح عمل و رد عمل واقع ہوتا تھا، جانبین ایک دوسرے کے ساتھ جس اعتدال کا برتاؤ کرتے تھے، اور دونوں اپنے اپنے نافذ کردہ اختیار کو جس فکر و کاوش سے پوشیدہ رکھتے تھے، یہ راز انھیں باتوں میں مضمر تھا۔ پارلیمنٹ نے بادشاہ کے نصب و عزل کا ہیبتناک دعوے کیا تھا اور اس پر عمل بھی کر کے دکھا دیا تھا۔ بادشاہ نے یقیناً اس سبق کو دل میں جگہ دی،

پھر بھی پارلیمنٹ اس سے بہت بعید تھی کہ وہ ظاہراً اس اختیار پر قائم رہنے کا دعویٰ کرتی بلکہ اس کے برخلاف اس نے بشدت تمام یہ ظاہر کیا اور بہت زحمت اٹھا کر یہ ثابت کیا کہ نہ اس نے اس قسم کے اختیار پر کبھی عمل کیا ہے اور نہ اسے عمل میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ کہا یہ گیا کہ بادشاہ معزول نہیں کیا گیا بلکہ اسنے خود تخت وتاج ترک کیا تھا۔ اگر ۱۶۸۸ء کی کارروائیوں میں کچھ بے ضابطگی ہوئی تھی تو انھیں نظیر بنانا مقصود نہیں تھا اور پارلیمنٹ کو ان سے کوئی نیا حق حاصل نہیں ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ پارلیمنٹ نے حفاظت خود اختیاری کے اصول کی پیروی کی اور وہ اس انتہائی اختیار کو کام میں لائی جو صرف انتہائی حالت میں ہر ایک ذی حیات کو حاصل ہے۔ اس اعتدال پسندی میں کوئی شائبہ ریاکاری کا نہیں تھا کیونکہ ہم اس واقعہ سے یہ دیکھتے ہیں کہ انقلاب کی کامیابی نے بغاوت کی بدنامی کو رفع نہیں کر دیا۔ ملک میں جو کچھ جمہوری احساس موجود تھا وہ فنا ہو گیا، کلیسا کو قوت حاصل ہو گئی اور انحراف خاص کر سیاسی انحراف کی قوت باطل ہو گئی۔ ملک اس صدی میں مسلسل استحکام کے ساتھ ادارۂ شاہی کا طرفدار رہا، اور جارج سوم کے عہد میں، ہیوم کے مانند نہایت ہی باثر ارباب قلم سترھویں صدی کے اختلاف آرا کے متعلق ٹوریوں کے خیال کی جانب مائل ہو گئے۔

دوسری جانب بادشاہ نے بھی پارلیمنٹ کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اسی قسم کا اعتدال دکھایا۔ یہ معلوم ہوگا کہ اس نے دیدہ ودانستہ یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ اپنے اصلی اختیار کو بہترین طور پر اسی طرح محفوظ رکھ سکتا ہے کہ وہ عام نظروں سے کسی قدر اوجھل ہو جائے، وہ اس امر سے آگاہ ہو گیا کہ اپنی شان وشوکت یا اپنی دولت اور اپنی سرپرستی اور قوم کی کمال وفاداری واحترام کی وجہ سے اس کے پاس ایک ایسے بالواسطہ زور واثر کا ذخیرہ موجود ہے جس سے اگر عمدگی سے کام لیا گیا تو وہ صدیوں تک چلتا رہے گا مگر اسے دانائی کے ساتھ کام میں لانے کے لئے بادشاہ کو کنارہ کشی اختیار کرنا چاہئے۔ جہاں تک ممکن ہو پارلیمنٹ کی مخالفت کا اظہار کم ہو بلکہ اسے یہ کوشش کرنا چاہئے کہ اپنے افعال کی ذمہ داری پارلیمنٹ پر ڈال دے۔ اسے پارلیمنٹ کا انتظام کرنا چاہئے مگر پارلیمنٹ کے اس

انتظام میں بھی خود بادشاہ کو نہیں بلکہ وزرا کو نمایاں ہونا چاہیئے۔ اس وقت تک یہ اندیشہ نہیں پیدا ہوا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب وزرا خود بادشاہ کا اختیار غصب کر لینگے اب اس زمانہ میں وزیر بادشاہ کی زبان سے بولتا ہے، ہم جب یہ کہتے ہیں کہ ملکہ کی یہ مرضی ہے یا ملکہ نے یہ طے کیا ہے، تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ وزیر کی یہ مرضی ہے یا وزیر نے یہ طے کیا ہے گر اُن دنوں میں بادشاہ وزیر کی زبان سے بولا کرتا تھا یا یوں کہیئے کہ چاہتا تو بول سکتا تھا، لیکن بادشاہ اور وزیر کے تعلق کی نسبت میں آیندہ خطبہ میں زیادہ وسعت کے ساتھ گفتگو کروں گا۔

ہم اب یہ کہتے ہیں کہ بادشاہ صاحب تاج و تخت ہے گر وہ کار جہانبانی نہیں کرتا، اس موجودہ صدی میں بتدریج ایسا ہی ہو گیا ہے گر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب والی بادشاہی کی تجویز یا اس کا منشا اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا مفہوم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صاحب تاج و تخت بنے بغیر کار فرمائی کرنا چاہتی تھی یعنی وہ اقتدار و اختیار کی اصل کو قایم رکھنے میں اس کے ظواہر کو ترک کر دینا چاہتی تھی۔ یہ کام وہ اس وقت تک وزرا کے توسط سے کر سکتی تھی جب تک کہ وزیر فی الواقع بادشاہ کا وزیر رہا اور اٹھارھویں صدی کے بیشتر حصے میں ایسا ہی تھا اور اس سے تمھیں یہ اشارہ ملے گا کہ شاہی حق امجاع کی مشہور و ستنکش کو (جس کا آغاز ولیم سوم کے عہد سے ہوا) تمھیں کس نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ اسے عام طور پر شاہی اقتدار کے زوال کا نشان قرار دیا جاتا ہے۔ میں اس خیال سے بالکل اختلاف کرتا ہوں؛ اس کے برعکس مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ بادشاہ کو اپنے اختیار کا ادراک و احساس تھا گر اس کے ساتھ ہی اس کا میلان یہ تھا کہ وہ اپنے اختیار کو چھپائے رکھے۔ لارڈ نارتھ کے نام ایک خط میں جارج سوم نے صاف یہ کہا ہے کہ اگرچہ وہ واقعاً کبھی اس پر رضامند نہ ہوگا کہ تاج کے حق اختلاف سے دست بردار ہو جائے گر اسے امید ہے کہ کبھی اس حد تک نوبت نہ آئے گی کہ اسے اس اختیار کے استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔ بات بالکل یہی ہے۔ حق امجاع کا استعمال اس

وجہ سے ترک نہیں ہو گیا کہ بادشاہ کو اسے قایم رکھنے کی قدرت نہیں تھی بلکہ وہ ترک اس وجہ سے ہوا کہ اتنی قوت حاصل تھی کہ اس کے بغیر ہی کام چلا سکتا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے بادشاہوں کا اندازہ یہ تھا کہ جب تک خود ان کے وزرا دونوں ایوانوں کی کارروائیوں کی سربراہی کر رہے ہیں اور جب تک دونوں ایوان ایسے درباریوں سے بھرے ہوئے ہیں جنھیں رضاداری اور تمنائے اعزاز و ترقی کی وجہ سے بادشاہ کی نظر عنایت کے حاصل کرنے کا اشتیاق ہے اس وقت تک ان بادشاہوں کے پاس کافی و وافی ذرایع ایسے موجود ہیں جن سے وہ ہر ایک ایسی کارروائی کو جو ان کے پسند خاطر نہ ہو شکست دے سکیں اور حق امتناع کے ایسے ناگوار اختیار کے استعمال کی نوبت ہی نہ آنے دیں کیونکہ اس حق کے استعمال کی وجہ سے بادشاہ کو اس پردے سے نکلنا پڑے گا جس کے پیچھے چھپا رہنا اس دور میں اس نے مناسب سمجھا تھا۔

پس بادشاہ اور پارلیمنٹ کے باہمی انتظام کی کیفیت یہ تھی جو بیان ہوئی۔ اس انتظام کی نسبت اندازہ یہ کیا گیا تھا کہ وہ بہت اچھی طرح کام دے گا اور بہت دنوں تک برقرار رہے گا گر بہ نسبت نظریہ کے عمل میں یہ زیادہ قابل قدر ثابت ہوا۔ جس انقلاب نے ایسی خوشگوار قرارداد کی رہبری کی ہو مجرد اصولوں سے اس کی تشریح کرنا اور اسے بجا ثابت کرنا ہمیشہ دشوار رہا ہے اور یہی وہ خاص وجہ ہے جس کے باعث میں اس مقام پر اس کے متعلق خاص توجہ کردوں۔ مجھے یہاں نظریہ سے بحث ہے اور جب میں یہ قرار دیتا ہوں کہ پارلیمنٹ کا وجود حکومت کی تخلیق و بربادی کے لئے ہے تو مجھے یہ بتانا پڑتا ہے کہ کیوں کامیاب ترین پارلیمنٹی نظموں میں سے ایک نے پارلیمنٹ کے لئے اس قسم کے تمام دعاوی کو ترک کر دیا۔ میں نے اس کی تشریح یہ قرار دے کر کی ہے کہ جسم سیاسی کے اعضا آہستگی اور تدریج کے ساتھ ترقی کرتے ہیں اور یہ کہ انقلاب کے وقت حکومت ساز عضو دفعۃً پختگی کو نہیں پہنچ گیا بلکہ صرف

اتنا ہوا کہ اِس نازک حالت میں ایک قدیمی ادارہ حکومت، ساز عضوی کی نوعیت اختیار کرنے لگا اور اِس نے بالطبع یہ کوشش کی کہ اِس اغتصاب کو مغلق غیر تشفی بخش دلایل سے پوشیدہ کرے۔

خطبۂ چہارم

"عہد رجعت شاہی" کی پارلیمنٹ کو میں نے اس حیثیت سے ظاہر کیا ہے کہ وہ ایک نیم ترقی یافتہ حکومت ساز عضو تھی اور اس کا مقابلہ خود اپنے زمانہ کی پارلیمنٹ سے کیا ہے جو پوری ترقی یافتہ ہے، لیکن یہ بیان اس وقت تک قابل اطمینان نہ ہوگا جب تک کہ میں اس نمایاں فرق پر بھی لحاظ نہ کروں جو ایک دوسرے اعتبار سے ان دونوں میں موجود ہے۔ زمانۂ حالیہ کی پارلیمنٹ میں صرف یہی نہیں کہ اس نے اٹھارھویں صدی کی پارلیمنٹ کی بہ نسبت زیادہ کامل نشو نما حاصل کرلی ہے بلکہ اس کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ اس نے نگرانی کے اختیار کو ایک دوسرے امر کی طرف موڑ دیا ہے۔ انقلاب کے زمانے میں وہ بادشاہ سے دست و گریباں تھی اب وہ اس کی بجائے وزیر سے دست و گریباں رہتی ہے۔

انقلاب کے وقت پارلیمنٹ نے جس طرح ڈرتے ڈرتے اور رک رک کر یہ دعوے کیا تھا کہ اسے حکومت کے بنانے اور بگاڑنے کا حق حاصل ہے اس کے متعلق میں اپنا خیال ظاہر کر چکا اور یہ قرار دے چکا ہوں کہ یہ تذبذب صرف غیر مکمل نشو و نما کا فطری نشان امتیاز تھا۔ پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہمیں کیا توقع کرنا چاہیے؟ یقیناً یہ کہ نشو و نما میں جس قدر ترقی ہوتی جائے گی اسی قدر یہ تذبذب ناپدید ہوتا جائے گا۔ اگر انقلاب کے وقت اس سے زیادہ کسی بات کا دعوے نہیں کیا گیا کہ حفاظت خود اختیاری کے استحقاق کی وجہ

سے پارلیمنٹ بادشاہ کو معزول کرنے میں حق بجانب ہے (اور یہ حفاظت خود اختیاری کا استحقاق ایسا ہے جو تقریباً ہر امر کو بجا ثابت کر سکتا ہے) تو یہ پیش گوئی کی جا سکتی تھی کہ جس قدر وقت گزرتا جائے گا اور اس ابتدائی دلیرانہ تجربے کے اچھے اثرات ظاہر ہوتے جائینگے، یعنی جب بادشاہ زیادہ معتدل لہجہ اختیار کرنے لگے گا، اور پارلیمنٹ کا طرز عمل پہلے سے زیادہ خود داری کا مظہر ہو جائے گا اس وقت پارلیمنٹ کے نظریے اور عمل، دونوں میں زیادہ قطعیت آجائے گی۔ اتنے بہت سے تعرضات کے باوجود کہ انقلاب کو کبھی نظیر نہیں سمجھا جائے گا، انقلاب ایک نظیر سمجھا جانے لگے گا۔ یہ حجت پیدا کی جائے گی کہ پارلیمنٹ جس اختیار کو انتہا پر پہنچ کر استعمال کر سکتی ہے، اسے وہ صریحاً اس غرض سے بھی استعمال کر سکتی ہے کہ انتہائی نوبت آنے ہی نہ پائے۔ مختصراً یہ کہ منصب شاہی عملاً انتخابی ہو جائے۔ پس ہمیں یہ دیکھنے کا متوقع رہنا چاہئے تھا کہ اٹھارھویں صدی میں شاہی اختیار بتدریج گھٹتا جائیگا یہاں تک کہ صدی کے آخر تک یہ منصب محض ایک مختصر المیعاد شاید سالانہ صدارت ہو کر رہ جائے گا، جیسا کہ روما کی شاہی کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ گھٹتے گھٹتے قنصلیت کی حد تک پہنچ گئی۔

لیکن یہ صورت واقع نہیں ہوئی۔ سترھویں صدی میں جو موج بلند ہوتی جارہی تھی اور جو بادشاہی کے خلاف بڑھی اور گھٹی اور پھر بڑھی، اب اس نے اپنا رخ بدل دیا۔ انقلاب کے وقت جس حکومت ساز قوت کے نظریہ کا خاکہ ڈرتے ڈرتے کھینچا گیا تھا، اسے آگے نشو ونما نہیں دی گئی بلکہ طاق نسیان پر رکھ دیا گیا۔ شاہی پر بہ حیثیت ایک ادارے کے اب مزید حملے نہیں ہوئے۔ اسے اس کے جملہ اختیارات پر قابض چھوڑ دیا گیا، گر سترھویں صدی کے طوفان خیز تحریکات میں جس نتیجے کے حصول کی کوشش کی گئی تھی اسے آہستہ آہستہ پیچ در پیچ طریقے سے حاصل کیا گیا۔ سیاسی تاریخ میں شاید ہی کچھ باب اس ارتقا سے زیادہ تعجب انگیز ہوں کہ ایک پوری قوم ایک پوری صدی کے اندر ایک مشرح ومبسوط اور نازک تجویز پر عمل کرتی نظر آئے اور پھر یہ ظاہر کرنا دشوار ہو کہ کوئی تجویز قایم کی گئی تھی، یا یہ کہ اٹھارھویں صدی میں کسی نسل نے پہلے سے یہ دیکھ لیا ہو کہ انیسویں صدی

کے لئے وہ کونسا نظم تیار کر رہی ہے۔ یہ ارتقا اس قدر تدریجی اور ہر ہر قدم پر اس قدر قانونی سے اسدرجہ مستور تھا کہ (میرا خیال ہے) کہ اب بھی وہ کسی نہج سے صاف طور پر سمجھ میں نہیں آتا۔

میرا گمان یہ ہے کہ لوگوں پر عام اثر محض یہ ہے کہ انقلاب کے وقت ایک نادر تدبیر اختیار کی گئی۔ حق خداداد اور اطاعت عاطلانہ سے متعلق تعصبات نے قوم کی عقل کو چکر میں ڈال دیا تھا۔ پس بعض روشن خیال مدبروں کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک ایسے مسئلہ کو جو عوام کی فہم و ادراک کے لئے زاید از ضرورت دقیق ہے برطرف کر دیں اور انھوں نے یہ تدبیر نکالی کہ تمام مباحث میں بادشاہ کے نام کے بجائے وزیر کا نام رکھ دیا جائے۔ انھوں نے یوں کہا کہ ہم یہ تسلیم کر لیں گے کہ بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا ہم تسلیم کر لیں گے کہ بادشاہ غیر ذمہ دار ہے بشرطیکہ یہ اجازت ہو کہ بادشاہ کے ہر ایک حکم پر ایک وزیر کے دستخط بھی ثبت ہونگے اور وہ وزیر ذمہ دار ہوگا۔ اس طرح شاہی اپنے تمام پراسرار دعاوی میں ملبوس الگ بیٹھی رہی، اور اس کے بجائے ایک سیدھی سادی وزارت قایم ہوئی جس سے پارلیمنٹ آزادانہ معاملت کر سکتی تھی، اور اس طرح یہ گمان کیا جاتا ہے کہ اگرچہ انقلاب کے وقت بادشاہ کے تمام نظریاتی دعاوی اس کے قبضے میں رہنے دئے گئے مگر ان دعاوی سے تمام واقعی معانی سلب کر لئے گئے اور اس لئے اگرچہ نظریاتی طور پر اٹھارھویں صدی میں شاہی کو کسی طرح سے گھٹنا نہیں پڑا مگر اس صدی کے اوایل میں شاہی، بے برگ و بار اور بیکار ہو گئی۔

یہ ایک طرح کا فسانہ یا قصۂ موہوم ہے جس کے ذریعہ سے عام طبایع کو اس واقعہ کے متعلق اطمینان ہو جاتا ہے کہ شاہی کا تمام موثر اختیار زایل ہو چکا ہے یہ تصور کرنا کہ اس قسم کا تغیر بغیر کسی انقلاب کے محض غیر مرئی تدریجات سے پیدا ہو گیا ہو، مشکل ہے، اور چونکہ کوئی دوسرا انقلاب ملتا نہیں اس لئے عام طبایع ۱۶۸۸ء کے انقلاب پر مضبوطی سے جم جاتی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اس مبہم اصول موضوعہ کی تائید ایک حقیقی واقعہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ میں ظاہر کر چکا ہوں، رجعت شاہی کے وقت سے گر نہایت ہی قطعی طور پر انقلاب کے وقت سے شاہی نے

عام نظروں سے ورے ہٹ جانے اور تا حد امکان ذمہ داری کو پارلیمنٹ پر ڈال دینے کی روش اختیار کی، اور خصوصاً حق اجماع کو حذف کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ میں اٹھارھویں صدی کے بادشاہ میں سترھویں صدی کے بادشاہوں کے بہ نسبت امتیازی خصوصیات کم نظر آتے ہیں وہ باہمدگر زیادہ یکساں معلوم ہوتی ہیں اور ان کی گفتار و رفتار گویا ایک مقررہ معیار کے مطابق ہوتی ہے۔ اس تصنع کو آسانی کے ساتھ زوال اختیار کے مرادف سمجھ لیا جا سکتا ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی آسان ہے کہ ان زمانوں میں پرزور وزرا کی طرف اشارہ کیا جا سکے جن میں بعض کم قابلیت کے بادشاہوں سے برسر تقابل نظر آتے ہیں اور یہ اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ بادشاہ کے قبضہ سے جو طاقت نکلی وہ وزرا کے قبضے میں چلی گئی۔ ان سب پر یہ اضافہ کر دو کہ یہ نظریہ اٹھارھویں صدی میں جس تغیر کا مکمل ہو جانا فرض کرتا ہے وہ بلا شبہہ اس صدی میں شروع ہو گیا تھا، یعنی اس صدی کے بعض اوقات میں بادشاہ فی الواقع بے بس ہو گئے تھے اور وزرا اس عمومی تائید کے زور پر حکمرانی کرتے تھے، جس تائید کے زور پر ہمارے زمانے کے وزرا حکمرانی کرتے ہیں۔ اب ہمیں یہ نظر آ جائے گا کہ یہ افسانہ کس قدر وافر مواد سے مرتب کیا گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ تم پر یہ ظاہر کرنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ یہ محض ایک افسانہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں بادشاہ بالکل بے نمود نظر آئیں اور پھر بھی انھوں نے بڑے اختیار سے کام لیا ہو، اور حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اٹھارھویں صدی میں ان قدر بے نمود بادشاہوں کے تحت میں رہتے تھے وہ یہ شکایت نہیں کرتے تھے کہ ان بادشاہوں کے اختیارات ضرورت سے کم ہیں بلکہ بیشتر عام شکایت یہ تھی کہ ان کے اختیارات ضرورت سے زیادہ ہیں۔ اس میں بعض مستثنیات بھی ہیں (جن پر میں بعد کو غور کروں گا) مگر عام قاعدے کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سترھویں صدی کی طرح اٹھارھویں صدی بھی بادشاہوں کے بے اندازہ اختیارات کے کم کرنے کی مستقل جدوجہد میں صرف ہوئی ہے۔ جارج سوم کے وسط عہد میں دار العوام میں ایک قرارداد یہ تجویز ہوئی تھی کہ "تاج کا اختیار بڑھ گیا ہے، بڑھتا جاتا ہے اور

اسے کم کرنا چاہیئے" یہ قرار داد انقلاب سے تقریباً ایک صدی بعد تجویز ہوئی تھی، اور اس سے قبل بھی اور بعد بھی بہت سے دور ایسے گزرے ہیں جن میں یہ قرار داد تجویز ہوسکتی تھی۔ اس عہد کے بادشاہوں پر ایک نظر ڈالتے چلو۔ ولیم سوم اپنے عہد کا بہت بڑا مدبر، اور یورپ کے سیاسیات پر چھایا ہوا تھا، اور باوجود اپنے مشتبہ استحقاق کے انگلستان میں وہ جس قدر طاقتور تھا اس کا اندازہ "قانون منصب داراں" اور "قانون سہ سالہ" کی ان شورانگیزیوں سے ہوسکتا ہے جو اس کے عہد کے خاص نشان امتیاز ہیں۔ ملکہ این شخصی طور پر قوی نہیں تھی مگر اس کی اس بے حقیقتی سے اس کے زمانہ کے اختیار شاہی پر اور زیادہ تیز روشنی پڑتی ہے۔ اس نے خود اپنی مرضی سے مارلبرو کو نکال دیا۔ حکمت عملی کا یادگار زمانۂ تغیر جو اوٹرخٹ کے معاہدے کی صورت میں انجام پذیر ہوا، اس میں این کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ جارج اول ایک قابل مدبر تھا مگر ساتھ ہی کسی قدر بے نمود شخص تھا۔ وہ اور اس کا جانشین دونوں تاریخ میں اپنے وزیر والپول کے عقب میں ہٹ گئے تھے۔ مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ شاہی کے زوال کا کوئی ثبوت نہیں ہے، جب تک تم یہ بھی طے نہ کرلو کہ رشلیو اور مزارین کی ماتحتی میں فرانسیسی بادشاہی اختیار و اقتدار میں بے اندازہ بڑھ جانے کے بجائے زوال پذیر ہوگئی تھی۔ تاہم جارج دوم کے عہد کے آخری برسوں میں، میں زوال کے علامات محسوس کرتا ہوں اور اس کے بعد سے میں یہ دیکھتا ہوں کہ ایسے نئے اسباب اپنا کام کئے جارہے تھے جن سے بادشاہی کو نقصان پہنچایا جاتا تھا، لیکن ہنوز، یہ علامات شاذ و نادر اور وقفہ کے ساتھ ظاہر ہوتے تھے۔ جارج سوم کے دور کے بیشتر حصہ میں (تمام ہمعصر دل کے خیال کے موافق) شاہی زاید از ضرورت کمزور ہونے کے بجائے زاید از ضرورت قوی نظر آتی ہے۔

پس سب سے پہلے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہی طاقت کے زوال کی ابتدا انقلاب کے زمانہ میں نہیں بلکہ اس کے بعد ہوئی ہوگی بلکہ اور ہم اسے زیادہ سے زیادہ اٹھارھویں صدی کے وسط کے قریب تک پیچھے ہٹا سکتے ہیں۔ اب ہمیں وزیر کے عروج اور شاہی اختیار میں وزیر کی مداخلت کے مسئلے پر غور کرنا چاہیئے

انقلاب کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میکالے کا یہ خیال ہے کہ وہ انگلستان کے فریقانہ حکومت کے نظم کو ولیم سوم کے عہد تک پہنچا سکتا ہے۔ حقیقت میں یہاں وہ جدید نظم انگلستان کی ایک دوسری ہیئت پر غور کر رہا ہے یعنی وہ وزیر کے ذریعہ سے بادشاہ کے اختیار کے مٹ جانے پر نہیں بلکہ وہ خود وزرا کے درمیان اتفاق رائے کے مسئلے پر بحث کرتا ہے لیکن یہاں بھی اس کی رائے پر اعتراض ہو سکتا ہے ۱۷۱۰ء میں یعنی انقلاب سے بائیس برس بعد، وزارت میں جو تغیر ہوا میں ابھی اس کا حوالہ دے چکا اور یہ ظاہر کر چکا ہوں کہ اتنا زمانہ گزرنے پر بھی گوڈولفن اور مالبرو کا انحصار کس قدر ملکہ کی ذاتی رائے و خیال پر تھا، تم یہ پوچھو گے کیا والپول جدید طرز کا وزیر تھا؟ ہمیں خود اپنے دل سے یہ سوال کرنا چاہیئے کہ یہ جدید طرز صحیح طور پر ہے کیا؟ زوردار وزیر اور ایسے وزیر جو مدت تک اپنے عہدے پر قایم رہیں، زوال پذیر شاہی کے علامات نہیں ہیں بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ مطلق العنانی کے تحت ایسے زوردار وزرا جو مضبوطی کے ساتھ اپنے عہدے پر قایم ہوں، ان جگہوں کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں جہاں پارلیمنٹ قوی ہو۔ وولزی، برلے، رشلیو، مازارین کاؤنٹز، ہارڈنبرگ، مٹرنخ اور بسمارک کے ایسے وزرا شخصی حکومتوں ہی میں پائے جاتے ہیں، ہم جس امر کی تحقیق کر رہے ہیں وہ یہ نہیں ہے کہ وزرا کا پر زور ہونا کب سے شروع ہوا، بلکہ ہمارا موضوع تحقیق یہ ہے کہ فرمانروا کے بالمقابل ان کا زوردار ہونا کب سے شروع ہوا یعنی کب سے یہ ہوا کہ وہ اپنے عہدے پر فرمانروا کی مرضی تک نہیں بلکہ پارلیمنٹ کی مرضی تک برقرار رہنے لگے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس صورت حال کے پیدا کرنے میں انقلاب کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔

تاریخ انگلستان میں اس سے بہت پیچھے پارلیمنٹ نے گاہ بگاہ بادشاہ کو گویا ہدایت کی کہ فلاں فلاں وزیروں سے وہ مشورہ نہ کرے۔ جس وقت سے پارلیمنٹ کا آغاز ہوا ہے تقریباً اتنے ہی بعید زمانہ سے اس رواج کا بھی آغاز ہو گیا تھا کہ بادشاہ کے مشیروں پر اعتراض کر کے پارلیمنٹ بادشاہ پر قابو حاصل کرتی رہتی تھی۔ سترھویں صدی میں بکنگھم اسٹیفرڈ اور ڈینبی اس کی بدیہی مثالیں ہیں۔ اس قسم کے رواج سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ مملکت عضوی ہے اور اس میں حقیقی قوت

حیات موجود ہے یعنی اس میں رائے عامہ زندہ ہے۔ یہ کوئی ثبوت اس امر کا نہیں ہے کہ بادشاہی کو زوال ہو رہا ہے یا وزیر بادشاہ کی جگہ لیتا جارہا ہے۔ لیکن جب رائے عامہ آمرانہ طور پر بادشاہ سے نہ صرف یہ کہے کہ کس سے اسے مشورہ نہ کرنا بلکہ کس سے اسے مشورہ کرنا چاہیئے، تو پھر صورت حالات دوسری ہو جاتی ہے۔ حالت اور بھی زیادہ بدل جاتی ہے جب یہ کارروائی انتہائی فریقانہ کشمکش کے کسی وقت میں ایک آدھ بار پیش آنے کے بجائے بار بار ہوتی رہتی ہے یعنی جب وہ اس کثرت سے ہونے لگتی ہے کہ صحیح معنی میں وزیر بادشاہ کا وزیر نہیں رہ جاتا بلکہ پارلیمنٹ کا نامزد شخص بننا شروع ہو جاتا ہے۔ انگلستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ امر پیش آچکا ہے۔ اب یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ بادشاہ کا کام صرف یہ ہے کہ وزیر کے انتخاب میں پارلیمنٹ کی مرضی کی تعبیر کر دے۔ اکثر صورتوں میں یہ مرضی بلا اشتباہ صاف وعیاں ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ بادشاہ دو ناموں کے درمیان تذبذب میں پڑ جائے مگر ان تنگ حدود کے اندر بھی اسے اپنی شخصی ترجیح کو کام میں نہ لانا چاہیئے۔ پس سوال یہ ہے کہ کب اور کس طریقے پر بادشاہ وزیر کے تقرر کے اختیار سے علحدہ ہو گیا یعنی کب وزیر بادشاہ سے آزاد ہو گیا۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ امر "انقلاب" کے وقت نہیں پیش آیا، اگر ولیم کے آخری برسوں میں جب کہ میری کے انتقال کی وجہ سے اس کی حیثیت بہت کچھ کمزور ہو گئی تھی۔ اس قسم کے تغیر کی آمد کے کچھ آثار نمایاں ہوئے ہوں تو ان سے کچھ ہوا نہیں۔ یہ ایک نقش بر آب کیفیت تھی، کسی قسم کا زوال نہیں تھا، ملوکیت میں صرف عارضی انحطاط سا پیدا ہو گیا تھا، مگر میں اس سے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ مجھے یہ بھی نہیں نظر آتا کہ یہ تغیر انقلاب کے بالواسطہ اثر کا نتیجہ ہو۔ مروجہ نظریہ کا اقتضا یہ ہے کہ ہم اسے یہ سمجھیں کہ جس روشن خیال فریق نے انقلاب پیدا کیا تھا اس نے یہ دوسرا قدم اٹھایا تھا، گویا اس فریق نے اپنی خفیہ مجلس میں یہ قرار دے کر کہ اوہام پرست عوام ادارۂ شاہی پر براہ راست حملہ دیکھنے کے متحمل نہ ہوں گے، چالاکی سے اپنی روش بدل دی اور یہ عزم کر لیا کہ بادشاہ کو الگ چھوڑ کر وزیر کی نامزدگی کا حق

پارلیمنٹ کے لئے محفوظ کرلیا جائے لیکن میں یہ دیکھتا ہوں کہ نہ اس قسم کا کوئی فریق موجود تھا اور نہ کبھی اس قسم کی کوئی تجویز قرار پائی تھی۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ کسی وسیع وبااثر فریق میں کوئی خواہش اس قسم کی نہیں تھی کہ تاج کو محض ایک نمائشی شے بنا دیا جائے لہذا کسی فریق نے اس قسم کی کوئی تجویز سوچی ہی نہیں۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ انقلاب کے بعد نصف صدی گزرنے پر بادشاہ کو یہ محسوس ہونا شروع ہوا کہ اسے اپنے وزراء کے انتخاب میں پوری آزادی حاصل نہیں ہے اور یہ ان حالات احوال کا نتیجہ تھا جن کا تعلق انقلاب کے ساتھ بہت ہی بعید تھا۔

میرے خیال کے مطابق ایک ایسے جدید نظم کے نشو ونما کے اولین صریحی علامات (جس میں وزیر بادشاہ سے آزاد ہو) جارج دوم کے عہد کے آخری پندرہ برس میں ظاہر ہوئے اور ان کا تعلق پٹ اکبر کے عروج واقتدار سے ہے۔ ان علامات کا بلا واسطہ سبب شاہی کے کمزور کرنے کا کوئی ارادی منصوبہ نہیں تھا بلکہ یہ فریقوں کے اس نہایت ہی مخصوص نظم کے عمل کا نتیجہ تھا جو خاندان ہانوور کے ساتھ ہی ساتھ بروئے کار آگیا تھا۔

فریقانہ اصول، سب سے پہلے جارج اول کی حکومت نے اختیار کیا مگر ہمیں یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ اس وقت جو فریقانہ اصول اختیار کئے گئے تھے وہ وہی تھے جو ہمارے زمانے کے فریقانہ اصول ہیں۔ جارج اول کے عہد میں وھگ فریق وزارت میں داخل ہوا اور ٹوری اس سے خارج ہو گئے یہ بالکل اسی طرح ہوا جس طرح ہمارے زمانہ میں وزارت خواہ لبرل (آزادی پسند) فریق کی ہو، یا کنسرویٹو (متحفظ) فریق کی ہو گر ہوتی ایک ہی رنگ کی ہے۔ لیکن جدید اصول مسلمہ یہ ہے کہ حکومت کو جذبات عامہ کے ساتھ ساتھ بدلنا چاہئے یعنی جب قوم کا انداز طبیعت آزادی پسند ہو تو اس پر آزادی پسندوں کی حکمرانی ہو اور جب پھر اس کے انداز طبیعت میں تغیر ہو جائے تو متحفظین کی حکومت ہو جائے۔ لیکن جارج اول کے عہد کے کسی مدبر کے دل میں اس قسم کا خطرہ بھی نہیں گزرا ہوگا، اس وقت جو اصول مسلمہ شایع تھا وہ یہ نہیں تھا کہ قوم پر باری باری سے وھگوں اور ٹوریوں کی حکومت ہونا چاہئے بلکہ اصول مسلمہ یہ تھا کہ ہمیشہ وھگوں اور صرف وھگوں ہی کی حکومت ہونا چاہئے۔

لارڈ چانسلر کا وپر نے ایک تحریر جارج اول کے حضور میں پیش کی تھی اور وہ کیمبل کے سوانح لارڈ چانسلر انڈ Lirus of the chancellar میں چھپی ہوئی موجود ہے اس میں تم اس کے دلائل کا بہت واضح بیان دیکھ سکتے ہو۔ وہ دلیل یہ تھی کہ "خاندان ہانوور کو اس کا استحقاق خالصتہً انقلاب سے حاصل ہوا ہے اس لئے اسے اپنی تائید کے لئے ان لوگوں پر بھروسہ کرنا چاہیئے جو صدق دل سے انقلاب کو پسند کرتے ہیں، سابق فرمانروایاں، ولیم اور این نے وھگ اور ٹوری دونوں فریقوں کو اس یکساں نظر سے دیکھا ہے کہ دونوں انقلاب کی قرارداد کے سچے دوست ہیں، لیکن اگرچہ ٹوریوں نے کچھ اوپری دل سے انقلاب کی پسندیدگی کا اقرار کرلیا ہے، تاہم یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے اس اقرار میں صادق ہوں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ انقلاب ٹوریوں کے اصول کے منافی ہے۔ ٹوری اگر اس کی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تو یہ صرف اس لئے کہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ وہ عہدوں اور بادشاہ کے عنایات سے محروم ہو جائیں اور اگرچہ ولیم اور این نے شاہی مراعات کو دونوں فریق میں بغیر کسی جنبہ داری کے تقسیم کرنے کے طریقہ سے کام لیا اور زیادہ تر اس میں ناکامی نہیں ہوئی تاہم این کے آخری برسوں میں اس قسم کی روش کا غیر محفوظ ہونا صاف عیاں ہو گیا تھا۔ معاہدۂ اوٹرخت کے وقت انگلستان کی حکمت عملی کے دیوانہ وار تغیر اور مدعی سلطنت" کے فریق کا احیا یہ دونوں امور ٹوریوں کو حکومت میں دخل دینے کے محض طبعی نتائج ہیں۔ پس نیئے خاندان کو اس جہت میں ایک نئی روش اختیار کرنا چاہیئے۔ ولیم اور این کی طرح اسے اب یہ کوشش نہ کرنا چاہیئے کہ وہ وھگوں اور ٹوریوں کے درمیان غیر جنبہ دار رہے یا ایک فریق کو دوسرے سے لڑاتا رہے بلکہ اسے چاہیئے کہ اپنے سچے دوست وھگوں کے لئے صاف صاف اور ہمیشہ کے لئے (اپنی جانبداری کا) اعلان کر دے، رہ گئے ٹوری، سو بادشاہ کو ان کی دارو گیر نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کے برعکس اسے اپنی کل قوم کا واقعی باپ بننا چاہیئے۔ البتہ اسے ٹوریوں کو عہدوں پر نہ آنے دینا چاہیئے۔

انگلستان میں فریقانہ حکومت کی ترقی اوّل اوّل اسی شکل کے تحت ہوی۔ بادشاہ نے بالا اعلان اپنے کو وھگ ظاہر کر دیا اور یہ نظم والپول کے زوال تک چلتا رہا۔

میرا خیال ہے کہ جس نظم کی جگہ یہ قایم ہوا، اس کی بہ نسبت یہ زیادہ خطرناک تھا، اس نے ٹوریوں کو حامیان جیمز کی صف میں پہنچا دیا اور اس عہد میں حامیان جیمز نے جو دو بغاوتیں برپا کیں، غالباً ایک بڑی حد تک یہی نظم ان کا بھی ذمہ دار ہے۔ لیکن اس کا ایک دوسرا اثر بھی مترتب ہوا جو اس سے کم بلا واسطہ تھا اور میرے نزدیک اس کی مطلق پیش بندی نہیں کی گئی تھی وہ یہ کہ اس اصول نے بتدریج شاہی کو کمزور کر دیا۔ اس نظم کے تحت میں بادشاہ ایک طرح کا بیرنا بالغ ہو گیا جو وِھگ فریق کی تولیت میں تھا اور اس کے بعد سے اگر وہ اپنے مشیروں کو بدلنا چاہتا تو اس کے لئے ایسا کرنا آسان نہیں رہا تھا، کیونکہ وِھگوں کو صرف اتنا ہی کرنا تھا کہ وہ اپنی صفوں کو اس کے لئے بند کر دیتے، اتحاد تجارتی کی سی تدبیریں اختیار کرتے، ہڑتال کی دھمکی دے کر اپنے شرائط بادشاہ سے منوا لیتے۔ ان امکانات کی وجہ سے بادشاہ کو شہ پر شہ ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس نے ٹوریوں کے ساتھ باغیوں کا سا برتاؤ کر کے انھیں اپنے سے برگشتہ کر دیا تھا، پس اب وہ خود کو ان کے قبضہ میں نہیں دے سکتا تھا کہ وِھگوں کے ایک جزو کو چھوڑ کر ان کے دوسرے جزو کی طرف متوجہ ہو اور وِھگ اس ضرب کو اس طرح بچا لے جا سکتے تھے کہ وزرا محنت اٹھا کر اپنی جماعت میں سے جزوی تفریقوں کو محو کر دیں۔

۱۷۴۵ء میں یہ معاملہ روشنی میں آیا، پیلہم برادران جو اس وقت برسر اقتدار تھے انھوں نے ولیم پٹ کو انتظام ملک میں جگہ دینا چاہی، مگر بادشاہ نے اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر پیلہم کے تمام لاحقین نے عہدوں سے ایک ساتھ استعفا دیدیا۔ اب بادشاہ نے کارٹرٹ اور باتھ کو طلب کیا مگر ان لوگوں کے لئے ایسے دوسرے اشخاص کی تائید حاصل کرنا ناممکن ہو گیا جو معاملات عامہ سے تعلق رکھتے ہوں، وہ مجبور ہو گئے کہ عہدے کی مہریں بادشاہ کے ہاتھ میں واپس دیدیں اور بادشاہ مجبور ہو گیا کہ پھر پیلہم برادران کو برسر اقتدار کر دے۔ میں قبول کرتا ہوں کہ یہیں سے انگلستان میں شاہی کا زوال شروع ہوا کیونکہ میرا خیال ہے کہ اس سے قبل انگلستان کے کسی بادشاہ سے ایسا برتاؤ نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی میں یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا ہوں کہ پیلہم برادران نے انقلاب کو آگے بڑھانے اور بادشاہ کے اختیار کو اور زیادہ گھٹا دینے کے روشن خیال ارادے سے ایسا کیا ہو۔

اس عہد کے ختم ہونے سے قبل ایک دوسرا اہم بالشان واقعہ ایسا پیش آگیا جو بادشاہ کو نقصان پہنچا کر وزیر کی رفعت کا باعث بن گیا۔ یعنی ولیم پٹ نے محض قوم کے کاندھوں پر سہارا دے کر اقتدار اعلیٰ کے بلند مرتبہ کو حاصل کر لیا۔ اٹھارھویں صدی کا یہ ایک نہایت ہی یادگار زمانہ واقعہ ہے مگر یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کا کوئی تعلق انقلاب کے ساتھ پیدا نہیں کیا جا سکتا، نہ اسے انقلاب کے اصول کے مزید ارتقا کے طور پر ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بالکل ہی مختلف قسم کا واقعہ ہے۔ انقلاب سے پارلیمنٹ کو نمایاں فتح و نصرت حاصل ہوگئی تھی، پس اگر اس وقت پارلیمنٹ نے جارج سوم کو مجبور کیا ہوتا کہ وہ ولیم پٹ کو وزیر بنالے تو اسے بھی اسی طرح کا ایک مزید دخل بیجا سمجھا جاتا مگر پارلیمنٹ نے ولیم پٹ کو آگے نہیں بڑھایا تھا، بس یہیں اس واقعے کی جدت و ندرت مخفی ہے۔ پارلیمنٹ نہیں بلکہ پارلیمنٹ سے باہر کے لوگ ولیم پٹ کے ترقی کے باعث ہوئے تھے اور اس وجہ سے جارج دوم نے پٹ سے کہا تھا کہ "صاحب آپ نے مجھے یہ سکھا دیا ہے کہ میں اپنی قوم کے احساس کا اندازہ کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے باہر کسی دوسری جگہ نظر ڈالوں" اور گلوورنے اپنی پہلی وزارت کے وقت قوم کی حالت کو بیان کرتے ہوئے یوں کہا تھا کہ "آپ نے ملک میں ایک عجیب و غریب تقسیم دیکھ لی، ایک طرف تو ولیم پٹ اور قوم تھی اور دوسری طرف بادشاہ، امرا اور عوام" پس یہاں ۱۶۸۸ء کے اصول کے اور زیادہ آگے بڑھانے کا کوئی نشان نہیں تھا بلکہ ایک بالکل ہی دوسرا اصول اپنا کام کر رہا تھا۔ میرا گمان ہے کہ تجارت و دولت کی ترقی نے ذہنوں میں جدت پیدا کر دی تھی اور قوم کو اس کے ادارات کے حدود سے آگے بڑھانے لئے جا رہی تھی۔ رائے عامہ وجود میں آگئی تھی، اور بلند ہونے والی موجیں دارالعوام کے در و دیوار سے ٹکرا کر اسی طرح شور مچا رہی تھیں جس طرح تاج کے ایوان سے متصادم ہو کر۔

جارج دوم، انگلستان کا وہ پہلا بادشاہ تھا جسے یہ احساس تھا کہ شاہی پر ایک سکتہ سا طاری ہوتا جا رہا ہے۔ کسی شخص نے ایک مرتبہ اس کے سنتے ہوئے انگریزی دستور مملکت کی تعریف کی تو اس نے کہا کہ "قوم کے لئے تو یہ دستور بہت اچھا ہے مگر بادشاہ کے لئے اس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔" جب جارج سوم نے اختیارات شاہی کی تجدید کی تو

(جیسا کہ اکثر ظاہر کیا جاتا ہے) اس نے انقلاب پر لات نہیں ماری، بلکہ اس نے صرف وزیر کے اس جدید اعتصاب کے خلاف سرتابی کی جسے پلہم برادران پندرہ برس قبل عمل میں لائے تھے، اور اس کے تمام عہد میں تم یہ دیکھو گے کہ وہ برابر اس ایک اصول پر اصرار کرتا رہا ہے، کہ وزیر اس کا (بادشاہ کا) وزیر ہو۔ بہ حیثیت مجموعی وہ کامیاب رہا۔ ۱۷۸۲ء سے قبل کا اضطرابی زمانہ لارڈ نارتھ کی وزارت پر ختم ہو گیا، جو پوری طرح بادشاہ کا وزیر تھا، اور بارہ برس وزارت پر فائز رہا تھا، اضطراب کا دوسرا دور پٹ اصغر کی وزارت پر ختم ہو گیا، اس شخص کو بھی بادشاہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تھا، اس کی وزارت اٹھارہ برس رہی اور پٹ کے انتقال کے بعد دوسرا فریق صرف ایک برس وزارت پر قایم رہ سکا۔

جس فریق نے جارج سوم کے پیشرو کو ذلیل کیا تھا، اسے اس بادشاہ نے دور ہی دور رکھا پلہم برادران کا فریق، جس کی رہبری نیوکاسل کی کنارہ کشی کے بعد راکنگھم نے اور راکنگھم کے بعد فاکس نے کی اور جو اس عہد میں صرف فریق وھگ کے نام سے مشہور تھا وہ فریق اس دور میں بہت ہی طولانی وقفوں کے بعد بدشواری تمام برسر اقتدار ہو جاتا تھا، بادشاہ جب تک کوئی دوسرا چارۂ کار نہ دیکھتا اس وقت تک ان کو گوارا کرتا مگر ہمیشہ تعرض کے ساتھ، وہ بادشاہ کے وزیر نہیں ہوتے تھے اور بادشاہ کی پختہ رائے یہ تھی کہ اسے اپنی مرضی سے اپنے وزیروں کے مقرر کرنے کا حق ہے، پس وہ انھیں ترش روئی سے قبول کرتا، ان پر گہری نظر رکھتا اور یہ کوشش کرتا کہ اگر وہ کل کابینہ کو نہیں مقرر کر سکتا تو کم از کم تھرلو یا ایڈین برو کا ایسا اس کا کوئی نمایندہ کابینہ میں داخل ہو جائے۔ اس کے بعد وہ اپنے موقع کی تاک میں رہتا جو عموماً سال میں ایک مرتبہ آ ہی جاتا تھا۔ اس وقت وہ انھیں برطرف کر دیتا اور پھر اپنے لئے خود وزارت کا انتخاب کر لیتا۔

تقریباً نصف صدی تک جارج سوم اس قابل رہا کہ نظم انگلستان کو اسی نقطہ پر قایم رکھے گو جارج چہارم اور ولیم چہارم کے تحت بادشاہ سے وزیر کی آزادی پھر سرعت کے ساتھ بڑھنے لگی۔ کیننگ نے خود کو بہ زور، جارج چہارم پر مسلط کر دیا اور اگرچہ اتنے ہی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ارل گرے بھی بزور ولیم پر مسلط ہو گیا تھا

لیکن کم از کم اتنا تو صحیح ہے کہ اس کے تقرر کے معاملہ میں قوم کے حصہ کے مقابلہ میں بادشاہ کا حصہ سو میں ایک تھا۔

ولیم چہارم کے عہد کے وسط (یعنی ۱۸۳۴ء) میں مختتم طور پر یہ ظاہر ہو گیا کہ وزیر کے تقرر کا نشاہی اختیار زایل ہو گیا ہے۔ ولیم چہارم جو اصلاحی وزارت سے بہ تنگ آگیا تھا، اس نے لارڈ آل تھورپ کے دارالامرا میں چلے جانے کے موقع کو غنیمت سمجھا اور بقول خود اس نے "ایک نیا انتظام کیا"۔ اس نے اپنے وزرا کو برطرف کر دیا اور رابرٹ پیل کو وزارت کے لئے طلب کیا۔ اس وقت یہ ظاہر ہو گیا کہ دستور انگلستان کس طرح غیر محسوس طور پر بدل گیا ہے۔ سر رابرٹ کے سامنے جو مسئلہ پیش کیا گیا وہ ناقابل حل تھا۔ سر رابرٹ سے زیادہ دارالعوام کا ماہر اور منتظم کوئی دوسرا نہیں تھا مگر کوئی مہارت و تدبیر، قلت کو کثرت میں نہیں بدل سکتی تھی۔ ایوان نے بادشاہ کے خود اپنے وزیر مقرر کرنے کے حق کے متعلق کسی قسم کی رد و قدح نہیں کی اور اس وزیر کا ہر طرح پر مناسب احترام کیا، مگر جب وزیر نے اپنی حکمت عملی ایوان کے سامنے بیان کی تو وہ اکثریت کی پسندیدگی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

اب مجھے یہ توقع ہے کہ تم صرف اتنا خیال ظاہر کر دینے پر قناعت نہ کرو گے کہ اس وقت تک آزادی کے اصول اس قدر ترقی کر گئے تھے کہ بادشاہ جو تقرر کرنا چاہتا، ایوان اس پر رضامند ہونے کو جایز نہ رکھتا۔ ہم قطعی طور پر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کونسا تغیر واقع ہوا تھا، بس ہمیں یہ دریافت کرنا چاہئے کہ ولیم چہارم کے عہد کے بجائے اگر جارج دوم کے عہد میں اس قسم کا کوئی تقرر ہوا ہوتا تو کس طریق پر وزیر اس حالت کے پیش آنے سے بچ نکلتا۔ یہ یقینی ہے کہ پلہم، یا نیوکیسل کو ایوان میں کثرت رائے کی ویسی ہی ضرورت تھی جیسی سر رابرٹ پیل کو تھی۔ پس سوال یہ ہے کہ کس اعتبار سے ان کا انحصار ایوان پر تھا۔

میرا جواب یہ ہے کہ ہم یہ خیال کرنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ مدبرین کیلئے وزیر ہونے کے قبل ایوان میں کثرت رائے کا رکھنا ضروری ہے مگر اٹھارھویں صدی میں وزیر کو اس وجہ سے کثرت رائے حاصل ہو جاتی تھی کہ وہ وزیر تھا اور وزیر ہونے ہی سے وہ کثرت رائے حاصل کر لیتا تھا۔ تم خیال کرو گے کہ میرا اشارہ رشوت کی طرف ہے

گر ایسا نہیں ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ ان دنوں میں پارلیمنٹ کے ارکان وزیر کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ جب میں قانون محصول کاغذ مہور کی تنسیخ کے متعلق پٹ اکبر کی تقریر کو پڑھتا ہوں تو اس کی توجیہ یکایک مجھ پر آشکارا ہو جاتی ہے گرینویل کو جواب دیتے ہوئے اس نے یہ کہا کہ "معزز رکن کو ہم سے یہ نہ کہنا چاہیئے کہ ہم نے یہ قانون بطور خود منظور کیا تھا اور اس لئے ہم اس کے اسی طرح جوابدہ ہیں جس طرح وہ خود جوابدہ ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ہم نے ان کے وزیر ہونے کے اعتماد پر اسے قبول کر لیا تھا" اور اس کے بعد آگے چلکر اسنے یہ کہا کہ "میں چاہتا ہوں کہ ایوان کی یہ عادت نہ ہوتی مگر عادت ایسی ہی ہے۔ خود ہمارے صدارت مآب بھی سنٹ جیمز کی طرف بار بار نگاہ ڈالتے رہتے ہیں جب میں برسر اقتدار تھا تو مجھے اس سے پریشانی ہوتی تھی کہ کوئی شخص جنگ کے متعلق اعتراض نہیں کرتا تھا۔ پے در پے کئی مرتبہ میں آیا اور میں نے پوچھا کہ کوئی رکن جنگ کے خلاف ہے؟ کسی نے بھی اس کا اعتراف نہ کرنا چاہا۔ آخر الامر ایک رکن نے جواب دوسرے ایوان کو چلے گئے ہیں (یعنی سر الیف ڈنش وڈ، لارڈ ڈسپنسر) یہ کہا کہ وہ جنگ کو پسند نہیں کرتے۔ اس جواب کے باعث میرے دل میں ان کی عزت بڑھ گئی، اور جب وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تو مجھے اس کا افسوس ہوا"۔

یہ ٹکڑا بین طرح پر قدیم عادات و خیالات کی حالت کو ہمارے پیش نظر کر دیتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ محض وزیر ہونے کی حیثیت سے وزیر کا کس قدر اعلیٰ احترام ہوتا تھا صدر کی نگاہ خود سنٹ جیمز کی طرف لگی رہتی تھی۔ ہم نے اکثر اسے نظر انداز کر دیا ہے۔ میکالے نے جب پٹ کے جنگی انتظام کے دوران میں اس کی غیر محدود شخصی فوقیت کا ذکر کیا ہے تو یقیناً وہاں پر وہ اس خصوصیت کو نظر انداز کر گیا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ پٹ کا خود یہ خیال نہیں تھا کہ اس کی کسی شخصی ہیبت کی وجہ سے ارکان کی زبانیں بند ہو گئی تھیں بلکہ یہ خاموشی اس کے وزراتی فرایض کے احترام کی وجہ سے تھی۔ اس پر نازاں ہونے کے بجائے وہ اس سے کبیدہ نظر آتا ہے۔

حق یہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی ہنوز پارلیمنٹ کے متعلق صاف طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ قوم کے نمایندوں اور (وزرا کے توسط سے) بادشاہ کے درمیان ایک طرح کی

کانفرنس ہے۔ بادشاہ جو کچھ تجویز کرے اسے نہایت ہی ادب و احترام سے قبول کیا جاتا تھا اور قوم کے نمایندوں کے دلوں میں ابھی تک یہ خیال جاگزیں نہیں ہوا تھا کہ ملک کی حکومت انھیں تفویض کی گئی ہے۔ وہ عادتاً یہی خیال کرتے تھے کہ ملک پر حکمرانی کرنا بادشاہ کا کام ہے۔ پس جب بادشاہ کی مرضی یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے وزرا کے ذریعہ سے یہ ظاہر کرے کہ وہ کیا کارروائیاں اختیار کرنا چاہتا ہے تو ارکان شاید ہی یہ خیال کرتے رہے ہوں کہ وہ اس امر کا استحقاق رکھتے ہیں یا ان میں یہ قابلیت ہے کہ وہ اس کارروائی کی عام خوبی و ضرورت کا فیصلہ کر سکیں، وہ اسے بادشاہ کے اعتماد پر قبول کر لیتے تھے، وہ اپنے کو صرف اس امر کا پابند سمجھتے تھے کہ ان کارروائیوں پر اس نظر سے غور کریں کہ قوم یعنے انتخاب کنندگان پر ان کا کیسا اثر پڑتا تھا۔ اگر قوم پر ان کارروائیوں سے سخت دباؤ پڑتا ہوتا، یا وہ رعایا کی جیبوں سے بہت زیادہ روپیہ کھینچنا چاہتے یا رعایا کی کسی آزادی کو خطرے میں ڈال دیتے، اس وقت پارلیمنٹ کی دخل دہی ضروری ہوتی، ورنہ اور صورتوں میں بہت کم اس کی حاجت ہوتی۔ الغرض عام طور پر وزیر کو بالطبع کثرت رائے حاصل ہوتی تھی اور تاج کے ساتھ قوم کی وفاداری کی وجہ سے اس کی اکثریت متیقن ہو جاتی تھی۔

لیکن پھر جب میں نیو کاسل سے سر رابرٹ پیل کا مقابلہ کرتا ہوں تو میں دوسرا عظیم الشان فرق دیکھتا ہوں۔ سر رابرٹ مہتم بالشان تشریعی تجاویز میں گردن تک ڈوبا ہوا تھا، ملک اس سے عین قبل ایک طرح کی انقلاب کی حالت میں رہ چکا تھا، قانون اصلاح منظور ہو چکا تھا اور ملک کا ہر ایک ادارہ باری باری سے از سر نو مرتب کیا جا رہا تھا۔ ایک نئے قانون غلسین کا نفاذ ہونے والا تھا، نو آبادیان تنسیخ بردہ فروشی کی وجہ سے تہ و بالا ہو گئی تھیں، کلیسا آیرستان کو خطرہ درپیش تھا، بلدی اصلاح کا معاملہ سامنے تھا، مالی اصلاح اشد ضروری ہو گئی تھی۔ پلہم کے وقت میں اس قسم کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ اس زمانہ میں شاید ہی وزرا کی جانب سے کوئی قانون پیش ہوتا یا ان سے اس کا تقاضا ہوتا ہو، لفظ حکمت عملی کے موجودہ مفہوم میں نہ ان کی کوئی حکمت عملی تھی اور نہ ان کو اس کی ضرورت تھی۔ ملک کے قدیم

اوارات اکثر و بیشتر قوم کی ضرورت کو پوری کرتے جارہے تھے مختصر یہ کہ ان دونوں میں حکومت کے معنی توضیع قوانین کے نہیں تھے' ان کے معنی تھے نظم و امن کا قایم رکھنا قوانین کا نافذ کرنا' اور جنگ کرنا۔

میں یہ خیال پہلے ہی ظاہر کر چکا ہوں کہ ہمارے زمانہ میں قانون سازی کی نمایاں شان کس قدر غیر معمولی و حیرت انگیز ہوگئی ہے۔ بظاہر اس کا بلا واسطہ سبب وہ وسیع الاثر ہیجان تھا جو انقلاب فرانس کے بعد پیش آیا۔ ۱۸۱۵ء میں صلح و امن نے اپنی صورت دکھائی' تو تمام شہنشاہی میں ہر ایک شے متغیر ہوچکی تھی اور ہر ایک صیغہ میں جدید قانون سازی کا مطالبہ ایسا تھا کہ اس سے قبل کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

عین اسی زمانہ میں یہ ہوا کہ بغیر کسی برانگیختہ تغیر کے غیر مرئی گو ناقابل اندفاع طور پر روز مرہ معاملات کی سرگروہی کے درجہ پر پہنچ گیا اور بادشاہ کے تابع ہونے کے بجائے پارلیمنٹ کا تابع ہوگیا۔ میرا یقین یہ ہے کہ یہ نتیجہ ایک بڑی حد تک توضیع قوانین کی اس انتہائی و بے نظیر بلند مرتبگی کی وجہ سے پیدا ہوا' اور جارج سوم کے طویل دور حکومت میں شاہی اثر کے زوال کامل سے اسے اور مدد مل گئی۔

حکومت کے متعلق وہ نہایت درجہ کا باادب و فدویانہ جذبہ (جیسے ہم جارج دوم کے عہد میں دیکھ چکے ہیں) وہ ایک حد تک بادشاہ کی بے اندازہ دولت و سرپرستی پر مبنی تھا۔ راکنگھم کے پیرو دھگوں کو ایک بڑی حد تک اسے گھٹانے میں کامیابی ہوگئی اور میرا گمان یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں' دولت و آبادی میں قوم کے بے اندازہ ترقی کر جانے سے دربار کی اہمیت غیر محسوس طور پر گھٹ گئی۔ سابق تر زمانے کے مختصر سادے اور دہقانی معاشرے میں دربار کو ایک بے اندازہ وسعت حاصل تھی اور بادشاہ اس قابل تھا کہ ساری قوم کو خرید کرلے جس طرح کوزمودی میدیچی cosmo de medici نے سارے فلورنس کو رشوت کے ذریعہ سے تباہ کردیا تھا۔ یہ تمام اثر اندازو شاندار عظمت جارج چہارم کے زمانہ کے مصروف کار تجارتی اور صنعتی انگلستان میں غایب ہوگئی۔ پارلیمنٹ نے وفادار رہنے میں قصور نہیں کیا مگر ارکان اپنے احساس و اغراض میں درباری نہیں

رہے۔ وزیر جو تجویزیں ان کے سامنے پیش کرتا تھا اس پر اب وہ نہایت سرد مہری و بے لوثی کے ساتھ غور کرنے لگے۔

نیز ان تجویزوں کا تعلق اب زیادہ تر قانونی اصلاح کے وسیع مسایل سے ہوگیا۔ یہ ایسے مسایل ہوتے تھے جن سے بہت بڑے طبقات کو دلچسپی ہوتی تھی اور بادشاہ کو خصوصیت کے ساتھ ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ شاہان ٹیوڈر کے وقت سے بادشاہ نے قانون سازی کے معاملہ میں شاذونادر ہی پیش روی کی، بادشاہ کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ غیر ملکی طاقتوں سے معاملت کرے، جنگ اور صلح کرے، بغاوتوں کو فرو کرے اور نظم و امن کو قایم رکھے، وضع قوانین بالعموم ایک ایسا صیغہ رہا ہے جس میں بادشاہ رہبری کرنے کے بجائے زیادہ تر صدارت کرتا تھا۔ پس چالیس برس کے دوران میں (جو نہایت ہی اہم وضع قوانین سے بھرا ہوا تھا) بادشاہ قدرتاً ایک خاموش صدر بن گیا اور اس کے لئے تقرر وزرا کا اختیار بے کار سا ہوگیا۔ وزیر کا خاص کام اب قانون سازی ہوگیا اور یہ قوانین بادشاہ کی جانشینی، "مدعی سلطنت"، اختیار مذہبی، حلف انکار یا دوسرے اس قسم کے معاملات سے متعلق نہیں تھے، جن میں بادشاہ کو دلچسپی ہو، بلکہ یہ قوانین، کارخانوں، صنعت گاہوں، بنکوں، درآمد و برآمد کے محصولوں اور جہاز رانی سے متعلق ہوا کرتے تھے اور یہ ایسے مسایل تھے جن میں بادشاہ صرف غیر جانبدار رہ سکتا تھا اور جن کے متعلق وزیر کثرت کی تائید کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ اسی لئے ۱۸۳۴ء میں بادشاہ یہ کرسکا کہ سر رابرٹ پیل کو مقرر کر دے اور پارلیمنٹ نے اس تقرر پر کوئی اعتراض نہیں کیا؛ مگر دوسرے برس خود سر رابرٹ پیل کو مجبور ہو کر یہ اعتراف کرنا پڑا کہ وہ حکمرانی نہیں کر سکتا۔ ایک ناگزیر تغیر کی وجہ سے جس کے خلاف کشمکش کرنا عبث تھا، وزیر بادشاہ کا وزیر نہیں رہا بلکہ پارلیمنٹ کا وزیر ہوگیا۔

میں غالباً غیر ضروری طور پر ادھر ادھر بہک گیا ہوں۔ میرے فوری مقصد کے لئے جتنا واضح کرنا ضروری تھا وہ یہ تھا کہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ہمارا نظم حکومت ساز عضو کے نظریہ کے منافی نہیں تھا، گو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

اس وقت یہ عضو نامکمل اور ارتقائی حالت میں تھا۔ سترھویں صدی میں پارلیمنٹ ایک مستحکم عضو کی نوعیت پیدا کرتی اور ڈرتے ڈرتے حکومت سازی کے اختیار کا بھی دعویٰ کرتی جارہی تھی۔ اٹھارھویں صدی میں جیسا کہ میں نے اب ظاہر کر دیا ہے، ظاہری سکون کے ایک طولانی عہد کے دوران میں مزید ارتقائی تیاری ہوئی اور وزیر عملاً بادشاہ سے آزاد اور پارلیمنٹ کے تابع ہوگیا۔ یہ ایک واقعہ نہایت سیادہ ہے اور کافی طور پر عیاں ہے مگر میں نے اس کے جزئیات پر کچھ وقت صرف کرنا خالی از منفعت نہیں سمجھا۔ میں نے دو اسباب کی بنا پر ایسا کیا، اول یہ کہ یہ جزئیات صاف طور پر سمجھے نہیں گئے تھے اور دوسرے یہ کہ ارتقا بہت زیادہ اتفاقی و ناگہانی طور پر پیش آیا۔ اس کی ضرورت اتنی نہ تھی جتنی سمجھی جاتی تھی۔ میں نے تم پر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ یہ "جذبۂ آزادی" کی ترقی کا لازمی نتیجہ نہیں تھا بلکہ بہت ہی مخصوص حالات کا ایک بہت ہی مخصوص نتیجہ تھا۔ میرے خیال میں اس سے یہ منتج ہوتا ہے کہ ہمیں انگریزی طرز کے کسی وزیر کی نسبت یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ وضع قوانین و انتظام ملک کا ایک ساتھ چلانا اور پارلیمنٹ کی مرضی سے اس کا عروج و زوال سیاسی ارتقا کا ایک ایسا نتیجہ ہے جو لازماً حسب معمول ہو اور صرف یہی ایک موزوں نتیجہ ہو سکے۔

باایں ہمہ، وزیر حکومت ساز طاقت کے عمل کی نہایت ہی صریح مثال ہے۔ جب تک پارلیمنٹ بادشاہ سے معاملت کرتی رہی، وہ اس اختیار کو صرف مذبذب طور پر اور بہت ہی احتیاط و شرائط کے ساتھ کام میں لانے کا دعویٰ کر سکتی تھی، مگر جب معاملت وزیر سے ٹھہری تو پارلیمنٹ نے زیادہ دلیرانہ حیثیت اختیار کی۔ اسی لئے ہم کسی اور سلطنت کی بہ نسبت جدید انگلستان میں اس جلیل القدر کارروائی کے عمل کو زیادہ مسلم و مستحکم دیکھتے ہیں جو لازمی طور پر ہر ایک عضوی مملکت میں روبہ ترقی ہے، وہ یہ کہ حکومت کی تائید قوم کے ایک با اثر گروہ کی مرضی سے ہو، اور جب وہ مرضی واپس لے لی جائے تو حکومت فنا ہو جائے۔

خطبۂ پنجم

سیاسی جمعیتوں کی نوعیت و غرض کے متعلق ہماری طویل تحقیق سے ہمیں حکمرانوں کی تعداد کے بموجب مملکتوں کی ارسطاطالیسی تقسیم کی ایک نئی ہیئت کا انکشاف ہوگیا ہے۔ بقول ارسطو بعض مملکتوں پر ایک شخص حکمراں ہوتا ہے اور بعض پر متعدد اشخاص حکمرانی کرتے ہیں۔ زمانۂ جدید کے ارباب قلم اکثر اس تقسیم کا اطلاق کرتے ہوئے پہلے اس امر کا اندازہ کرتے ہیں کہ مملکت میں کوئی شخص بادشاہ کا خطاب رکھنے والا ہے یا نہیں اور اس سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مملکت پیش نظر پر "ایک شخص" کی حکومت ہے یا اس پر "متعدد اشخاص" حکومت کرتے ہیں۔ شاید اس امر پر زور دینا ہرزہ گوئی معلوم ہو کہ ایتھنز تک میں ایک شخص "بادشاہ" کا خطاب رکھنے والا موجود تھا کیونکہ ارخنوں میں سے ایک شخص کا لقب "بازی لیوس" یا "بادشاہ" ہوتا تھا۔ اسی طرح روما میں ایک پجاری عہدہ دار ریکس (بادشاہ Rex) کا لقب رکھتا تھا۔ مگر یہ جو کچھ بھی ہو، زمانۂ جدید نے بادشاہی کی بہت سی ایسی مثالیں مہیا کردی ہیں جن میں شاہی اپنی تمام شان و شکوہ کے ساتھ نہایت ہی بااثر سیاسی جمعیتوں کے پہلو بہ پہلو موجود ہے۔ انگلستان ہی کو لو اس وقت کے انگلستان کو نہیں بلکہ اٹھارھویں صدی کے انگلستان کو لو۔ بادشاہ اس وقت میں نہ صرف موجود تھا بلکہ ہنوز اسے بہت بڑے بڑے اختیارات بھی حاصل تھے اور پھر بھی تمام یورپ کی نظر میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ انگلستان پر جمعیت کی حکومت ہے۔ اس قسم کی مملکت پر ارسطو کی ترتیب و تقسیم کا اطلاق کیونکر ہوگا؟ کیا ہم یہ کہیں گے کہ اس پر

ایک فرد کی حکومت تھی یا یہ کہیں گے کہ متعدد افراد کی حکومت تھی۔

نیز ایسی بھی مملکتیں ہیں جن میں کوئی بادشاہ نہیں ہے، پھر بھی ان میں کوئی ایک عہدہ دار اس قدر نمودار ہوتا ہے، جیسے انگلستان کی ایسی "بادشاہی" میں بادشاہ۔ ولندستان کے "اسٹاٹ ہولڈر" (حاکم اعلیٰ) کی یہی کیفیت تھی۔ دو صدیوں کے بیشتر حصے میں یہ عہدہ دار عملی حیثیت سے بادشاہ رہے اور آخر ۱۸۱۵ء کے بعد انھوں نے واقعتاً شاہی کا لقب اختیار کر لیا۔ اسی طرح ایک وقت میں انگلستان میں ایک محافظ سلطنت تھا، فرانس میں ایک قنصل اول تھا، اور ممالک متحدہ امریکہ میں ایک رئیس جمہوریہ آج بھی ہے۔ اس قسم کی مملکتوں کے نسبت ہم کیا کہیں گے؟ آیا ان پر ایک شخص کی حکمرانی ہے یا متعدد اشخاص کی۔

مزید برآں یہ بھی یقینی ہے کہ ہمیں لفظ "ایک" کو زائد از ضرورت لغوی معنی میں نہ لینا چاہیے۔ اگر حکومت متعدد محکموں میں منقسم ہو، گو ہر محکمہ کے حدود کے اندر ایک شخص کے ہاتھ میں ہو تو اس قسم کی مملکت کو سرسری طور پر متعدد اشخاص کی حکومت کی مثال نہ سمجھ لینا چاہیے۔ اس قسم کی رائے کا اطلاق قدیم روما کی ایسی سلطنت پر ہوتا ہے۔ یہ یقینی ہے کہ وہاں نہ کوئی بادشاہ تھا نہ رئیس جمہوریہ۔ وہاں دو قناصل تھے اور ان سے ایک درجہ گھٹ کر متعدد حکام تھے جن میں سے ہر ایک اپنے حدود کے اندر اعلیٰ اختیار رکھتا تھا۔ کیا اس صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ روما پر متعدد افراد کی حکومت تھی۔ اس وجہ سے کہ وہاں دو قناصل تھے یا اس وجہ سے کہ حکومت کے فرائض بتدریج متعدد عہدہ داروں میں منقسم ہو گئے تھے۔ لیکن مجھے یہ کہنا چاہیے کہ کم از کم روما کی حالت یہ تھی کہ وہاں افراد کی حکومت زیادہ تھی، جمعیتوں کی حکومت زیادہ نہیں تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ تقریباً تمام ہی مملکتوں میں "ایک" اور "متعدد" حکمراں پہلو بہ پہلو ملینگے، اگرچہ بعض مملکتوں میں "ایک" اور بعض میں "متعدد" زیادہ نمایاں ہونگے۔ زیادہ تر یہی ظاہر ہوتا ہے کہ معاملات عامہ کسی نہ کسی طریق پر انھیں دونوں کے درمیان تقسیم ہوتے رہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس تقسیم کی بنا کس طریقہ پر ہوتی ہے؟ میں نے یہ اشارہ کیا ہے کہ بدرجۂ اقل بیشتر صورتوں میں، جمعیت کا کام صحیح معنوں میں حکمرانی کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے کوئی اور تعریف پیدا کرنا چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جمعیت بعض وقت

حکام کا انتخاب کرتی ہے، بعض وقت ان کے اعمال پر نکتہ چینی کرتی ہے، ان پر ملامت یا عدم اعتماد کی قرار دادیں منظور کرتی ہے۔ بعض وقت قوانین کو رد یا قبول کرتی ہے۔ یہ جمعیتیں جو کام کرتی ہیں وہ بہت ہی متفرق قسم کا معلوم ہوتا ہے مگر یہ اتنے متفرق قسم کا نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے، کیونکہ اگر ملامت کی یا ر و تجویز کی یہ قرار دادیں اس کی جانب منجر ہوں کہ ان کی وجہ سے حکمراں کنارہ کش ہو جائے اور اس کی جگہ دوسرا شخص حکمراں ہو جائے، تو یہ قرار دادیں انتخاب کے ہم معنی ہیں اور اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ جو مقصد بعض مملکتوں میں عہدے کی مختصر میعاد اور کثرت انتخابات سے حاصل کیا جاتا ہے، وہی مقصد دوسری مملکتوں میں اس قاعدے کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے، جو عہدے کے قیام کو اکثریت کی تائید پر منحصر کر دیتا ہے۔ بس ان تمام صورتوں میں یکساں طور پر مجلس کا خاص فرض حکومت کرنا نہیں بلکہ حکومت کا بنانا اور بگاڑنا ثابت ہوتا ہے۔

بس اس طرح ہمارے نزدیک یہ قضیہ کہ حکومت ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتی ہے یا متعدد اشخاص کے ہاتھوں میں، تاریخ سے کچھ زیادہ ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے بجائے ہم زیادہ تر یہ کہتے ہیں کہ حکومت بالخصوص افراد کا کام ہے نہ کہ مجالس کا۔ قدیم روما کی اس نام نہاد جمہوریت اور ترکی کی ایسی انتہائی شخصی حکومت میں فرق یہ نہیں ہے کہ ایک میں جمعیتیں وہ کام کرتی ہیں جو دوسری میں افراد کرتے ہیں بلکہ فرق اس امر میں ہے کہ اولاً یہ کہ ایک میں افراد کا انتخاب ہوتا ہے اور وہ اکثر بدلتے رہتے ہیں اور دوسری میں وہ افراد اپنے عہدوں پر مادام الحیات کے لئے ہوتے ہیں اور اپنے ایک مقررہ قاعدے کے مطابق اسے منتقل کرتے ہیں؛ ثانیاً یہ کہ ایک میں متعدد حکمراں افراد ہوتے ہیں اور دوسرے میں صرف ایک ہوتا ہے۔

متعدد کے لفظ میں جو ابہام پوشیدہ ہے، میں پھر اس کی جانب تمہاری توجہ منعطف کرتا ہوں۔ متعدد کے معنی ایک جمعیت کے بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اشخاص کی ایک تعداد علیحدہ علیحدہ عمل کرتی ہو۔ اول الذکر مفہوم میں ہم یہ کہتے ہیں کہ حکومت "متعدد" کا کام نہیں ہے مگر آخر الذکر مفہوم میں یہ نہ صرف صحیح بلکہ اہم ہے کہ بعض مملکتوں پر ایک شخص حکمراں ہوتا ہے اور بعض پر متعدد اشخاص۔ خود اس مقصد کے لئے

اور اس ابہام کو زیادہ مکمل طور پر رفع کرنے کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ اس "حکومت بذریعہ متعدد" کی نوع پر چند ساعت کے لیے غور کیا جائے۔

حکومتوں کے درمیان وسیع اختلافات میں جن کا پیش کرنا ان خطبات کا مقصود ہے ایک اختلاف ایسا ہے جسے میں نے ابھی تک بیان نہیں کیا ہے اور شاید اس وجہ سے بیان نہیں کیا کہ وہ بہت ہی بدیہی و نمایاں ہے۔ میں یہ ظاہر کر چکا ہوں کہ جب کوئی مملکت وسیع ہو جاتی ہے تو وہ دو قسم کی حکومتیں رکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے ایک مقامی اور دوسری مرکزی۔ برخلاف ازیں جب مملکت چھوٹی ہوتی ہے تو اس امتیاز کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں اسے زیادہ عام طور پر یوں کہہ سکتا تھا کہ بعض مملکتوں کی تنظیم سادہ ہوتی ہے اور بعض کی پیچیدہ اور بہت ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ جو مملکت چھوٹی اور غیر ترقی یافتہ قوم پر مشتمل ہوتی ہے، جہاں طرز زندگی میں یکسانی ہوتی ہے، اشغال و املاک سب ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں اور کاروبار کے تنوعات نہیں ہوتے، وہاں محض ایک سادی حکومت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسی سادی جماعت میں ایک ہی شخص سپہ سالار اور عادل اور بعض وقت معلم بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب آبادی بڑھتی ہے اور وقت میں تنوع پیدا ہوتا ہے تو پھر قطعی مفہوم میں "ایک شخص" کی حکومت ناممکن ہو جاتی ہے محض اس وجہ سے کہ ایک شخص کی قوتیں محدود ہیں، ایک شخص نہ ہر امر کو سمجھ سکتا، نہ اسے اتنا وقت مل سکتا کہ وہ ہر کام کی طرف توجہ کر سکے۔ لہذا کچھ تغیر ضروری ہوتا ہے، مگر یہ تغیر صرف مشینری (کل) میں ہوتا ہے، اصول میں نہیں ہوتا۔ ایک شخص کی حکومت کے بجائے ایک ایسی حکومت جاری کی جاتی ہے، جو صحیح معنی میں "متعدد" کی حکومت نہیں ہوتی بلکہ ایک ایک کر کے بہت سوں کی حکومت ہوتی ہے۔

انگلستان میں بادشاہ عدالتوں کی صدارت کیا کرتا تھا، ان عدالتوں میں سے ایک عدالت اب تک عدالت شاہی " King's bench " کہلاتی ہے دوسری وہ عدالت مقدمات عامہ Court of common pleas تھی جسے منشور اعظم نے بادشاہ کے ساتھ ساتھ پھرنے سے ممنوع قرار دیا تھا اور قوم کی سہولت کے خیال سے ویسٹ منسٹر میں مستقلاً قایم کر دیا تھا۔ اب نہ صرف یہ کہ بادشاہ ماول کا کام

نہیں کرتا بلکہ کر نہیں سکتا۔ کیوں؟ اس وجہ سے کہ معاشرہ کی ترقی پذیر پیچیدگی کی وجہ سے قانون پیچیدہ ہو گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ علاج کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ پیچیدہ صورت حالات کے لئے حسب ضرورت ہم گویا ایک مرکب بادشاہ بھی بنا لیتے ہیں۔ جج مقرر کیے جاتے ہیں اور وہ جداگانہ طور پر شاہی منصب کی ایک ہیئت کی نمایندگی کرتے ہیں یعنی بادشاہ کے مختلف اختیارات افراد کی ایک تعداد کے اندر تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔

کبھی کبھی دوران عمل میں ہم غیر متوقع طور پر اس ارتقا تک جا پہنچتے ہیں۔ چنانچہ انگلستان میں لارڈ چانسلر جو اصول قانون کے تغیری یا ارتقائی کیفیت کی نمایندگی کرتا تھا اس کی بابت ایک مدت دراز تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ اسے کسی خاص علیت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے حق کے متعلق اپنے فطری احساس سے کام لینا چاہئے، مگر ہم سے یہ کہا گیا ہے کہ چارلس دوم کے عہد میں سر اینٹونی ایشلی کو پر (پہلا لارڈ شافٹسبری) جو قانون پیشہ نہیں تھا اور اس عہدے پر فائز تھا اسے یہ خوف ہوا کہ نصفت شعاری اب اس نقطہ پر پہنچ گئی ہے کہ ہوشیار سے ہوشیار غیر واقف شخص بھی اس کام کو نہیں چلا سکتا۔ تخصیص نے اب دوسرا قدم بڑھایا یعنی اس کے بعد سے چانسلر کا قانون پیشہ ہونا ضروری ہو گیا۔

جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں، انگلستان میں رواج یہ ہے کہ ہم چیزوں کو بدل دیتے اور ان کے قالبوں کو ویسا کا ویسا ہی رہنے دیتے ہیں۔ اس لئے تفریق کی یہ مہتم بالشان کارروائی جس کے ذریعے سے حکومت کے فرائض افراد کی ایک تعداد کے اندر تقسیم کر دیئے گئے، اس پر کسی قدر پردہ پڑا رہا۔ بادشاہ کی نسبت اب تک یہی سمجھا جاتا ہے کہ ہر ایک کام وہی کرتا ہے۔ وہی اپنے پارلیمنٹ میں جمع شدہ امرا و عوام کی مدد و صلاح سے قوانین وضع کرتا ہے۔ وہی ذمہ دار وزرا کی مدد سے حکمرانی کرتا ہے، وہی لارڈ چانسلر اور میر مجلس عدالت عالیہ کی زبان سے فیصلے صادر کرتا ہے۔ لیکن دوسری مملکتوں میں تفریق کی کارروائی اس قسم کی پردہ پوشی کی کوشش کے بغیر جاری رہی ہے۔ قدیم روما پر نظر کرو، وہاں (جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں) قنصل کسی ایسے جمہوری عہدہ دار کی حیثیت سے نمودار نہیں ہوا جو

بادشاہ کی جگہ مقرر کر دیا گیا ہو بلکہ وہ خود بادشاہ کی حیثیت سے نمودار ہوا جو مسلسل بیرونی مداخلت کی وجہ سے خطاب و منصب شاہی سے محروم ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب سے اولیں قناصل شاید زندگی بھر کے لئے حکمراں ہوا کرتے ہونگے اور وہ صرف ٹارکوئین کے خاندان سے مقرر ہوتے ہونگے لیکن تاریخ میں نہایت ہی صریحی طور پر یہ مندرج ہے کہ ان کے فرائض بالکل اسی طرح کر کے آہستہ آہستہ تقسیم ہو گئے تھے جس طرح ہم انگلستان میں شاہی فرائض کی تقسیم کا حال ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں، کیونکہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک خاص سال میں پریٹر کا عہدہ اور ایک خاص سال میں سنسر کا عہدہ تجویز ہوا تھا۔ پریٹر عادل تھا اور سنسر کے سپرد علاوہ صدر محل کے فرائض کے بعض اعلیٰ مالی فرائض بھی تھے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً یہ سب فرائض قنصل انجام دیتا ہوگا۔ انگلستان کے بادشاہ کی طرح اولاً وہ عادل بھی تھا مگر یہ کام اس کے ہاتھ سے نکال لیا گیا۔ البتہ انگلستان کی طرح اس مفروضے کے ذریعے سے نہیں کہ وہ دوسرے کی زبان سے قانون کا اعلان کرتا ہے بلکہ علانیہ طور پر ایسا کیا گیا۔ جب اختیار کے یہ تمام تحریجات واقع ہو چکے تو ایک مدت تک رومانی قنصل زیادہ تر ایک فوجی سپہ سالار کی حیثیت میں نمایاں رہا مگر جمہوریت کے آخری برسوں میں یہ کام بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جنگ کا کام اب خصوصیت کے ساتھ پروکانسل اور پروپریٹر کے تفویض کر دیا گیا اور سسرو کے زمانہ میں قنصل کی حیثیت ایک ملکی خطاب یافتہ کی سی رہ گئی۔

روما میں فرائض حکومت کی یہ تقسیم، عمومی اختیار کی ترقی اور عمومی اصول کی فتحمندیوں کے دوش بدوش چلتی رہی تھی۔ اسی طرح انگلستان میں اس قسم کی تقسیم پارلیمنٹ کی ترقی کے ہمقدم چلتی رہی۔ شاہان اسٹوارٹ کے زمانہ سے حکومتی محکمے تعداد اور امتیاز میں برابر بڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرح فوجی محکمہ قایم ہو کر بحری محکمہ سے الگ ہو گیا اور پھر دونوں ترقی کر کے بادشاہ کے اثر سے آزاد ہو گئے۔ وزرا (معتمدان مملکت) کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے۔ ایک محکمہ حکومت مقامی کا اور دوسرا تعلیمات کا قایم کیا گیا ہے۔ یہ تمام ارتقا، حکومت پر پارلیمنٹی اقتدار کے ارتقا کے ساتھ ہمعصرانہ طور پر چلتا رہا ہے مگر اب اس پر نظر کرو کہ

ان میں سے ہر ایک ارتقا دوسرے سے بالکل ممیز و آزاد ہے اور ہر ایک ترقی مختلف اسباب سے ہوئی ہے۔ حکومت کے فرائض کی تقسیم کی ضرورت قوم کی وسعت و پیچیدگی میں ترقی کر جانے کی وجہ سے لاحق ہوئی۔ یہ عمومی اصول کی ترقی کا اثر نہیں ہے اور اگر عمومی اصول میں مطلق ترقی نہ ہوتی جب بھی یہ اسی طرح سے ہوتا اور اس میں کوئی کمی نہ ہوتی۔ تاریخ سے اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔

بعض یورپی مملکتیں وسعت و پیچیدگی میں بہت بڑھ گئیں، حالانکہ ہنوز وہ مطلق العنان حکومت کے تحت میں تھیں۔ یہ امر بالتخصیص فرانس پر صادق آتا ہے جو لوئی پانزدہم کے زمانہ میں سب سے زیادہ متمدن سلطنت تھا، اور دولت، تجارت، اور نوآبادیات کے معاملہ میں ہنوز انگلستان کے دوش بدوش چل رہا تھا۔ تاہم اس میں ایک ایسی حکومت تھی جو بالکل مطلق العنان اور قریب قریب بزنطینی طرز کی تھی۔ کیا اس وقت فرانس پر وہ ذات خاص حکمرانی کرتی تھی جسے لوئی پانزدہم کہتے تھے؟ کیا وہ قانون سازی کرتا تھا یا قوانین کا نفاذ کرتا تھا یا فوج اور بیڑے کی کمان کرتا تھا؟ ہرگز نہیں وہ تو کسی خاص شخص کی طرح عام نگرانی بھی نہیں کرتا تھا۔ غالباً اس کی ذاتی حکومت تقریباً ایسی ہی کالعدم تھی جیسی اس وقت انگلستان کے بادشاہ کی ہے۔ پھر بھی فرانس ایک مطلق العنان حکومت کے تحت میں تھا۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ بادشاہ کے فرائض عہدہ داروں کی ایک تعداد کے اندر منقسم کر دیے گئے تھے۔ فرانس پر ایک وزیر اعظم، ایک چانسلر، ایک صدر محاسب، ایک وزیر جنگ ایک وزیر بحری اور ایک وزیر نوآبادی حکمرانی کرتے تھے۔ انھیں سران محکمجات کے تحت میں مہتممان اعلیٰ صوبوں پر حکمرانی کرتے تھے مگر یہ عہدہ دار ایک کمزور بادشاہ کے تحت میں اپنے اپنے محکموں میں عملاً مطلق العنان تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شخصی حکومت کیونکر دو شکلیں اختیار کر سکتی ہے ایک یہ کہ وہ بالکلیہ ایک ہی شخص کے قبضے میں ہو گر اس کا امکان صرف چھوٹی اور سادی ہی مملکت میں ہے، دوسری یہ کہ جہاں مملکت وسیع و پیچیدہ ہو (اور زمانۂ جدید کی تقریباً تمام ہی مملکتیں اسی نوع کی ہیں) وہاں شخصی حکومت کا میلان انقسام کی طرف ہوتا ہے۔ گر جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہ انقسام صحیح معنی میں متعدد اشخاص کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ

ایک ایک کر کے وہ ایک تعداد میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی تقسیم شدہ مطلق العنانی کے لیے "ایک بھدا نام "وفریت" کا ایجاد کیا گیا ہے اور جدید دنیا کو مطلق العنانی کی جو خاص شکل معلوم ہے وہ عملاً یہی ہے۔ اگر جمعیت مطلقاً نہ ہو یا ہو تو کم بے حقیقت ہو تو وفریت کی مطلق العنانی میں اس بناء پر کوئی کمی نہیں آتی کہ اس نے اختیار کو مختلف اشخاص میں تقسیم کر دیا ہے۔

پس اس رائے کے مطابق حکومت بالعموم انفرادی ہوتی ہے مگر یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا اجتماع ایک شخص واحد کے قبضے میں ہو جائے یا وہ مختلف اشخاص میں تقسیم ہو جائے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے قرار دے دیا ہے، حکومت کے پہلو بہ پہلو ہر ایک مملکت کے اندر ایک ایسی قوت ہونا چاہیے جو اہمیت میں قوت حکمرانی سے کم نہ ہو یعنی اسے حکومت سازی کا اختیار حاصل ہونا چاہیے۔

اب چونکہ ہم مملکت کو ایک زندہ عضویہ تسلیم کرتے ہیں، اس لیے ہمیں توقع یہ ہوتی ہے کہ اس کے ہر عضو میں ہم تدریجی نشو و نما دیکھیں گے جس طرح ہم خود حکومت کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بتدریج ایک ممیز شکل حاصل کرتی ہے، جس طرح ہم اس کا قدم بقدم پتا چلاتے ہوئے قسیسیت اور ابوت کی ہیولانی شکلوں تک پہنچتے ہیں اسی طرح ہمیں یہ بھی توقع کرنا چاہیے کہ ہم حکومت سازی کے اختیار کو غیر مکمل ارتقا کے ہر ایک درجے میں دیکھیں گے اور اگر ہم اسے گاہ بگاہ بالکلیہ غیر منتظم حالت میں پائیں تو ہمیں اس پر بھی متعجب نہ ہونا چاہیے اس لیے تاریخ کے بابوں میں کسے ہیں کوئی باب اس سے زیادہ سہل الفہم نہیں معلوم ہوتا جتنے وہ ابواب جن میں ہمیں ایسی قوموں اور ملتوں کا حال بتایا گیا ہے جو حکومت ساز عضو سے محروم ہوتی ہیں۔ گر جب وہ حکومت کے تغیر یعنی ایک حکومت کے تنزل کرنے اور دوسری نئی حکومت کے تقرر کرنے کے مرحلے سے دوچار ہوتی ہیں تو ششدر و خائف ہو کر رہ جاتی ہیں۔ قوانین کے متعلق ... یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ہمیں تو قوانین کا بنانا ایک نہایت ہی سادہ کام معلوم ہوتا ہے لیکن تاریخ دنیا کے بعض عہدوں میں عام رائے یہ تھی کہ قوانین آسمان سے اترتے ہیں۔ انسان انھیں نہیں بنا سکتا۔ یہی امر حکومتوں کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے۔

انسان کبھی تو اپنے کو حکومت کے تحت پاکر شکر گزار ہوتا ہے یعنی اس نے حکومت کی اطاعت کے فرض کو سمجھ لیا ہے مگر جب کسی اتفاق سے حکومت غایب ہو جاتی ہے اور ایک نئی حکومت کی ضرورت پڑ جاتی ہے یا جب حکمراں کی بدنفسی کی وجہ سے نعمت ہونے کے بجائے حکومت ایک ناقابل برداشت بلا ہو جاتی ہے تو یہی انسان تحیر و خوف زدہ رہ جاتے ہیں۔ یہ لوگ اشارات و علامات کے لیے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھاتے ہیں یا چڑیوں کی آواز پر کان لگاتے ہیں جس کی رسائی آسمان تک تھی، یا قربانی کے جانوروں کی آنتوں کو بغور دیکھتے ہیں جن پر دیوتا یا دیوی نے از راہ مرحمت اپنی مرضی لکھدی ہوگی یا نبیوں سے مشورہ کرتے ہیں۔ سیاسی عضویہ بھی ہی حیوانی ترقی کی مکلف یعنی ارتقائی محرک ہے اس سے کسی عضو کی کمی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس قسم کی مملکت میں حکومت کا عضو تو بن چکتا ہے مگر حکومت ساز عضو ابھی بننا باقی رہتا ہے۔

اس عضو کی ترقی کے انتظار کے طولانی عہد میں، جب کہ حکومت کی تکوین ہنوز ایک عقدۂ لاینحل سمجھی جاتی تھی تو اس کا عارضی حل دریافت ہو گیا تھا جو معمولی حالات کے لیے کافی تھا۔ کوئی ناقص بادشاہ جبر و زور سے ہی علیحدہ کیا جا سکتا تھا مگر جب اقتضائے فطرت جب بادشاہ کی جگہ خالی ہوتی تھی تو اس کا علاج موروثی جانشینی کے قاعدہ سے ہونے لگا۔ جس طرح ملک میں، اسی طرح حکومت میں بھی لڑکا ایک طرح پر باپ کا مثل سمجھا جانے لگا کیونکہ وہ خود بھی استداد زمانہ سے اپنی باری میں باپ ہو جائے گا۔ بعض مملکتوں میں قانون دانوں نے اس مشکل کو اس طرح ہموار کر دیا کہ جانشینی کا ایک مکمل زینہ تیار کر دیا، مگر بعض دوسری مملکتوں میں یہ مسئلہ لاینحل معلوم ہوا اور شاہی کے راست جانشینوں کے نہ ہونے کی صورت میں یہ مملکتیں ابتری کی ناقابل رحم حالت کو پہنچ گئیں۔ سلافی فونی مملکتوں نے خصوصیت سے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ ایک خاص نقطے سے آگے وراثت کے مفروضے کو قبول کرنے کے ناقابل ہیں۔ چنانچہ پولستان میں یاگیلا کے سلسلہ کے ختم ہو جانے سے موروثی بادشاہی کا سارا نظم درہم و برہم ہو گیا اور روس میں خاندان روُرک کے فنا ہو جانے کی وجہ سے ہیبت ناک ہیجان و اضطراب اور

وحشیانہ عمومی اوہام کا ایک دور قایم ہو گیا۔

لیکن اب ایک مزید ارتقا نے صورت اختیار کی۔ حکمراں کی عادت یہ ہو گئی ہے کہ وہ مختلف اغراض کے لیے جمعیتوں کو طلب کرتا ہے۔ قدیم زمانوں میں شہریوں کو سپاہیوں کی طرح میدان جنگ میں جانے کے لئے بلایا جاتا تھا اور کوچ شروع ہونے سے قبل حکمران انھیں خطاب کرتا اور بعض معاملات عامہ پر ان سے کچھ درخواست بھی کرتا تھا۔ اس کے خطاب کے بعد سرداروں کو یہ اجازت ہوتی تھی کہ وہ اپنی رائے دیں، اور مجمع کو شور کے ذریعہ سے اپنی رضامندی اور بڑبڑانے سے اپنے اختلاف کے اظہار کا موقع ہوتا تھا۔ جدید تر زمانے میں حکمراں کو مجبور ہونا پڑا کہ روپیہ کے لئے قوم کے نمایندوں کی طرف رجوع کرے اور اس کے عوض ان کے شکایات کو سنے۔ دونوں صورتوں میں یہ جمعیت ایک ایسے تخم کے مانند تھی جس میں بہت کچھ نمو کی قوت تھی۔ یہ بڑبڑاہٹ اور شکایت بڑھتے بڑھتے مخالفت کی حد تک اور مخالفت بغاوت کی حد تک پہنچ سکتی تھی، ایسی مخالفت جس میں کچھ ظاہری ضوابط ملحوظ رہتے ہوں وہ قانونی حیثیت اختیار کر سکتی تھی، چنانچہ بمرور ایام، مخالفت کی ترقی یافتہ صورت کے اعتبار سے بغاوت بھی بعض خاص حالتوں میں حسب قانون سمجھی جانے لگی

اور اس طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے، جمعیت حکومت ساز قوت ہونے کے دعوے کی طرف بڑھی۔ اس قسم کی کارروائی کے ابتدائی مدارج کا حال ہم انگلستان کے انقلاب میں مطالعہ کر چکے ہیں مگر ہمیں یہ معلوم ہوا کہ انقلاب کے بعد انگلستان میں یہ ارتقا (جیسا کہ چاہئے تھا) بہ خط مستقیم آگے نہیں بڑھا بلکہ اتفاقی اسباب سے (جن کا ہم کسی قدر پتا چلا چکے ہیں) اس نے نہایت ہی غیر معمولی طور پر پیچیدہ راستہ اختیار کیا۔ یہ موخر انگریزی ارتقا مستثنی قسم کا ہے اور اس لئے نظریاتی اعتبار سے کم سبق آموز ہے۔

معمولی طرز عمل[1] وہ ہے جس کی نسبت میرا گمان ہے کہ قدیم روما میں واقع ہوا تھا

[1] اس لفظ پر مجھے بینل کا ایک حاشیہ ملا ہے۔ جس میں یہ تشریح ہے کہ مصنف نے اس لفظ کے کیا معنی لئے ہیں "معمولی اس لئے کہ اسم حقیقت کے مطابق ہے۔"

یہ دعوے کر چکنے کے بعد کہ صرف انتہائی ضرورت کے وقت حکومت سازی کے اختیار سے کام لینا چاہیے، جمعیت یہ دعوے کرنا شروع کر دے گی کہ انتہائی ضرورت سے کچھ کم درجہ پر بھی اس کا استعمال جایز ہو سکتا ہے، اور اس کے بعد یہ کہ اس قسم کی انتہائی حالتوں کے خطرے سے بچنے کے لیے حکمراں کے اختیار کو چند برسوں تک محدود کر دینا چاہیے، اس کے بعد یہ کہ جمعیت کو حکمراں کے نامزد کرنے میں بھی حصہ ملنا چاہیے رفتہ رفتہ عہدے کی میعاد بہت کم ہو جائے گی، اور جمعیت حکمراں کے جانشین کے آزادانہ انتخاب کا دعوے کرنے لگے گی۔ جمعیت یہ بھی کر سکتی ہے کہ اس حکمراں کے ساتھ ایک رفیق کار شریک کر کے اس پر نگرانی قایم کر دے اور اس طرح آخر الامر بادشاہ کی جگہ دو قناصل قایم ہو جائیں۔

لیکن اب یہ دیکھو کہ اسی کے پہلو بہ پہلو ایک دوسرا ارتقا بھی تقریباً ہمیشہ ہی وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے۔ آبادی بڑھتی جاتی ہے۔ دولت و فنون میں ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس لیے کم و بیش لازمی طور پر ایک شخص کے لیے حکومت کا چلانا زاید از ضرورت وزنی بار اور دشوار کام ہو جاتا ہے پس اس کے فرایض منقسم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ فوجی فرایض، عدالت کے فرایض یا پولیس کے فرایض سے جدا کیے جانے لگتے ہیں۔ اب قنصل کے پہلو میں، پریٹر اور کوئیسٹر بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ جب فرایض کی یہ تقسیم ایسی مملکت میں واقع ہوتی ہے جس میں حکومت ساز عضو ہنوز نمودار نہیں ہوا تو اس کا نتیجہ و مرکزیت ہوتا ہے اور بادشاہ بہت آسانی کے ساتھ غیر مقصر اختیار کی ظاہری شان کو قایم رکھ سکتا ہے اور نئے عہدہ دار اس کے وکیل یا اس کے نفس ناطقہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ مگر جہاں بادشاہی پہلے ہی قنصلیت تک گھٹ چکی ہو اور انتخابی و سالانہ ہو گئی ہو، وہاں جب یہ عمل وقوع پذیر ہوتا ہے تو کیا صورت پیش آتی ہے؟ اس صورت میں نئے عہدہ دار بادشاہ یا قنصل کے پہلو بہ پہلو نمایاں ہوں گے اور کم و بیش اس سے مساوی درجہ رکھتے ہونگے اور اس قسم کی مملکت میں حکومت کی اصلی و ابتدائی وحدت تقریباً بالکل ہی غائب ہو جائے گی، شاہی بالکلیہ ہوا ہو جائے گی اور اس کی جگہ متعدد حکام لے لینگے جو سب کے سب کم و بیش مساوی درجہ کے ہوتے ہونگے، اور کوئی بھی ان میں سے زیادہ باشان و شکوہ نہیں ہوگا۔

اس اثنا میں جمعیت کی اہمیت بڑھتی جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ دنیا کی نظر میں وہ بالآخر ایک ایسی حکومت کو (جو اس طرح گھٹ گئی ہو) بالکل ماند کر دے روما میں اگر حکومت ساز جمعیتیں یعنی کیمیشیا (Comitia) جلیل القدر مباحث کا منظر ہوتیں تو وہاں یہ امر فی الواقع جتنا وجود میں آیا اس سے بہت بڑھ کر ظاہر ہوتا۔ لیکن یہ جمعیتیں بحث و مباحثہ کے مقامات نہ تھے بلکہ روما میں بحث و مباحثہ کرنے والی جمعیت مجلس سینارت تھی، اور یہ حکومت ساز جمعیت نہیں تھی۔ ایتھنز میں بھی ہوا، وہاں وہ عہدہ دار جو کسی وقت میں بڑے جلیل القدر افراد ہوتے تھے اکلیزیا کے سامنے گھٹتے گھٹتے تقریباً بالکل نابدید ہو گئے۔ روما کے قناصل کی اور پریٹروں کی شاندار حیثیت بھی زایل نہیں ہوی مگر ایتھنز کے آرفن بالکل ہی بے حقیقت ہو گئے۔

ان حالات میں، بہ ظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ ایسی مملکت پر عہدہ دار نہیں بلکہ جمعیت حکمران ہو گی۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ جمعیت بہت ہی مستعدی کے ساتھ معاملت میں مصروف و مشغول ہے اور عہدہ داروں کی بہ نسبت بہت زیادہ نمایاں ہے۔ اگر ہم لفظ "حکمرانی" کو بغیر قطعیت کے استعمال کریں تو اس قسم کی مملکت کی نسبت یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس پر جمعیت کی حکومت ہے، مگر جیسا کہ میں نے ثابت کر دیا ہے۔ جمعیت کا شغل اکثر صورتوں میں فی الواقع حکومت نہیں ہے۔ روما میں جمعیت کا کام کم و بیش اتنا ہی تھا کہ وہ حکام کا انتخاب کر دے۔ سترھویں صدی میں انگلستان کی پارلیمنٹ کی مستعدی کا مقصود یہ تھا کہ حکومت کو مرعوب کر دے بلکہ انتہائی صورتوں میں حکومت کو تباہ کر دینے کے اختیار کو بھی کام میں لائے۔ انیسویں صدی میں بظاہر اس پارلیمنٹ کا کام زیادہ تر حکومت کرنا نہیں ہے بلکہ حکومت کرنے والی وزارت کا انتخاب اور اس کی تائید ہے، اور اگرچہ پہلی نظر میں وزارت انگلستان پارلیمنٹ کا صرف ایک جزو معلوم ہوگی مگر زیادہ غایر نظر سے دیکھنے سے واضح ہو جائیگا کہ وہ درحقیقت پارلیمنٹ سے ممیز ہے۔

اگر اس وقت تک ہمیں "حکومت بذریعہ متعدد اشخاص" کی کوئی صاف صورت نہیں ملی ہے تو کیا اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اس قسم کی کوئی شئے موجود ہی نہیں ہے؟ کیا ہم یہ کہیں کہ نہ صرف اکثر بلکہ ہمیشہ جہاں کہیں تمام شہریوں یا

ان کے نمایندوں کی کوئی جمعیت حکمراں نظر آتی ہے، وہاں حکومت فی الواقع عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جن کی خاموشانہ مستعدی عام بحث اور مباحثے کے شور وشغب میں نظر انداز ہو جاتی ہے۔ نہیں؟ اگر ہم ایسا کہیں تو ہم حد سے بڑھ جائینگے۔

میں نے بارہا اس تجربے کا ذکر کیا ہے، جو انجمنوں اور دائروں کے وسیع تر معاملات کے انتظام کے متعلق ہم سب کو حاصل ہے۔ ان انتظامات میں ہدایت کا کام عہدہ داروں کی بہ نسبت زیادہ تر جمعیت کے قبضے میں، اور معتمد کی بہ نسبت مجلس عاملہ کے اختیار میں، معلوم ہوتا ہے۔ معتمد، مجلس کا آقا معلوم ہونے کے بجائے زیادہ تر اس کا گماشتہ یا خادم معلوم ہوتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس قسم کا نظم جو تمام شخصیہ انعال میں اس قدر طبعی معلوم ہوتا ہے، تمام شخصیتوں میں سے سب سے بڑے شخصیہ یعنی مملکت میں بھی کیوں نہ رائج ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مملکت نے بعض صورتوں میں ایسا نہ کیا ہوتا تو یہ امر تعجب خیز ہوتا۔ بااین ہمہ، مملکت اور کوئی خانگی انجمن جو مملکت کے زیر حفاظت قایم ہو، ان دونوں کی حیثیت میں بہت اہم فرق ہے۔ ہم یہ قرار دے چکے ہیں کہ قوم پر جس قدر دباؤ سخت ہوتا ہے اسی نسبت سے مملکت مضبوط وسخت گیر ہوتی ہے اور جس دباؤ کا سب سے زیادہ خیال کیا جاتا ہے وہ دشمنوں اور ہمسایوں کا دباؤ ہے۔ میدان جنگ کی فوج کی حکومت کسی خاموش قصبہ کی حکومت کی بہ نسبت زیادہ مضبوط اور زیادہ شخصی طرز کی ہوتی ہے۔ اب دیکھو کہ خانگی انجمن کے بالمقابل مملکت ایک حد تک وہی حیثیت رکھتی ہے جو فوج کی قصبہ کے بالمقابل ہوتی ہے۔ خانگی انجمن مملکت کے اندر ہے اور مملکت کے قوانین سے اس کی حفاظت ہوتی ہے خود مملکت کے دشمنوں اور رقیبوں سے دو چار ہے جن کے مقابلہ میں اسے خود اپنی حفاظت کرنا ہے۔ تاریخ میں اس سبب کے عمل کا پتہ چلا لینا آسان ہے جس کی وجہ سے مملکتیں، حکومت کے ادنیٰ اقسام سے علٰحدہ ہو گئی ہیں۔ میں ادھر حال کے زمانہ کی دو ایک مثالیں نقل کرونگا۔

امریکی نوآبادیوں نے انگلستان سے قطع تعلق کرنے کے بعد جو شکل اول اول اختیار کی اس میں انھوں نے بغیر کسی رئیس کے اپنی ایک عہدیت بنائی۔ لیکن اس نظم نے کام نہ دیا، چنانچہ ۱۷۸۹ء میں انھوں نے اس عہدیت کے بجائے "ممالک متحدہ"

کی تنظیم قایم کی اور اس کی سرگروہی کے لئے ایک رئیس مقرر کر کے اپنا پہلا رئیس اس شخص کو منتخب کیا جو ان میں بہترین سپہ سالار تھا۔ اس اتحاد کی تاریخ ما بعد میں بھی یہ مشاہدہ ہو سکتا ہے کہ جلیل القدر سپہ سالار ہمیشہ صدارت کے مستحق سمجھے گئے ہیں۔ امریکہ کو تین لڑائیاں لڑنا پڑیں اور ہر لڑائی میں ایک نہ ایک ممتاز سپہ سالار نے نام حاصل کیا چنانچہ واشنگٹن اینڈریو جیکسن اور گرانٹ ان تینوں سپہ سالاروں میں سے ہر ایک بعد میں دو دو میعاد کے لئے رئیس (صدر جمہوریہ) رہا ہے۔

فرانس میں لوئی شانزدہم کے زوال کے بعد جمہوری احساس اس قدر قوی تھا کہ لوگ کسی صدر جمہوریہ کے خیال تک کے روادار نہ تھے اس لئے ان کی جمہوریت میں عاملانہ جماعت کے لئے پانچ شخصوں کی ایک نظامت قائم ہوئی۔ یہ تعداد ضرورت سے زیادہ معلوم ہوئی چنانچہ "انقلاب برومیر" کا مقصد ہی تھا کہ اس سے زیادہ شخصی عاملانہ حکومت رائج کی جائے۔ پانچ ناظموں کے بجائے تین قناصل مقرر کئے گئے اور ان تین میں سے ایک قنصل دوسروں کے بہ نسبت بہت زیادہ با اختیار بنادیا گیا۔ ۱۸۴۹ء والی دوسری فرانسیسی جمہوریت اور ۱۸۷۵ء والی تیسری جمہوریت میں ایک ایک صدر کا تقرر کیا گیا۔

صرف سوئیزرستان میں ہم ایک ایسی جمہوریت دیکھتے ہیں جو بغیر رئیس کے ہے مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے سوئیزرستان دول عظام کی ضمانت کے باعث خطرۂ جنگ سے خارج ہے۔

لیکن تاریخ کے دوران میں اکثر ایسا واقع ہوا ہے کہ کوئی جماعت بالکل الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے عملاً دشمنوں کے خطرے سے باہر ہو یا یہ مملکت کوہستانی و بے آب و گیاہ ہونے یا ریگستانوں سے گھرے ہونے کے باعث حملہ آوروں کے لئے باعث طمع نہ ہوئی ہو اور اس قوم پر مدتوں کسی نے حملہ نہ کیا ہو۔ اس قسم کی جماعت کی حالت خانگی انجمن کی سی ہوتی ہے اور جو شے صحیح معنی میں حکومت کہلاتی ہے اس کی اسے بہت کم ضرورت ہوتی ہے۔ پس یہاں جمعیت واقعی حکمران کا کام کرنے لگیگی اور کامیابی کے ساتھ ایسا کر سکے گی۔

غالباً یہی حال ترک وطن سے قبل بعض جرمانی قبایل کا تھا۔ حکومت جو

کچھ بھی ہو گی، اسی عمومی جمعیت کی ہو گی۔ قدیم سکسونوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ان میں کوئی بادشاہ نہیں ہوتا تھا۔ سویٹزرلینڈ کی صورت بھی زیادہ تر یہی رہی تھی، جاگیریت کی کمزوری کے زمانہ میں اس ملک پر حملہ نہایت دشوار تھا اور وہ غیر معمولی طور پر محفوظ تھا لہٰذا ضرورت نے اسے تنظیم کی کسی مضبوط شکل کے اختیار کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا۔

اس سے کسی قدر مشابہ ممالک متحدہ امریکہ کا حال ہے۔ جو کچھ میں نے انگلستان کے متعلق کہا ہے وہ ممالک متحدہ کے حالات سے مختلف ہے۔ انگلستان کے برعکس یہاں حکومت جمعیتوں کی جانب سے وجود میں نہیں آتی۔ رئیس جمہوریہ کا انتخاب کانگریس نہیں بلکہ قوم کرتی ہے، دوسری طرف وضع قوانین کا کام خاص کر کانگریس کے قبضے میں ہے اور انگلستان کی طرح یہ کانگریس وزرا کے زیر اقتدار نہیں ہوتی۔ بظاہر مجلس سنیات کو بھی عاملانہ حکومت میں واقعی حصہ ملتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تمام بڑی مملکتوں میں ممالک متحدہ امریکہ ہی ایک ایسی مملکت ہے جس پر سب سے کم دباؤ پڑتا ہے۔ اندرونی دباؤ اس طرح کم کر دیا گیا ہے کہ اسے ریاستوں کی حکومت اور مرکزی حکومت کے درمیان تقسیم کر دیا گیا ہے اور بیرونی دباؤ سے ملک کی گونہ منقطع حیثیت کی وجہ سے نجات مل گئی ہے۔ اگر یہ نظم اس سے زیادہ دقت طلب آزمایشوں میں پڑا ہوتا تو اغلب یہی ہے کہ اب سے قبل اس میں بہت کچھ ترمیم ہو گئی ہوتی۔

بعض دوسری مملکتوں میں دشمن کا دباؤ ہوتے ہوئے حکومت بذریعہ مجلس کا تجربہ کیا گیا اور اس کا انجام ناکامی پر ہوا۔ پولستان اس کی بہت ہی نمایاں مثال ہے۔ یہاں کسی حقیقی عاملانہ یا حاکمانہ اقتدار کو روا نہ رکھا گیا تا آنکہ وقت گزر گیا۔ آخری لمحہ میں انتخابی بادشاہی کو ہٹا کر اس کے بجائے ایک زیادہ پائدار نظم قایم کرنے کی سعی کی گئی مگر تقسیم کن دول نے اسے چلنے نہ دیا۔

میں نے ایتھنز کے معاملہ کو سب سے آخر میں رکھا ہے، یہ وہ شہری مملکت ہے۔ جو علم و تمدن کی تاریخ میں اس قدر تاباں و درخشاں ہے، جس کی چمک دمک نے ایک وقت میں ہر ایک دوسری یونانی مملکت کو ماند کر دیا تھا، اور اگرچہ اس کی

خوشحالی کا دور زیادہ طویل نہیں ہوا، پھر بھی اتنا تو ضرور ہوا کہ اس کا زوال خود یونان ہی کے زوال کے ساتھ ہوا۔ یقین کے ساتھ میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ ایتھنز میں جمعیت حکمرانی نہیں کرتی تھی۔ درحقیقت شاید ہم یہ خیال کریں کہ اس میں خود ہماری ہی تنظیم کے مانند ایک نظم کے ابتدائی تخم موجود تھے۔ ممکن ہے کہ وہ خطیب جنھوں نے یکے بعد دیگرے مجلس کو اپنا گرویدہ بنا لیا وہ جمعیت کے ساختہ حکمراں سمجھے جائیں۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو پھر میں یہ کہونگا کہ یہ نظم بہت ڈھیلا ڈھالا تھا۔ اور دوسری طرف یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جمعیت خود وہ فرائض انجام دیتی تھی جو دوسری مملکتوں میں عہدہ داروں کو سپرد ہوا کرتے ہیں۔ جمعیت غیر ملکی سفراء سے گفتگو کرتی، جنگ و صلح کا تصفیہ کرتی، ایسی کارروائیاں تجویز کرتی جن کے بموجب جنگ کو چلایا جائے اور یہ سب کچھ غیر ملکی دشمنوں کے درمیان اور ایسے دباؤ کے تحت میں کرتی تھی جس سے قریب قریب کسی دوسری مملکت میں لوگوں کو زمام حکومت سخت کر دینے پر مائل ہونا پڑا ہے۔ درحقیقت تاریخ میں کوئی امر اس عظیم الشان "اکلیزیا" اس عظیم الشان دائمی محفل سے زیادہ تعجب خیز نہیں ہے جو واقعاً ایک مملکت پر حکمرانی کرتی اور مشکلات و خطرات کے اندر واقعاً اس کی رہبری کرتی تھی۔

اس قسم کے نظم کا قطعی طور پر ناکامیاب نہ ہو جانا تعجب انگیز ہے؛ مگر انصافاً یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اسے کامیابی ہوئی۔ ہمیں یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ایتھنز کی تاریخ کے درخشان و تابان دور میں اس نظم کی کوئی شرکت نہیں تھی۔ اس نے مارتھون اور سالامس کی لڑائیاں نہیں فتح کیں، اس نے اِسکیلوس کے کھیل نہیں لکھے، اس نے سقراط کی پرورش نہیں کی، اس نے پارتھے نون نہیں بنایا؛ یہ نظم فارقلیس کے زمانہ کا نظم نہیں تھا۔ جب تک فارقلیس زندہ رہا شخصی عنصر غالب رہا۔ طوسی دیدس کہتا ہے کہ ایتھنز پر اس کا اولیں شہری حکمرانی کرتا تھا۔ فارقلیس جمعیت کا بادشاہ تھا، اس کا خادم نہیں تھا؛ وہ بادشاہ کے سے انداز رکھتا اور پُرغرور سکوت سے کام لیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ پنکس کو جاتا تو زیوس سے یہ دعا کرتا کہ وہ زائد از ضرورت کلام نہ کر بیٹھے۔ اس کے مرنے تک یہ ہوا کہ متعدد اشخاص کی حکومت کا نظم پوری طرح ترقی

گر جاتا اور اس کے انتقال کے بعد ایتھنز کا زوال نہایت ہی واضح و بیّن طور پر شروع ہو گیا۔

اب میں نتیجہ یہ اخذ کرتا ہوں کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ جہاں مملکت کسی معقول دباؤ کے تحت میں ہوتی ہے وہاں حکومت بذریعہ جمعیت قابل عمل نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی جمعیت میں وہ سرعت عمل یا قوت فیصلہ نہیں ہوتی جو فوری خطرے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کافی ہو۔ اگر یہ کافی و وافی ہوتی تو حکومت بذریعہ جمعیت بہتر ہوتی اور شاید مشکل اوقات میں بھی جمعیت کے ذریعہ سے حکومت کرنے کی کوشش قوم پر نہایت ہی ہیبت آفریں اثر ڈالتی۔ اس حد تک ثابت کرنے کے لیے ایتھنز کی مستثنیٰ صورت کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ اس نظم کے تحت اہل ایتھنز کی ذہانت معجز نما حد تک تیز ہو گئی تھی، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ ایتھنز کا ہر ایک باشندہ کم و بیش مدبر تھا مگر یہ ظاہر کرنے کے لیے ایتھنز کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا کہ عمومی جمعیت کے ذریعے سے حکومت کافی و وافی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ تجربہ اگرچہ حیرت انگیز تھا مگر اسے بالیقین ناکامی ہوئی۔ دیموس تھینیس کے فصیح و بلیغ خطبات یہ ظاہر کرنے کے لیے موجود ہیں کہ حکومت کافی و وافی نہیں تھی اور انھیں خطبات سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ فارقلیس کے انتقال کے ایک صدی کے اندر ہی اندر ایتھنز کی خود مختاری کیوں جاتی رہی۔ "تیلعو سیوں" اور "تھو سیوں" سے تمہیں ایتھنز کے زوال کی شرح ملے گی، تم دیکھو گے کہ اس کا زوال اس وجہ سے ہوا کہ شدید دشواری اور خطرے کے زمانے میں کوئی عمومی جمعیت حکمرانی نہیں کر سکتی۔

خطبۂ ہشتم

واحد، ومتعدد کی حکومت (جسے عام زبان میں ملوکیت اور جمہوریت کہتے ہیں) اس کے متعلق میں غالباً کافی بحث کر چکا ہوں۔ متقابل الفاظ کا ایک جوڑ بھی ہے۔ جس سے ہم کچھ کم مانوس نہیں ہیں مگر اس کے متعلق میں نے ابھی تک بہت کم کہا ہے' یہ الفاظ اعیانیت' اور عمومیت' ہیں۔ اس وقت تک ہم نے تعریفات کا ایک معقول ذخیرہ جمع کر لیا ہے' مملکت ہائے عضوی' مملکت ہائے غیر عضوی' مملکت ہائے قبائلی مملکت ہائے مذہبی' مملکت ہائے خالص' مملکت ہائے شہری' مملکت ہائے ملکی (مرکزی ولامرکزی) دفاقیہ ہائے قویہ وضعیفہ مملکتیں جن میں حکومت کے حدود اختیار وسیع ہوتے ہیں اور وہ جن میں حکومت کے حدود اختیار تنگ ہوتے ہیں' مملکتیں جن میں کوئی حکومت ساز عضو ہوتا ہے اور وہ جن میں ایسا کوئی عضو نہیں ہوتا؛ مملکتیں جن میں حکومت کا اختیار ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ جن میں یہ اختیار منقسم ہوتا ہے' مگر کیا بعض مملکتیں اعیانی اور بعض عمومی نہیں ہوتی ہیں؟ اب وقت آ گیا ہے کہ اس سوال پر غور کیا جائے۔

موجودہ زمانے میں' اعیانیت اور عمومیت کے اس تقابل سے زیادہ شاید ہی کسی مسئلے پر بحث ہوتی ہو' اور اسی طرح کے دیگر تمام مسائل کی طرح اس پر بھی بحث اس طور سے ہوتی ہے کہ اس کی قطعی تعریف پر ادنی توجہ نہیں کی جاتی خود یہ اشتنا ہے کہ ناموں کے متعلق کیسے فکر ہے؟ آیا نفظی امتیازات کی کسے ضرورت ہے؟ ایک کہے گا کہ

عملی اعتبار سے ہم سب اعیانیت کے سر و مہر غیر انسانی عجب و نخوت کو اچھی طرح جانتے ہیں، دوسرا کہے گا کہ عملی اعتبار سے ہم سب عمومیت کی رکاکت کینہ توزی و درشت خوئی سے خوب واقف ہیں اور سوال یہ پیدا ہی نہیں ہوتا کہ ان دونوں میں نازک و دقیق امتیاز قایم کیا جائے، بلکہ دونوں میں سے ایک کو بالکلیہ دریا برد کر دیا جائے۔ میرے یہ تمام خطبات محض بیکار ہوں گے اگر اس حد پر پہنچ کر اب بھی میرے لئے اس امر پر زور دینا ضروری ہو کہ ہر نوع تعریف کی شدید ضرورت ہے اور اس کے بغیر سیاسی مباحث لازماً نامتناہی خوغا بن جائینگے جو حوصلہ مند مدبروں کے لئے تو بہت مفید ہو سکتے ہیں مگر دولت عامہ کے لئے ان کا کوئی نفع نہیں ہے۔

جب میں نے اس قوت کا ذکر کیا تھا جس سے مملکت کے اندر حکومت کی تائید ہوتی ہے تو میں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ یہ قوت کا منبع تمام قوم بھی ہو سکتی ہے اور اس کا ایک جزو بلکہ بے انتہا قلیل جزو بھی ہو سکتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ مملکتیں جس قدر وسیع یا تنگ بنیاد پر قایم ہوں گی اسی لحاظ سے ان کے اوصاف باطنی اور اشکال ظاہری میں بھی بہت بڑا فرق ہوگا۔

لیکن اس کے بعد، جو مملکتیں تنگ بنیاد پر قایم ہوتی ہیں ان میں بھی باہمد گر بہت وسیع فرق ہوتا ہے کیونکہ اشخاص کا جو گروہ حکومت کا موئد ہوتا ہے عام قوم کے ساتھ اس کے تعلقات نہایت ہی مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان تعلقات میں سے ایک نہایت ہی عام تعلق علانیہ مخاصمت کا تعلق ہے۔ ایک فوجی گروہ حکمراں کے گرد جمع رہتا ہے اور اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ قوم کو روندتا رہے۔ بعض صورتوں میں یہ نتیجہ ہوتا ہے فتح کا، مگر غالباً اکثر و بیشتر صورتوں میں (جیسا کہ مشرقی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے) یہ نتیجہ ہوتا ہے فوجی شہنشاہیوں کے انحطاط و انتشار کا، جہاں اجیر فوجیں مرکزی حکومت سے ٹوٹ کر مملکت کے کسی حصے پر تصرف کر لیتی ہیں اور اپنے سردار کو اس کا سلطان بنا لیتی ہیں۔

اس طرح پر جو مملکت وجود میں آتی ہے اس پر ہم ایک سے زائد مرتبہ غور کر چکے ہیں، اور اسے غیر عضوی قرار دے چکے ہیں۔ یہ ایک ایسی انتہائی صورت ہے کہ ہم نے تو یہ قرار دیدیا ہے کہ اسے مملکت کہنا ہی نہ چاہیئے بلکہ زیادہ سے زیادہ اسے

صرف نیم مملکت کہا جائے، مگر اب ہم یہ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ مملکت کے اور بہت سے انواع و اقسام ہیں جو اگرچہ انتہائی حد کو نہیں پہنچے ہیں، مگر ان میں بھی یہی خصوصیت موجود ہے۔

لاعضوی مملکت میں حکمراں گروہ جس قوم پر مظالم کی بوچھار کرتا ہے وہ اس گروہ سے بے تعلق ہوتا ہے۔ حیدر علی یا ٹیپو سلطان کے گرد مسلمانوں کا ایک گروہ جمع تھا جو مذہب اور ہر امر میں میسور کی دیسی آبادی سے مغایر تھا، مگر ایسی مملکت کا تصور قایم کرنا بھی آسان ہے جس میں حاکم اور محکوم آبادیوں کے درمیان ایسی خلیج نہ حائل ہو اور پھر بھی حکومت کا نظم اس کے بہت ہی مشابہ ہو نسل یا مذہب میں غیر ملکی ہونے کے بغیر بھی یہ ہو سکتا ہے کہ حکمران طبقہ یہ سمجھتا ہو کہ اس کے مقاصد جداگانہ ہیں، اور وہ حکومت کو کل کی بہبود کو نہیں بلکہ اپنے خاص مقاصد کو مدنظر رکھ کر چلائے اس قسم کی جزوی حکومت جو لفظ کے پورے مفہوم میں غیر عضوی نہیں ہے اس کے بھی بہت سے اقسام ہو سکتے ہیں۔

قدیم لقونیہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دوریانی گروہ فاتحین کی حیثیت سے اکائیائی کی آبادی میں سکونت پذیر ہو گیا تھا مگر اس قسم کی مملکت ان ترکی مملکتوں کی بہ نسبت بہت کم غیر عضوی ہوتی ہے جن کا میں نے ابھی ابھی حوالہ دیا ہے کیونکہ یہاں فاتح و مفتوح سا ہم قوم ہم زبان اور ہم مذہب ہوتے ہیں۔

رومائی جو حکومت اطالوی آبادیوں میں یعنی لاطینوں اور سامینوں کے درمیان برنائے فتح قایم ہوی، اس کی نسبت بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مدار فتح پر تھا مگر فاتحین اور مفتوحین کے درمیان قرابت و مذہب کا رابطہ بھی موجود تھا۔

دوسری نوع، وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں کسی قسم کی غیر ملکی مداخلت مطلق نہ ہوئی ہو مگر داخلی تحریکات نے قوم کے کسی ایک طبقہ یا جزو کو باقی تمام قوم پر عظیم الشان فوقیت دے دی ہو اور اس طبقہ یا جزو نے اس فوقیت سے نفع اٹھا کر حکومت کو غصب کر لیا یا اسے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہو۔

اس قسم کے اغتصاب کی سب سے زیادہ عام صورت اس وقت واقع

ہوتی ہے جب وہ حکومت قایم کی جاتی ہے، جسے میں "شہنشاہی" (یا آمریت) کہتا ہوں۔ جس مملکت میں مستقل فوج ہو، وہ اگر چاہے تو اسے تقریباً ہمیشہ یہ قوت حاصل رہتی ہے کہ وہ حکومت کو غصب کرلے۔ اپنے انضباط و تنظیم کی وجہ سے وہ قوت میں قوم سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ ایسے واقعات کی کثرت کچھ کم نہیں ہے کہ فوج حکومت پر قبضہ کرنے کے لیئے اپنی اس فایق قوت سے کام لینے کا عزم کرلے۔ نتیجہ اس کا ایک ایسی حکومت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو اجنبی یا غیر عضوی نہیں ہوتی مگر غیر عضوی حکومتوں سے اس حد تک مشابہت رکھتی ہے کہ وہ قوم کے ایک حصہ کی خدمت گزار ہوتی ہے اور باغلب وجوہ تنہا (یا بدرجۂ اقل یہ کہ زیادہ تر) اس حصہ کے مقاصد کو پیش نظر رکھتی ہے۔ روما میں شہنشاہوں کے زمانہ میں، انگلستان میں کراموِل کے زمانہ میں اور فرانس میں نپولین کے زمانہ میں اسی قسم کی حکومتیں قایم تھیں۔

ان سلطنتوں میں جو حیثیت فوج کی ہے وہی حیثیت دوسری قسم کی سلطنتوں میں مذہبی گروہ کی ہے۔ سلطنت کی تکوین و ترقی کے معاملے میں مذہب کے وسیع اثر کے تعلق میں زور دے چکا ہوں جس زمانہ میں مذہب حاوی الاثر ہوتا ہے، کارکنان مذہبی کو غالب طبقے میں جانے کا موقع مل جاتا ہے۔ ان حالات میں کسی حد تک یہ ہوسکتا ہے اور ممکن ہے کہ بہت بڑی حد تک ایسا ہو جائے کہ سلطنت کی کل حکومت مذہبی طبقے کے خاص اغراض کے حسب خواہ بننے کے لئے خراب کردی جائے۔

ان دونوں صورتوں میں حاوی و غالب طبقہ بہت ہی صاف طور پر معین و مشخص ہوتا ہے، اور یہ وردی پوش ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم مملکت کی ایک ایسی نوع پر پہنچتے ہیں جس میں اسی قسم کا ایک حاوی طبقہ ہوتا ہے مگر وہ آنکھوں کو ظاہر طور پر اتنا صاف نظر نہیں آتا۔ اس میں حکومت کسی ایسی جماعت کے ہاتھ میں نہیں آجاتی جو کسی پیشہ یا طبقہ سے مرکب ہو بلکہ وہ ہم مقصد اشخاص کے قبضہ میں آجاتی ہے، یعنی کچھ لوگ جن کے ایک ہی سے اشغال اور ایک ہی سے اغراض ہوتے ہیں، وہ ایک ہی قسم کی کارروائیوں کے خواہاں ہوتے ہیں اور بالطبع ان کارروائیوں کو ترقی دینے پر متحد ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ یا عزمیندار ہوتے ہیں اور یا ساہوکار یا صناع"۔

اگرچہ تاریخی طور پر اکثر ایسا ہوتا نہیں مگر پھر بھی تم دیکھو گے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ یہ حاوی و غالب طبقہ اپنا یہ غلبہ کسی قسم کی قابلیت یا خدمت عامہ کے ذریعہ سے نہ حاصل کرے بلکہ محض اتفاقاً اسے یہ فایدہ پہنچ جائے۔ محض دولت، اہل حرفہ کے طبقہ کو یہ موقع دے سکتی ہے، یا آلات حرب کے قبضہ اور انضباط سے فوج کو یہ موقع مل سکتا ہے، بعض صورتوں میں اوہام پرستی اور فریب کاری سے طبقۂ قسیس کو یہ نعمت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ سب ممکن ہے اور نہ صرف ممکن ہے بلکہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر ایسا واقع ہوا ہے کہ کوئی طبقہ جسے اپنے جلیل القدر قومی خدمات کی وجہ سے عروج و نمود حاصل ہو گیا ہو، وہ اس سے مدتوں بعد تک بھی حاوی و غالب رہا ہے جب کہ اس کے استحقاقی صفات زایل ہو چکے ہوں۔ چنانچہ جس مذہبی اعتقاد نے ہسپانیوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ عربوں کو ملک سے نکال دیں، اس اعتقاد کی پرداخت طبقۂ قسیس نے کی تھی اور اس کے صلہ میں اس طبقہ کو بڑا اثر حاصل ہو گیا تھا مگر دو صدی بعد جب اسپین پر خاندان بوربون کی حکمرانی شروع ہوئی، تو انھیں یہ معلوم ہوا کہ ملک کو کلیسا پر قربان کر دیا گیا ہے درآنحالیکہ اس وقت کسی حیثیت سے کلیسا اس فوقیت کا سزاوار معلوم نہیں ہوتا تھا۔

پس ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ مملکتوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا موجود ہے کہ جس میں کل کی بہبود اس کے کسی ایک جزو کے مقاصد پر قربان کر دی جاتی ہے۔

زمانۂ جدید میں، عام رواج یہ ہے کہ اس نظم کو "اعیانیت" کہا جاتا ہے اور اس طریق میں جو حاوی و غالب باقی حصۂ قوم کو اپنا شکار بناتا ہے اسے بھی ہم "طبقۂ اعیان" کہتے ہیں۔ چنانچہ آسٹریلیا میں زمین کے اجارہ دار "زمیں گیر طبقۂ اعیان" کہلاتے تھے، امریکہ میں ہم "اعیان پارچہ باف"، "اعیان پیڑول فروش" یہ لفظ، اور اسی طرح کے بہت سے الفاظ سنتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ دستور نظم جس میں حکومت ایمانداری کے ساتھ کل قوم کی بہبود کے لئے چلائی جاتی ہے اسے ہم "عمومیت" کہتے ہیں۔ اس موقع پر اپنے اصلی معنی سے ان الفاظ کی تخریب بہت حیران کن معلوم ہوتی ہے۔ ارسطو کے یہاں "عمومیت" اس سے بالکل ہی مختلف معنی میں ہے اس کے نزدیک یہ وہ نظم ہے جس کے تحت میں حکومت کل کے بہبود کی فکر نہیں کرتی بلکہ اس کے ایک جزو یعنی عوام کے فائدے سے

کے لئے کجروی اختیار کر لیتی ہے، اور ارسطو کے نزدیک "اعیانیت" ایک صحیح نظم ہے۔ اور اس سے مراد اچھے لوگوں کی حکومت ہے۔

یہ ضرور ہے کہ ہم ارسطو کے تمام تعریفات قبول کرنے کے پابند نہیں ہیں مگر یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جہاں ہمیں "عدیدیت" کہنا چاہیئے وہاں "اعیانیت" کہنے سے ہمیں کیا فایدہ پہنچتا ہے۔ "پارچہ باف عدیدیت" یا "پٹرول فروش عدیدیت" بالکل قابل اطمینان اور نا قابل اعتراض الفاظ ہوتے۔ مگر جب لفظ "اعیانیت" کے ساتھ ایک بڑا مفہوم لگا دیا جاتا ہے تو وہ لفظ ہم سے ضایع ہو جاتا ہے جس کا تصور یہ تھا کہ اچھے اشخاص کی حکومت اپنے اشخاص کی حیثیت سے ہو، اور اس لفظ کے ضایع کر دینے میں ہمیں اس تصور کے ضایع کر دینے کا بھی اندیشہ لگا ہوا ہے۔ یہ تخریب دفساد کس طرح سے پیدا ہوا، اس کا سمجھ لینا بہت آسان ہے۔ یہ ایک لازمی امر ہو گیا ہے کہ عدیدی گروہ ہمیشہ اپنے کو اعیانی کہتا ہے۔ حکومت پر اجارہ قایم کر لینے کو وہ یہ کہکر حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کوئی دخوبی کیوجہ سے صرف وہی حکمرانی کا سزاوار ہے اور وہ اپنے خود غرضانہ مقاصد کو بہبودِ عامہ کے نقاب کے نیچے چھپانا چاہتا ہے۔ وہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جس نام سے وہ مشہور و معروف ہو، اسے پسند کرنے کا حق خود اسی کو ہونا چاہیئے اور دوسروں کی خوش اخلاقی کی بنا پر اسے یہ حق حاصل بھی ہو جاتا ہے۔

یہ دیکھنا بھی کچھ مشکل نہیں ہے کہ عمومیت کے متعلق ارسطو کی تعریف کو ہم کیوں بھول گئے ہیں۔ اسے ہم فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ کُل کے نفع کو ایک جزو کے مفاد کے لیے قربان کیا جا سکتا ہے، مگر ہمارے اس زمانۂ جدید کا تجربہ یہ ہے کہ غاصب حصہ ہمیشہ قلیل التعداد ہوتا ہے، کثیر التعداد نہیں ہوتا۔ یہ کہ دولتمند غربا کو پامال کریں اور بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں کو کچلتے رہیں۔ اسے ہم عین امکان کے طور پر تسلیم کر لیتے ہیں مگر جب ارسطو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مملکت کی ایک غیر صحیح ہیئت اس کے برعکس ہے، جس میں امراء غربا پر اور قلیل، کثیر پر قربان کر دئے جاتے ہیں تو ہمارا میلان غالباً یہی ہوگا کہ اس قسم کے دعوے باطل پر مسکرا دیں۔ ہمیں یہ ایک نظریاتی و ملایانہ بحث معلوم ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ عمومیت جیسے اچھے لفظ کو بیکار خدمت

سے نکال کر ایک بے خدمت عہدے پر مقرر کر دیں کہ وہ ایک ایسے نظم کی نمایندگی کرے جو واقعتاً موجود نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ چھوٹے سے یونان کو اس سے اعلیٰ و افضل سیاسی تجربہ حاصل تھا جو زمانۂ جدیدہ کے عظیم الشان یورپ کو حاصل ہے۔ سیاسیات کا تمام عمومی پہلو ان لوگوں کو ہم سے زیادہ معلوم تھا۔ ہم تو اب ایک ہزار برس کی زمیندارانہ عدیدیت کے بعد عمومیت سے صرف آشنا ہو چلے ہیں شاید کہ آیندہ نسل اس لفظ کے متعلق ارسطو کے استعمال کو سمجھ سکے۔

بہر حال، میں نے اب مملکتوں کی ایک نئی قسم کو ممیز کیا ہے۔ یہ وہ قسم ہے جو عضوی اور غیر عضوی مملکتوں کے بین بین معلوم ہوتی ہے۔ صحتور سیاسی عضویہ اور نیم مملکت، جو سیاسی زور و قوت کی صرف نقل کرتی ہے، ان دونوں کے درمیان ہمیں ایک قسم ایسی ملتی ہے جو پُرزور کارروائیوں سے مرکب معلوم ہوتی ہے مگر غیر صحت بخش طریق پر۔ یہاں ایک عضو حد سے بڑھ گیا ہے اور وہ تمام تغذیہ کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ صحیح طور پر یہ نوع اس نام کی سزاوار نہیں ہے جس کی تعریف کی ہمیں فکر ہے۔ اعیانیت یہ نہیں ہے بلکہ اس سے کچھ مختلف شے ہے۔ فی الحال اس قسم کی مملکتوں کا کوئی جنسی نام نہیں ہے۔ "عدیدیت" ان سلطنتوں میں اس نوع کا اظہار کرتی ہے جو عالم جدید میں سب سے زیادہ عام رہی ہیں مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حاوی طبقہ (جو اس قسم کی مملکتوں کی خصوصیت خاص ہے) وہ لازماً مختصر نہیں ہوتا اور ممکن ہے کہ وہ کثیر التعداد ہو۔ پس سر دست ہم ایسی مملکت کو "جماعتی مملکت" کا لقب دے سکتے ہیں۔

مگر اب یہ سوال ہے کہ اعیانیت کیا ہے؟ اس لفظ کے معنی نیکوں کی حکومت کے ہونا چاہئیں فی الواقع اگر لفظ "نیک" صرف خوش خلقی کے طور پر استعمال کیا جائے جس کے معنی محض دولتمند یا عالی نسب کے ہوں، تو پھر "اعیانیت" "عدیدیت" کا ایک خوش خلق نام ہے۔ مگر ہم مصنوعی اعیانیت کے پہلو میں کسی خالص اعیانیت کا بھی پتہ چلا سکتے ہیں یا نہیں؟ بالفاظ دیگر کیا ہم یہ قرار دے سکتے ہیں کہ ایسی مملکتیں بھی ہیں جن میں حکومت اور حکومت کی نگرانی صرف باا وصاف اشخاص کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور ایسی بھی ہیں جن میں کسی وصف کی ضرورت نہیں ہوتی؟

زمانۂ جدید کے مباحث میں اس سوال پر شاید ہی کبھی خیال رجوع ہوتا ہو کہ بہت بلند آہنگی کے ساتھ اعیانیت کی مذمت کی جاتی ہے مگر جب تم استدلال کی جانچ کرو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ اس کا ماحصل یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس زمانے کے وہ نظم جو خود کو اعیانیت کا نام دیتے ہیں وہ اس نام کے مستحق نہیں ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہے تو ان کے نقص سے خود اعیانیت کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ اس سوال کا جواب کہ آیا کوئی ایسی جانچ ہونا چاہیئے یا ہو سکتی ہے جس کے بموجب حکومت میں حصہ لینے کے متعلق لوگوں کی قابلیت کا یقین ہو سکے یہ نہیں ہو سکتا کہ دولت اس قسم کا معیار نہیں ہے، یا نسب اس قسم کا معیار نہیں ہے، اس سے کمتر یہ کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ دولت کی حکمرانی میں غربا پر ظلم و ستم ہوتا ہے اور نسب کی حکمرانی میں کم نسلوں پر۔ فرض کیا جائے کہ ان نام نہاد اعیانیات میں سے بہت سی محض بھیس بدلی ہوئی عدیدیات ہیں، یہ بھی فرض کرو کہ نکوئی کا جو معیار اس وقت تک عاید کیا جاتا تھا وہ بے انتہا بھدا اور تقریباً بیکار تھا، یہ سب باتیں فلاں اور فلاں نظم کے خلاف جو خود کو اعیانی کہتے ہیں بہت اچھی علی وجہ ہو سکتی ہیں مگر ان سے خود اعیانیت کے نظریئے کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ درحقیقت اس زمانہ کی تمام قیل و قال فی الواقع اعیانیت کے خلاف مطلق نہیں ہے بلکہ عدیدیت کے خلاف ہے۔ اعیانیت پر کوئی عملہ نہیں ہوتا، وہ تو نظر سے رہ جاتی ہے اور لوگ بے سمجھے بوجھے اس طرح کہنے لگتے ہیں کہ "ہاں اصلی اعیانیت کا معاملہ سو اگر کوئی ایسی شئے ہو سکتی ہے تو جب ہم اسے دیکھینگے اس وقت ہم یہ بتائیں گے کہ ہم اس کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں۔" عملاً اس سوال پر بحث اس طرح ہوتی ہے گویا عمومیت اور کسی قسم کی عدیدیت کے درمیان انتخاب درپیش ہے۔

میں یہاں لفظ "عمومیت" سے اس کے جدید مفہوم میں وہ حکومت مراد لیتا ہوں جس میں ہر شخص کا حصہ ہو۔ یہ کہ ہر شخص کو حکومت میں حصہ ملنا چاہیئے اس کا اس امر سے استدلال کیا جاتا ہے کہ عمدہ حکومت سے ہر شخص کو دلچسپی ہوگی اور اگر یہ دلیل پیش کی جائے کہ بعض لوگ اتنی بھی عقل نہیں رکھتے کہ خود اپنے مفاد کو سمجھ سکیں، چہ جائیکہ وہ کل مملکت کے مفاد کو سمجھیں تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ

دوسری تجویز پر بہ تو ان عمل ہو چکا ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ عملاً ہر شخص خود اپنے مفاد کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے اور جو لوگ دوسروں سے بہتر ہونے کا دعوے کرتے اور دوسروں کی اتالیقی اپنے ذمہ لینے پر آمادہ رہتے ہیں وہ لا محالہ آخر میں امانت میں خیانت کر جاتے ہیں۔ بولنگبروک کے "محب وطن بادشاہ" کی طرح اعیانیت بھی ایک بے اصل تصور ہے، عمل میں وہ محض عدیدیت ہی ہے۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ "یہ شخص حکومت میں حصہ لینے کے لئے ویسا ہی موزوں ہے جیسا وہ" اور کسی طبقہ کو حقِ رائے دہی میں شامل کرنے کے لئے صرف اتنا ظاہر کرنا کافی ہے کہ جب تک وہ اس سے خارج ہے اس وقت تک اس کے مقاصد پر لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ زرعی مزدور جب تک کہ وہ حقِ رائے دہی سے خارج ہے اس وقت تک اس کے ساتھ محض ایک طرح کی مربیانہ عنایت و مہربانی سے کام لیا جاتا ہے اسے رائے کا حق دیدیجئے اور پھر اس کے مقاصد پر بالکل ہی دوسری اہمیت کے ساتھ نظر پڑنے لگتی ہے۔ بہت خوب، اگر ہم اسی رائے کے ہو رہیں تو شاید آخر میں ہم اس اصول پر پہنچ جائینگے کہ حکومت میں کسی شخص کی شرکت کا حق قطعاً اس تناسب سے ہوگا جس قدر اسے اچھی حکومت سے دلچسپی ہے یعنی حکومت اگر اس کی طرف سے غفلت برتے تو اسے نقصان پہنچ جانے کا جس قدر خطرہ ہے۔ بالفاظِ دگر یہ کہ یہ حق اس کی کمزوری و بے حقیقتی کے تناسب سے ہوگا۔ مثلاً یہ کہ ایک سن رسیدہ شخص اپنی حفاظت کے لئے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے مگر ایک بچہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ایک بچہ کو بدسلوکی، غفلت، ناقص تعلیم یا مطلق تعلیم کے نہ ہونے سے نقصان کا کس قدر خطرہ ہوتا ہے! اس لئے بچے کو ضرور حقِ رائے دہی ملنا چاہیئے خواہ جوان آدمی کو یہ حق ملے یا نہ ملے اور جب اوصاف کے تصور کو ایک مرتبہ خارج کر دیا گیا تو پھر کوئی وجہ اس کی نہیں ہے کہ ہم لڑکوں تک آکر رک جائیں۔ اگر کسی طبقہ کی نسبت بدسلوکی کا احتمال ہے اور اس کے اغراض کا اقتضا یہ ہے کہ حکومت ان کے ساتھ مہربانی آمیز برتاؤ کرے تو وہ مجانین کا طبقہ ہے لیکن جس اصول پر ہم اس وقت غور کر رہے ہیں اس کے بموجب جس طبقہ کو سب سے زیادہ ناقابلِ انکار طور پر رائے دہی کا حق ہونا چاہیئے وہ غالباً مجرم پیشہ طبقہ ہے، کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ

قانون اور حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات ہمارے تعلقات کی بہ نسبت کس قدر زیادہ گہرے اور کس قدر زیادہ عملی و زندہ تعلقات ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ہم سب سیاسیات میں محض نظریہ بازہ اور خام کار ہیں، اگر ہم صداقت کا اعتراف کریں تو بتاؤ کہ ہم میں سے کتنے آدمیوں کو اس کا فرق معلوم ہوتا ہے کہ کونسے قوانین نافذ ہیں۔ شخصی طور پر ہمیں کبھی ان قوانین سے واسطہ ہی نہیں پڑتا ہے لیکن جرائم پیشہ طبقہ کے لئے یہ مسئلہ صریحاً سب سے زیادہ اہم ہے۔ نہایت ہی قطعی مفہوم میں ان کے لئے یہ زندگی و موت کا معاملہ ہے۔

تم ان لغو نتائج کی مقاومت اس کے بغیر نہیں کر سکتے کہ آخرالامر تم یہ تسلیم کرلو کہ اوصاف کا کوئی معیار ہونا چاہیئے۔ مجنون میں قوت فیصلہ کافی نہیں ہوتی، بچہ کو تجربہ کافی نہیں ہوتا، مجرم میں نکوکاری کافی نہیں ہوتی، کہ یہ لوگ حکومت میں حصہ لے سکیں۔ اس اصول کو قبول کرنا اعیانیت کے اصول کو قبول کرنا ہے۔ ہم اس قصہ کو اس طور سے زبان پر لاتے ہیں کہ عمومی اور اعیانی فریقوں میں تنازعہ گویا اصول کا ہے، گرچہ حال اکثر فریقانہ مناقشات کا ہے وہی ہم یہاں بھی دیکھتے ہیں کہ "اصول" کا عظیم الشان لفظ بیکار کام میں لایا جاتا ہے۔ کسی ذی عقل مخلوق کو اس اصول میں کلام نہیں ہے کہ تمام اغراض و مقاصد پر ملحوظ رہے اور نہ اس اصول میں کلام ہے کہ اوصاف کا کوئی معیار ہونا چاہیئے۔ مگر بعض افراد ان اغراض کو زیادہ ملحوظ رکھتے ہیں جس کی نمائندگی ہوتی ہے یعنی اصول عمومیت کو اور بعض معیار اوصاف کا زیادہ خیال کرتے ہیں یعنی اصولِ اعیانیت کا۔

مزید براں تاریخ میں اعیانی اور عمومی مملکتیں جس طرح نمودار ہوتی ہیں اگر ہم ان پر غور کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ ان کی بنا قطعی مخالف یکدگر اصولوں پر نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم ہے کہ تاریخ کے کسی حصے میں تمہیں کوئی ایسی مملکت مل سکتی ہے جو اس اصول پر قائم کی گئی ہو کہ ہر شخص مساویانہ طور پر اچھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مملکتیں جو نہایت ہی نمایاں طور پر اپنے کو عمومی ظاہر کرتی ہیں، وہ عملاً موزونیت کے معیار کو کام میں لاتی ہیں اگرچہ بعض اوقات وہ اس معیار کو بالواسطہ اور غیر محسوس طور پر استعمال کرتی ہیں۔

ایتھنز پر نظر کرو، وہاں تمہیں بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ یہاں ہمہ گیر حق رائے دہی سے بھی بہت کچھ زیادہ موجود ہے۔ اہل ایتھنز میں سے ہر شخص صرف رائے دہندہ ہی نہیں تھا بلکہ وہ واقعاً "پارلیمنٹ" کا رکن تھا۔ مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اہل ایتھنز کے غلام بھی تھے تو پھر غیر محدود وہمہ گیری کی یہ ظاہری شکل ہمیں فریب خیال معلوم ہونے لگتی ہے۔ انسان کو حکومت میں حصہ لینے کے ناقابل بنانے والی شے یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ مسلسل حرفتی محنت و مشقت میں مشغول رہے، جس سے اس کی دماغی ترقی کا نشو ونما رک جائے، اور نیز یہ کہ اسے فرصت نہ حاصل ہو جس سے معاملاتِ عامہ کا مطالعہ اس کے لیے ناممکن ہو جائے۔ ایتھنز میں اعیانی فریق نے جس پورے طبقہ کو تعلیم، فرصت اور ذہانت کی کمی کی بنا پر حقِ رائے دہی سے محروم کر دیا تھا، یہ محرومی اس کی حالتِ غلامی کی حیثیت کی وجہ سے تھی جس میں کسی "قانونِ اصلاح" کی کوئی امید نہیں تھی۔ وہ غریب اہل ایتھنز جو اکلیزیا میں دولتمند و عالی نسب اشخاص کے زانو بہ زانو بیٹھے تھے وہ اسی طبقہ کے تھے، جس طبقہ کا سقراط تھا۔ اس کا حال ہم سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انھیں فرصت بہت تھی، اور دنیا کے اس دور میں جب دارالعلوم اور کتب خانے موجود نہ تھے دولت سے بہت کم ذہنی نفع حاصل ہو سکتا تھا۔ وہاں جس قسم کی تعلیم تھی وہ سب کے لیے تقریباً یکساں طور پر عام تھی۔ ایتھنز میں اگر امیر و غریب کے درمیان کوئی خلیج نہیں تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں آزاد اور غلام کے درمیان ایک ایسی وسیع خلیج تھی کہ اس زمانہ کے نہایت ہی علٰحدگی پسند معاشرے میں بھی اس کا تصور نہیں قائم ہو سکتا۔

اب ہمیں عمومیت کی جدید شکل پر نظر ڈالنا چاہیے۔ زمانۂ جدیدہ کی متعدد بڑی بڑی مملکتوں میں ہمہ گیر حقِ رائے دہی جاری ہو گیا ہے اور انگریز خود بہت سرعت کے ساتھ اس راستہ پر چل رہے ہیں جو اسی منزل کو جاتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ آیا ہمہ گیر حقِ رائے دہی اعیانیت کی نفی ہے؟ کیا اس کی بنا اس اصول پر ہے کہ ہر شخص مساوی طور پر اچھا ہے؟

بالکل نہیں! اولاً یہ خیال کرو کہ ہم جب "عالم گیر" کا لفظ کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد "عالم گیر" نہیں ہوتی اور اس میں بہت سے وسیع مستثنیات ایسے ہوتے

ہیں جن کا ہم ذکر نہیں کرتے کیونکہ وہ بغیر ذکر کیے سمجھ لیے جاتے ہیں۔ یہ اس قسم کے اخراج ہیں جن کا حوالہ میں پہلے دے چکا ہوں، نہ صرف بچے بلکہ ایک خاص عمر تک بہت سے ذہین نوجوان اور تمام عورتیں اس سے خارج ہوتی ہیں۔ مگر ثانیاً ہمیں یہاں اس امتیاز کا بھی دل میں خیال کر لینا چاہیئے جس پر میں نے اس قدر زور دیا ہے۔ میں نے باصرار یہ کہا ہے کہ حکومت کے مبہم لفظ کے تحت میں ہم دو نہایت ہی مختلف چیزوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایتھنز میں تقریباً ہر ایک شہری باری باری سے حکومت کے فرائض انجام دینے کے لیے طلب کیا جاتا تھا، چنانچہ ہمیں یہ یاد ہونا چاہیئے کہ غریب سنگتراش سقراط کو بھی ایک قابل یادگار موقع پر "اکلیزیا" کا صدر بننا پڑا تھا مگر جدید عمومیت میں ایسا نہیں ہوتا، جدید عمومیت ہر شخص کو ایک رائے کا حق دیتی ہے مگر وہ ہر شخص کو باری باری سے دارالعوام کا صدر یا لارڈ چانسلر یا وزیر اعظم نہیں بناتی۔ سچ یہ ہے کہ حقِ رائے دہی سے حکومت میں کوئی حصہ نہیں ملتا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ حکومت بنانے کی قوت میں حصہ ملتا ہے، اور جب ہم محض اتنا حق تمام شخصوں کو عطا کرتے ہیں تو اس سے ہم کسی نہج سے یہ قرار نہیں دیتے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ نہایت ہی عمومی مملکت میں بھی ایسا کرنے سے ہم کس قدر دور ہیں، یہ اس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ ایتھنز میں قرعہ اندازی کے ذریعہ سے جو انتخابات ہوتے تھے انھیں ہم کس قدر نظر استعجاب سے دیکھتے ہیں۔ حقیقت میں اس نام نہاد عمومی زمانہ میں سابقہ عہدوں کی بہ نسبت حکومت کے لیے اس قدر خاص مہارت کی ضرورت سمجھی گئی ہے کہ اعلیٰ عہدوں کے لیے جن اشخاص کے موزوں ہونے کا تصور بھی ہو سکتا ہے ان کی مجموعی تعداد بے انتہا کم ہے مگر اب ثالثاً اس پر بھی لحاظ کرو کہ عام طور پر حقِ رائے دہی براہِ راست حکومت کے اختیار میں بھی حصہ نہیں دیتا۔ انتخاب کنندہ جماعت براہِ راست وزارت کو مرتب نہیں کرتی؛ یہ صرف پارلیمنٹ کو بناتی ہے اور پارلیمنٹ وزارت کو بناتی ہے۔ جب ہم ان موخر زمانوں میں عمومیت کی مستقل ترقی کا ذکر کرتے ہیں تو ہم عام طور پر اس امر کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ جدید عمومیات کا نظم نیابتی ہوتا ہے اور یہ کہ نیابتی نظم فی الاصل اعیانی ہے۔

جس طرح انتخابی بادشاہی ہوسکتی ہے، اسی طرح انتخابی اعیانیت بھی ہوسکتی ہے اور ہر ایک نیابتی پارلیمنٹ کا یہی حال ہے۔ یہ ایک انتخابی اعیانیت ہے۔ یہ ان اشخاص کی ایک جماعت ہے جنھیں قوم نے معاملاتِ عامہ کی انجام دہی (یعنی حکومت کے بنانے اور بگاڑنے) کے لئے اوسط درجہ کے اشخاص سے زیادہ موزوں سمجھ کر منتخب کیا ہے۔ یہ لوگ کسی نہ کسی طریق پر بقیہ لوگوں سے اعلیٰ ثابت ہوئے ہیں یعنی وہ ایک طبقۂ اعیان ہیں اور انگلستان اور جرمانیہ کی طرح جہاں ارکان کو معاوضہ نہیں ملتا وہاں یہ لوگ نہ صرف طبقۂ اعیان سے ہوتے ہیں بلکہ اہل دولت یا کم از کم اہل فرصت اعیان ہوتے ہیں کیونکہ کوئی ایسا شخص پارلیمنٹ کا رکن نہیں ہوسکتا جو بغیر تنخواہ کے اپنے وقت کا ایک بہت بڑا حصہ معاملاتِ عامہ کے لئے وقف کرسکے۔

پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اعیانیت کے اصول پر سنجیدگی کے ساتھ اعتراض نہیں ہوتا اور نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اعیانیت، عددیت سے بالکل ہی مختلف بنیاد پر قایم ہے۔ تاریخ بہت بڑی تعداد ایسی مملکتوں کی پیش کرتی ہے جن کی بنیاد عددیت کے اصول پر رکھی گئی تھی، مگر اس سے یہ قابلِ جواز نہیں معلوم ہوتا کہ اس قسم کی مملکتوں کو صحتور سیاسی ادارات تسلیم کیا جائے۔ عددیت ایک مرض ہے اور جہاں یہ قطعی طور پر شایع ہوجاتا ہے وہاں ایک مہلک مرض بن جاتا ہے۔ اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ ہم اپنی ترتیب و تقسیم میں عددی مملکت کو محض ایک نوع کے طور پر نہیں رکھ سکتے بلکہ جس طرح ہم نے غیر عضوی مملکت کے لیے مملکت کے نام ہی سے انکار کرنے کی رائے قایم کرلی تھی، اسی طرح ہمیں چاہیئے کہ عددی مملکت کو متبذل و مریض سمجھیں اعیانی مملکت کی صورت بالکل مختلف ہے۔ یہ محض ایک ایسی مملکت ہے جس میں ایک صحیح وضروری اصول کو (جو تمام مملکتوں میں مسلم ہے) غیر معمولی نمو حاصل ہوگیا ہے۔ اس لئے اس میں ایک صحتور و جایز نوع مملکت ہونے کے علاماتِ ظاہری موجود ہیں اور مملکتوں میں تنوع ان کے ماحول کے دباؤ کے تنوع کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ جب دباؤ ہلکا ہوتا ہے تو آزادی ہوتی ہے جب دباؤ بھاری ہوجاتا ہے تو آزادی کم ہوجاتی ہے۔ اب یہ امر آسانی سے ذہن میں

آسکتا ہے کہ بعض صورتوں میں دباؤ اس قسم کا ہوتا ہے جو حکومت میں خواہ ذہنی خواہ اخلاقی قابلیت کا بہت زیادہ متقاضی ہوتا ہے۔ جس طرح بعض مملکتوں میں حکومت کو کام کرنے کے لیئے بہت بڑے اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح بعض دوسری مملکتوں میں اسے بہت بڑی ہوشیاری و قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں یہ صورت ہوگی وہاں اوصاف کا معیار (جس کا ہونا ہر حال میں لازمی ہے) حکومت اور حکومت ساز عضو دونوں میں لامحالہ بڑھا دیا جائے گا۔ اعلیٰ اوصاف پر ضرورتاً زور دیا جائے گا، اور اعیانی اصول جو اس سے قبل تک مخفی تھا وہ اب زیادہ زور کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ یہ ہمیشہ ایک امر طبعی رہا ہے کہ صرف اچھوں کو حکمرانی کرنا چاہیئے، مگر اچھوں سے مراد معمولی ذہانت اور معمولی وقعت کے لوگوں سے ہوا کرتی تھی۔ اب آیندہ سے اچھوں سے مراد وہ اشخاص ہوں گے جن میں معمول سے زیادہ ذہانت یا غیر معمولی نکوکاری ہو۔ الغرض اس طرح اعیانی سلطنت پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن غیر صحیح عدیدی مملکت سائے کی طرح اس مختور مملکت کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ یہ حالت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ (جیسا میں بتا چکا ہوں) خود لفظ اعیانیت کا مفہوم اب اس کے سوا کچھ نہیں رہا ہے کہ وہ عدیدیت کا ایک مرادف لفظ ہے۔ اس قسم کا مستمر و مزمن، خلط مبحث محض اتفاق سے نہیں پیدا ہو سکتا۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ یہ امر کس قدر طبعی ہے کہ عدیدیت یہ کوشش کرے کہ وہ اپنی خرابیوں کو اعیانیت کے خوشنما پردے میں چھپائے۔ میں نے ایک دوسرے سبب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو اپنا عمل کرتا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا سبب ہے کہ حکومتوں کی شکلوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمیشہ اس کا بہت کچھ لحاظ مد نظر رکھنا چاہیئے۔ فریقانہ معرکوں میں حکومت کی جو شکلیں لازماً اس طرح مردود قرار دی جاتی ہیں گویا وہ اصلاً و خلقتاً ناقص ہیں، ان کا بیشتر حصہ صرف اس وجہ سے ناقص قرار دیا جاتا ہے کہ وہ زاید از ضرورت زمانے تک قایم رہ گیا ہے۔ یہ مملکتیں اچھی چیزوں کی باقیات ہیں۔ چنانچہ جب میں نے مطلق العنانی پر بحث کی اور یہ ظاہر کیا کہ اگر یہ محض ایسی ہی بلا ہوتی جیسی خیال کی جاتی ہے تو کبھی وجود میں آہی نہیں سکتی تھی۔

اس وقت میں نے یہ تسلیم کیا تھا کہ تاریخ کی بہت سی مطلق العنان سلطنتیں ضرور بالجبر گرو وہ بلا اس وجہ سے ہیں کہ وہ باقیات ہیں چنانچہ کسی وقت میں ان سے جو فائدہ منظور تھا وہ جاتا رہا ہے اور نقصان بدستور باقی ہے۔ پس اعیانی مملکت کے متعلق بھی یہی رائے ظاہر کی جا سکتی ہے۔ قطعی معنی میں یہ عدیدی مملکت سے بالکل ہی مختلف ہے مگر اعیانیت کے بعد اکثر عدیدیت کا دور آتا ہے اور جن مملکتوں کو تاریخ اعیانیت کے طور پر پیش کرتی ہے ان میں سے بہت سی یہی باقیات ہیں۔ درحقیقت عام طور پر یہ رائے ظاہر کی جا سکتی ہے کہ بہترین و شاندار ترین مملکتوں کے باقیات سب سے زیادہ سخت جان ہوتے ہیں (یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا بہت قوی الصحت شخص کی نسبت یہ توقع ہوتی ہے کہ اس کا بڑھاپا بھی بہت طویل ہوگا) اور اس لئے بہترین مملکتوں کے لیے سب سے زیادہ یہ خطرہ ہے کہ وہ اپنے باقیات کی وجہ سے کہیں بدنام نہ ہو جائیں (اس رائے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ تاریخ کے سبقوں کو غلط نہ سمجھنا کس قدر دشوار ہے۔ اسلیبسٹ نے جس عدیدیت کا حال بیان کیا ہے جس نے یوگرتھا کی جنگ میں اپنی دنائت اور کاتی لین کی سازش میں اپنی دلیرانہ خیانت کا اظہار کیا وہ اسی اعیانیت کا بقیہ تھی، جس نے ہنی بال پر فتح حاصل کی تھی۔ وہ امراء جنھیں انقلاب فرانس نے جلاوطنی یا سزائے موت کے لیے مخصوص کر دیا وہ اس طبقۂ اعیان کے باقیات تھے جو کونڈے اور تیورین کے ارکان حرب میں شامل تھا۔ ان صورتوں میں رائے عامہ اس صحتور دور کو (جسے وہ تدریجی تخریب کے منظر بعید سے دیکھتی ہے) اس اثر باقیہ سے ممیز نہیں کر سکتی جس سے وہ مانوس ہوتی ہے۔

یہ ابتری اس وجہ سے اور بھی زیادہ ناگزیر ہو جاتی ہے کہ دوسری صحتور سیاسی شکلوں کے مثل، اعیانیات پوری بحث و تجویز کے بعد نہیں قائم ہوتیں بلکہ از خود و بلا ارادہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ سیاسی قابلیت کا معیار تجویز کرنے سے زیادہ کسی کام میں تخیل و تدبیر کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہایت ہی کامیاب اعیانیتوں میں بھی واقعاً جن معیاروں سے کام لیا گیا ہے وہ عام طور پر منطقاً کسی تخیل و تدبیر کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ وہ نہایت ہی بھدے اور نہایت ہی اتفاقی

معیار تھے جو خیال میں آ گئے اور ان بھدے معیاروں کو عاید کرنے کے لئے صرف فوری ضرورت پر نظر کی گئی۔ یہ کہ وہ کیونکر تخریب کا ذریعہ بن جائیں گے اور ان سے کن خرابیوں کا پیدا ہو جانا اغلب ہے۔ اس پر کچھ لحاظ نہیں کیا گیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ سیاسی قابلیت کے معلوم کرنے کے نہایت ہی بدیہی معیار بھی ایسی ہی آمادگی کے ساتھ عدیدی اوزار بن جاتے ہیں۔

نسب، قابلیت کا واقعی معیار ہے اگرچہ یہ معیار کسی قدر بھدے قسم کا ہے۔ جو شخص کسی مدبر کا بیٹا ہو، جو مدبر کے گھر میں پلا ہوا ہو، اس کی نسبت یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس نے کچھ نہ کچھ ایسی باتیں سیکھی ہوں گی جن کی دوسروں میں کمی ہو۔ کچھ نہیں تو معاملاتِ عامہ سے کسی قدر مہارت اور معنیہ کاموں کے اشکال سے کچھ واقفیت تو اسے ضرور ہی ہوگی، اور ظنِ معقول یہ ہے کہ اس نے کچھ اس سے زیادہ حاصل کیا ہو، بلکہ کسی حد تک یہ امکان یہی ہے کہ پٹ اصغر کی طرح اس نے بہت کچھ حاصل کر لیا ہو اور نیز بہت کچھ ورثہ میں پایا ہو۔

لیکن نسب اگر صحیح اعیانیت کو پرکھنے کے لئے کام دیتا ہے تو اس سے بھی زیادہ یقینی یہ ہے کہ وہ باطل اعیانیت یعنی عدیدیت کے لئے بھی کام دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ خلقی اوصاف اور معقولات خاندان میں چلے آ رہے ہوں، مگر اس کے ساتھ ہی خاندان کے شمایل و خصایل کچھ کے کچھ ہو گئے ہوں۔ تمام جماعتوں میں خاندان سب سے زیادہ قوی جماعت ہے کیونکہ یہ فطرت کی بنائی ہوئی جماعت ہے اور اگر کسی مملکت کی حکومت چند خاندانوں کے قبضے میں محدود ہو جائے تو اس سے ہم بہت آسانی سے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ابتدا میں ایک صحت بخش اعیانی تحریک اپنا کام کر رہی تھی (اُس وقت کے) وباؤ نے بہترین خاندانوں کو ڈھونڈھ نکالا جن میں سب سے زیادہ نکوکاری اور سب سے زیادہ قابلیت تھی، ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ کچھ زمانے کے لئے اس انتظام نے صحیح اعیانیت کی واقعی طرفداری کی ہوگی، اس اجارے نے دو تین نسلوں کے لئے ماہر و قابل حکومت مہیا کر دی ہوگی، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی رائے رکھنا چاہیئے

کہ صحیح اعیانیت کے لیے یہ انتظام زیادہ مدتوں تک موزوں نہ رہے گا، اس کا پرزور عمل برابر گھٹتا جائے گا (کیونکہ ایک اچھی خاندانی روایت قوت و دولت کی وجہ سے خراب ہو جاتی ہے)؛ ایک زمانہ کے بعد اس کا میلان بدل جائے گا اور وہ عدیدیت کے مستقل و پرزور طریق پر عمل شروع کر دے گا، پس چند نسلوں کے بعد عدیدیت اس جگہ پر قائم ہو جائے گی جہاں اعیانیت قایم کی گئی تھی۔

ٹھیک یہی رائے دولت کے متعلق بھی دی جا سکتی ہے۔ سیاسی زندگی میں جس خوبی کی ضرورت ہے، دولت بھی اس کا ایک سرسری معیار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دولت کوئی مجرد اخلاقی خوبی نہیں ہے بلکہ اپنے مقصد زیر نظر کے اعتبار سے یہ ایک نسبتی خوبی ہے۔ سیاسی زندگی میں دو اوصاف نہایت درجہ اہم ہیں اور دولت ان کی ضامن ہے؛ اول یہ کہ دولتمند شخص کو فرصت اور کام کی آزادی ہوگی، دوسرے یہ کہ یہ گمان غالب وہ رشوت کے اثر سے محفوظ ہوگا۔

گر پھر دولت عدیدی بھی ہے۔ دولتمند اپنے اشتغال و اغراض میں زیادہ تر یکساں ہوتے ہیں۔ انھیں بہت جلد یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے مقاصد مشترک ہیں اور اسی وجہ سے وہ بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ باہم متحد ہو جائیں اور مل کر کام کریں۔ جو مملکت دولتمندوں کے زیر انتظام ہوگی اس میں ملکیت کے اغراض پر بہت زیادہ توجہ کی جائیگی اور حکومت کی نسبت یہ سمجھا جائے گا کہ وہ سرمایہ داروں کی اولوالعزمیوں کی حمایت کرنے اور انھیں ترقی دینے کی ایک شاندار مشین ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جہاں یہ دونوں معیار ایک ساتھ عاید کیے جاتے ہیں، جہاں کچھ خیال نسب کا ہوتا ہے اور کچھ دولت کا، وہاں کا میلان جس طرح اعیانی ہوگا اسی طرح عدیدی بھی ہوگا اور شاید زیادہ زمانہ گزرنے پر اعیانی سے زیادہ عدیدی ہو جائے گا۔

بس اب تم دیکھتے ہو کہ کتنے وجوہ و اسباب ہمیں اس طرف لیے جا رہے ہیں کہ ہم اعیانیت کو عدیدیت کا مرادف قرار دیدیں۔ اولاً عدیدیت ہمیشہ اپنے کو اعیانیت کہتی ہے بتاتا گیا، اعیانیت کا اثر باقیہ عدیدیت ہوتی ہے (جس پر میں یہ اضافہ کر سکتا ہوں کہ انقلاب فرانس کے زمانے میں اس قسم کا غیر صحیح ماقبی یورپ کے تقریباً ہر ایک

ملک میں پایا جاتا تھا؟ ثالثاً، اعیانیت کے برقرار رکھنے کے لئے جن معیاروں سے کام لیا جاتا ہے وہ اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ عددیت کے لئے بھی کام دیتے ہیں۔

اگر اعیانیت و عمومیت کے اصول کو صحیح طور پر ممیز کرنے میں مجھے کامیابی ہوگئی ہے تو آج مجھے اسی پر بس کرنا چاہیئے۔ میں یہ تحقیق دوسرے خطبے کے لئے چھوڑتا ہوں کہ ان اصول کے ذریعے سے اوارات میں عملاً کیونکر تعدیل پیدا کی جاتی ہے؛ بالفاظِ دیگر یہ کہ اعیانی مملکت، عمومی مملکت سے عملاً کیونکر مختلف ہوتی ہے؟

خطبۂ ہشتم

پچھلے خطبے نے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دی ہوگی کہ اسم "اعیانیت" جو ابتداءً تمام سیاسی اسماء میں سے ایک نہایت ہی قابلِ وقعت اسم تھا وہ ادھر حال کے زمانے میں کیونکر ناپسندیدہ بلکہ تقریباً بدنام کن تصورات کے ساتھ مستلزم ہوگیا۔ عمومیت کا لفظ جواب اس قدر جوش پیدا کر دیتا ہے قدیم زمانہ میں اس کے ساتھ اسی قسم کے ناپسندیدہ تصورات لگے ہوئے تھے تاآنکہ سترھویں صدی تک بھی کوزنٹ نے حکمی طور پر یہ لکھا تھا کہ "بدترین طرزِ حکومت وہ ہے جو عوامی اصول پر چلائی جائے۔" مگر افلاطون وارسطو کے کانوں کو لفظ اعیانیت کے نام ہی میں ایک پُراثر آواز محسوس ہوتی تھی۔ اس مسئلہ پر دلیل وحجت کا انتظار کئے بغیر وہ یہ فرض کر لیتے تھے کہ یہ حکومت کی بہترین صورت ہوگی کیونکہ یونانیوں کے کانوں میں لفظ اعیانیت کی آواز ہی یہ معنی رکھتی تھی کہ یہ بہترین اشخاص کی حکومت یا بہترین حکومت تھی۔ لیکن سطحی طور پر حکومت کی یہ شکل دو اور شکلوں کے مشابہ ہے جن میں سے ایک تو بالکلیہ ناجایز و خلافِ اخلاق ہے اور دوسرے کو نہ جایز کہہ سکتے ہیں نہ حسبِ اخلاق۔ وہ عمدہ اشخاص جو اعیانیت میں حکومت اور حکومت سازی کے اختیار پر بلاشرکت غیرے قابض ہوتے ہیں، وہ نیم عضوی مملکت کے اس حکمراں غول کا بھی جواب معلوم ہوتے ہیں جو قوم کو پیروں کے نیچے روندتا ہے، اور جماعتی مملکت کے اس حکمراں طبقہ کا بھی جواب معلوم ہوتے ہیں جسے نارواد مضرت رساں

غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں مظالم آفریں اقلیتیں اعیانیت کے لقب کا دعوے کرتی ہیں۔ وہ یہ عقیدہ رائج کرتی ہیں کہ ان کا غلبہ بجائے خود ان کی برتری کا ثبوت ہے، اور یہ کہ بیشتر حالات میں اور مدت مدید کے بعد محض "قوت" "حق" کے مرادف ہو جاتی ہے۔ پس عملی صورت میں ہمیشہ یہ ظن غالب موجود رہتا ہے کہ جو حکومت اعیانیت کا ادعا کرتی ہے وہ حقیقت میں وہی مظالم آفریں طبقہ یا قوم ہو۔ اسس فریب کاری کے مدید و وسیع تجربہ کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے جدید سیاسی فلسفہ میں مصنوعی اعیانیت نے واقعی اعیانیت کو مغلوب کر دیا ہے اور اب یہ یقین نہیں کیا جاتا کہ کسی واقعی اعیانیت کا امکان بھی کوئی شے ہے۔

لیکن ہمیں یہ چاہیئے کہ ہم عملی رائے کی اس ہئیت کو نظریئے میں دخل نہ دیں خواہ عملی رائے کی حیثیت سے وہ کتنی ہی معقول کیوں نہ معلوم ہوتی ہو۔ چونکہ ہمیں واقعی دنیا میں کوئی اصلی اعیانیت نظر نہیں آتی یا ہم یہ گمان کر لیتے ہیں کہ نظر نہیں آتی، اس لئے ہمیں یہ فرض نہ کرنا چاہیئے کہ دوسرے زمانوں میں یا معاشرے کی دوسری حالتوں میں بھی کبھی ایسی اعیانیت نہیں رہی ہے۔ یہ بھی نہیں چاہیئے کہ اگر کسی حکمران طبقہ میں ہمیں عدیدیت کا ذرا سا شائبہ نظر آ جائے تو معاً یہ فرض کر لیں کہ وہ حکمران طبقہ محض عدیدی ہے ممکن ہے کہ یہ ایسی اعیانیت ہو جو عدیدیت کی طرف بڑھتی جا رہی ہو، کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اعیانیات بہت سرعت کے ساتھ عدیدیت میں مبدل ہو جاتے تھے۔ بہر حال، سر دست ہمیں مصنوعی اعیانیت کو بھلا دینا اور اپنے خیالات کو تمام تر صحیح اعیانیت پر مرکوز کر دینا چاہیئے۔

ہم نے مملکتوں کو ایک عضویہ قرار دیا ہے اور اس کے ادارات کے ارتقا کو اس کوشش کا نتیجہ سمجھا ہے جو تمام عضویات خود کو اپنے ماحول سے مطابق کرنے کے لیئے اختیار کرتے ہیں مگر چونکہ یہ عضویہ نوع انسان سے مرکب ہے اس لیئے اس کی جدوجہد کا اظہار محض عضلات کے تشنجات یا ترسیمات سے نہیں ہوتا بلکہ یہ اظہار ایسے اقوال و افعال سے ہوتا ہے جن سے ہم نہایت ہی صاف طریق پر تخیلات، استدلالات، خواہشوں، جذبات کے نتائج اخذ کر سکتے ہیں ہم جب یہ کہتے ہیں کہ

جسم سیاسی میں ترمیم وارتقا واقع ہوتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ جسم سیاسی سے تعلق رکھنے والے بعض افراد کے دلوں میں جدید خیالات وجذبات پیدا ہوتے ہیں۔

کیا اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ خیالات و جذبات ہر فرد کے دل میں اور بہر مساویانہ طور پر گزرتے ہیں، ؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ ہر قوم میں ایک حصہ ایسا ہوتا ہے جو معمولی طور پر ان تحریکات میں کوئی حصہ نہیں لیتا جن سے سیاسی قوت مرکب ہوتی ہے۔ اکثر صورتوں میں یہ حصہ اس حصہ سے بے اندازہ زیادہ ہوتا ہے جو ان تحریکات سے متحرک ہوتا ہے۔ روسی آبادی کی کئی صدیوں کی حالت کا تصور کرو۔ وہ غلامانِ وابستۂ اراضی جو ایک وسیع مملکت کے دیہات میں پھیلے ہوئے تھے، وہ جانتے تک نہ تھے کہ غیر ملکی مدبر جسے "روس" قرار دیتے ہیں وہ کیا ہے، اس میں ان کی کسی قسم کی شرکت ہونا تو بڑی بات تھی۔ چند امرا، چند سپاہی چند کارکنانِ مذہبی اور زار، ہی ملکہ سیاسی طور پر روس کا علی، وکارکن حصہ بن جاتے تھے، باقی تمام لوگوں کو خاندان اور کلیسا کی تنظیم میں اپنی اپنی جگہ ملی ہوئی تھی مگر روزمرہ کی زندگی میں، سیاسی حیثیت سے یہ لوگ بالکلیہ بے مصرف تھے۔

ایسی مملکت میں اعیانیت نہ صرف ایک حقیقی نتیجہ ہے بلکہ بمقتضائے حال تمام حقیقت رہی ہے۔ یہ اعیانیت، نہ کسی تدبیر سے پیدا ہوتی ہے نہ کسی ایسے نظریئے سے جو بعض اوصاف کو ضروری بتاتے ہوں، نہ دولتمندوں کے کسی ایسے منصوبے سے وجود میں آتی ہے کہ غربا کو حکومت سے خارج کر دینا چاہیئے تاکہ امرکو انھیں ستانے کا زیادہ موقع ملے۔ یہ لابدی وفطری طور پر پیدا ہوتی ہے۔ آبادی از خود دو حصوں میں بٹ جاتی ہے، ایک طرف وہ لوگ نظر آتے ہیں جو بہبودِ عامہ سے تعلق خیالات وجذبات رکھتے ہیں، دوسری طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن میں اس قسم کے خیالات وجذبات نہیں ہوتے۔ ایک مفہوم میں سب مملکت میں داخل ہوتے ہیں کیونکہ وہ سب کی حفاظت کرتی اور سب پر فرائض عاید کرتی ہے مگر ان دو طبقات میں سے ایک معمولاً عاطل ہوتا ہے،

اس لیئے کوئی امر اس کا مانع نہیں ہوتا کہ دوسرا طبقہ معاملاتِ عامہ پر تنہا مسلّط ہو جائے۔ عملی اغراض کے لیئے اور غیر ملکی مدبرین کی نظروں میں بھی مستعد کار شہری ہی گویا مملکت بن جاتے ہیں اور عاطل طبقہ جو اکثر آبادی کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے وہ کسی شمار میں نہیں ہوتا۔

میں نے روس کی انتہائی مثال پیش کی ہے، میں ایک دوسری مثال دیتا ہوں تاکہ یہ ظاہر ہو کہ یہ فطری و ضروری قسم کی اعیانیت کسی جہت سے غیر معمولی شے نہیں ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں سیاسی ملک کی حیثیت سے انگلستان، یورپ میں سب سے زیادہ نمایاں تھا، یعنی یہ ایک ایسا ملک تھا جس میں عوام الناس معاملاتِ عامہ میں نہایت گہری دلچسپی لیتے تھے۔ تاہم اُس زمانہ میں نہ صرف کل کا کل ادنیٰ طبقہ بلکہ متوسط طبقے کا بھی ایک بڑا حصہ، حقِ رائے دہی سے خارج تھا، اور اس لیئے ملک کی حکومت یا حکومت کے بنانے میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا لیکن اس زمانہ میں اس استثنا میں کسی قسم کا کوئی تصنع مطلق نہیں تھا، اس سے کسی قسم کی بددلی نہیں پیدا ہوتی تھی، حقِ رائے دہی کی وسعت کے لیئے اس زمانہ میں کوئی آواز بلند نہیں کی جاتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کثیر التعداد مخروج اپنے اس استثنا پر راضی و قانع تھے اور وہ اس سے آگاہ تھے کہ ان کی کوئی اہم سیاسی رائے نہیں ہے۔ درحقیقت، جن شاذ و نادر مواقع پر وہ کسی رائے کے اظہار پر آمادہ ہوئے (مثلاً سا بچیویریل کے مقدمہ کے موقع پر یا والپول کے محصولِ چنگی تجویز کرنے کے وقت) تو انھوں نے بہت صاف طور پر ثابت کر دیا کہ وہ ابھی گویا سیاسی سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے یعنی ابھی ان میں سیاسی صوابدید نہیں پیدا ہوئی ہے۔

پس اعیانیت کی اصل یہ ہے کہ سیاسی ادراک یا مملکت کا تخیل بعض لوگوں کے دلوں میں دوسروں کے پہلے آجاتا ہے۔ وہی لوگ مملکت کے تمام اختیارات پر بلا شرکت غیرے قابض ہو جاتے ہیں جو تنِ تنہا اس کے اصل اصول سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی اچھے اشخاص کہلائے جاتے ہیں۔ اس قسم کا ارتقا فی نفسہ بالکل صحت بخش ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اعیانیت اپنی

پیدائش کے وقت ہی سے جدیدی تخریب کے لئے وقف ہوئی ہے۔ یہ عمدہ اشخاص، کسی اعتبار سے اولیاء اللہ نہیں ہوتے ان میں اتنی خوبی ہوتی ہے کہ وہ دولت عامہ کے لئے کسی قدر ایثار کر سکتے ہیں مگر وہ اجارہ حاصل کر لیتے ہیں اور ایسے وہ بالکلیہ مفادِ عام کے لئے کام میں نہیں لاتے بلکہ خود اپنے اور اپنے خاندان کے لئے کام بھی کام میں لاتے ہیں۔ علاوہ ازیں، اغلب یہ ہے کہ یہ زیادہ ترقی یافتہ حوصلہ مند ایک ہی طبقہ کے ہوں۔ یہ ان لوگوں میں سے ہوں جنھیں دولت کی وجہ سے فرصت آزادیٔ قلب، وسیع معاملات سے سروکار رکھنے کی عادت حاصل ہو گئی ہے۔ اس طرح اعیانیت اور قارونیت (Plutocracy) ایک ساتھ وجود میں آجاتی ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی شئے کی دو مختلف ہیئتیں ہیں اور اگر اعیانیت میں سے زندگی کی روح نکل جاتی ہے تو جس جسم کو اس نے زندہ رکھا تھا وہ منتشر نہیں ہو جاتا، اس میں محض اتنا ہوتا ہے کہ وہ قارونیت بن جاتا ہے۔

اعیانیت کی اصل کے متعلق اس رائے سے ایک ایسے واقعہ کی تشریح ہوتی ہے جو ہر اس شخص کو عجیب معلوم ہوتا ہے جو تاریخ کا مطالعہ مقابلتی طریق سے کرتا ہے۔ علی العموم ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اعیانیت کسی مملکت کے سابق تر دور میں رواج پاتی ہے۔[1] جہاں آخر میں عمومیت کو رواج ہوا ہے، جیسے اتھنز اور فلورنس یا ممالک متحدہ میں ہوا، وہاں اعیانیت اس سے قبل ہو گزری ہے۔ جہاں آخر میں معتدل آزادانہ طریق کی حکمرانی قایم ہوئی ہے، وہاں یہ حکمرانی بالعموم نتیجہ تھی اس طولانی جد وجہد کا جس میں زیادہ اخراجی طریقہ کو تنزل ہو گیا ہو۔ چنانچہ قدیم روما میں ایسا ہی ہوا، جہاں پہلے پیٹریشین طبقہ نے اور اس کے بعد امراء نے اختیارات پر اپنا قبضۂ واحد جما لیا۔ ایسی ہی صورت جدید انگلستان میں پیش آئی۔ یہی صورت حال کی فطری رونق ہے بشرطیکہ ہم یہ خیال کر لیں کہ مملکت کی تخلیق پہلے ایک قلیل جماعت کے ذریعہ سے ہوئی تھی جس میں سیاسی اور اک

[1] اس موقع پر نسل کے ایک حاشیہ سے اشارہ ملتا ہے کہ مصنف کا ارادہ تھا کہ جس حد تک قدیمی قبائلی حالات کا تعلق ہے اس حد تک اس بیان کو مشروط کر دیں۔

سب میں پہلے پیدا ہوا مگر سیاسی احساس جو اس طرح ارتقا کے راستہ پر چل نکلا وہ بعد میں زیادہ وسیع تعداد میں پیدا ہو گیا۔

جب ہم ان اولیں مملکتوں میں سے کسی کا مقابلہ کلیون کے عہد کے ایتھنز یا جیفرسن کے عہد کے ممالک متحدہ امریکہ سے کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعیانیت و عمومیت کا فرق حقیقی و اصلی فرق ہے، اور یہ کہ بعض مملکتیں اعیانی بعض عمومی کہی جا سکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے جو امتیازات قایم کیے اور جو شرایط عاید کیے ہیں، ان سے اس مقابلہ کی اہمیت ایک بہت بڑی حد تک گھٹ جاتی ہے۔ عام نظروں میں تاریخ میں ہر جگہ یہ صورت دکھائی دیتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں نظموں کی کشمکش نوع انسان کے ارتقا کا جزو اعظم ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مظالم آفریں قلتیوں کا ظلم و جور بنی نوعِ انسان کے لیے بہت بڑی وبائے مہلک بنا رہا ہے مگر یہ قلتیں اعیانیات نہیں ہیں بلکہ غیر صحیح عددیات یا فاتح غول ہیں۔ درحقیقت تاریخ میں کسی ایسی کشمکش کا پایا جانا مشکل ہے جس کی نسبت قطعی طور پر یہ کہا جا سکے کہ وہ اعیانیت و عمومیت کی کشمکش ہے کیونکہ ان کشمکشوں کی تقریباً لابدی خصوصیت یہ ہے کہ عمومی فریق اپنے مخالفوں کی نسبت بالاعلان یہ کہتا ہے کہ وہ صحیح اعیانی نہیں ہیں بلکہ محض عددی ہیں، انھیں کوئی حقیقی فوقیت نہیں حاصل ہے اور اگر کبھی حاصل تھی تو اب ضایع ہو چکی ہے۔ اکثر صورتوں میں وہ اس قول میں بظاہر حق بجانب معلوم ہوتے ہیں کہ بدرجۂ اقل اتنا ضرور ہے کہ حالات بدل گئے ہیں، حکمران اپنی قابلیت فایقہ کے دعوے پر اب زور نہیں دے سکتے اور محروج فرقہ اپنی ابتدائی ناقابلیت سے اب بہت آگے ترقی کر گیا ہے۔ انگریزی تاریخ کی سب سے نمایاں مثال سے میرا مطلب واضح ہو جائے گا۔ سترھویں صدی میں جس طبقۂ اعیان کو کسی قسم کی مخالفت سے کچھ ایسا واسطہ نہیں پڑا تھا وہ ملک کے زمیندار شرفا پر مشتمل تھا۔ مگر ولیم سوم کے عہد کے قریب ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا جو دولت و ذہانت اور ہر اس شے کے اعتبار سے جس سے سیاسی خوبی، کی ترکیب ہوتی ہے، زمیندار شرفا کا مدِ مقابل بن گیا۔ یہ لندن کا زردار اور تاجر طبقہ تھا۔ بنک، ایوانِ ہند اور ایوانِ بحر جنوبی کے تاجرانِ عظام اس طبقہ میں داخل تھے۔ اس زمانہ سے

قدیم طبقۂ اعیان گو پامال گیا ہے، نہ اس وجہ سے کہ اصول اعیانیت پر کوئی اعتراض ہوا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ موجود الوقت طبقۂ اعیان کے اس حق سے انکار کر دیا گیا ہے کہ وہ خود کو طبقۂ اعیان کہے۔

اور چونکہ یہ حملہ درحقیقت اعیانیت پر نہیں بلکہ عدیدیت پر ہوتا ہے اس لیے حملہ آور فریق فی الواقع عمومی نہیں معلوم ہوتا۔ ان کی دلیل یہ نہیں ہوتی کہ آدمیوں میں قابلیت کے مدارج نہیں ہوتے اور ایک شخص اتنا ہی اچھا ہے جتنا دوسرا۔ نہ صرف یہ کہ وہ اس دلیل کا استعمال نہیں کرتے بلکہ وہ اس کے مخالف دلیل اور اعیانی دلیل کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ عدیدیت پر اس وجہ سے علانیہ حملہ کرتے ہیں کہ وہ اعیانیت نہیں ہے، نہ اس وجہ سے کہ وہ عمومیت نہیں ہے۔ وہ ان باطل معیاروں پر، جنھیں عدیدیت لوگوں پر عاید کرتی ہے، اس لیے اعتراض نہیں کرتے کہ ان کے خیال میں کسی معیار کا اطلاق نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس وجہ سے اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں باطل معیار صحیح معیار کے اطلاق کو روک دیتے ہیں۔ یہ امر ایک مثال سے بہت آسانی سے ظاہر ہو جائے گا۔ تقریباً بیس برس قبل انگریزی ملازمانِ ملکی اور ملازمانِ ہند کے لیے "سرپرستی" کا طریقہ منسوخ کر دیا گیا اس کی نسبت یہ کہا جاتا تھا کہ اعیانی اجارہ کی بربادی اور عمومی آزادی کے قیام میں یہ ایک دوسرا قدم ہے۔ اس وقت سے کسی عہدہ کے استحقاق کے لیے محض تعلقات کوئی شے نہیں رہے بلکہ ان کی جگہ پر امتحان کا معیار قائم کیا گیا اب اگر عمومیت سے مراد یہ اصول ہے کہ ایک شخص اتنا ہی اچھا ہے جتنا دوسرا، تو اس تغیر سے فی الواقع عمومیت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس کا اقتضا تو یہ تھا کہ لوگوں کا انتخاب قرعے یا کسی قسم کی باری کے ذریعے سے ہوتا۔ یہ تغیر اس اصول پر مبنی تھا کہ بعض اشخاص دوسروں سے بہترین اور یہ نہایت ہی اہم ہے کہ اچھوں کا انتخاب کر لیا جائے اور جو لوگ ایسے اچھے نہیں انھیں خارج کر دیا جائے۔ اس نے ایک نیا معیار اس بنا پر قایم کیا کہ اس میں قدیم معیار کی بہ نسبت زیادہ کد و کاوش سے کام لیا جاتا تھا۔ اس نے قدیم معیار کو اس بناء پر خارج کر دیا کہ وہ غیر موثر تھا، جس سے اچھے برے میں تمیز نہیں ہو سکتی تھی اور

اسکی بجائے ایک مصنوعی دل آزار امتیاز پیدا کیا جاتا تھا۔ پس اس تغیر نے عمومیت کو نہیں بلکہ اعیانیت کو فائدہ اور اعیانیت کو نہیں بلکہ عددیت کو نقصان پہنچایا۔ ۔

اس وقت مقابلہ کا جو معیار جاری ہوا اس کے بعد اس پر بھی اعتراضات کیے گئے ہیں اور تاریخ میں ہر جگہ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ سیاسی خوبی کا کوئی ایسا معیار تجویز کرنا جو ہر طرح پر قابل اطمینان ہو بے انتہا دشوار کام ہے۔ گر ہم یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ لوگ اس دشواری پر غالب آگئے ہیں، ہم یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ نسب اور دولت سے بہتر کوئی ایسا معیار ایجاد ہو گیا ہے جس کے اطلاق سے یہ خطرہ رفع ہو جائے گا کہ اعیانیت کے نام کے تحت میں عددیت جاری کر دی جائے اور نیز یہ کہ یہ معیار ان اعتراضات سے بھی محفوظ ہے جو مقابلہ کے امتحان کے خلاف پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں پہلی مرتبہ ایک خالص اور صحیح اعیانیت نظر آئے گی۔ میرا خیال ہے کہ تم دیکھوگے کہ ہر شخص مسرت کے ساتھ اسے مرحبا کہے گا اور یہ بھی فوراً ظاہر ہو جائے گا کہ ادھر حال کے زمانہ میں ہم اعیانیت کے خلاف جس قدر مطاعن کے سننے کے عادی ہو گئے ہیں، وہ سب اس خط کے مشابہ ہیں جو غلطی سے دوسری طرف روانہ کر دیا گیا ہو اور جس پر عددیت کا پتہ لکھا جانا چاہیئے تھا۔

اس تمام بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تاریخ سے ہمیں یہ توقع کرنا دشوار ہے کہ اس میں ایسی اعیانی اور عمومی مملکتیں ملینگی جو قطعی طور پر ایک دوسرے سے ممیز ہوں یا تنظیم کے ایسے بدیہی فرقوں سے ممتاز ہوں جیسا فرق شہری اور ملکی مملکتوں یا مطلق العنان اور دستوری مملکتوں میں پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ وینس کی ایسی عددی مملکتوں میں کتابیں ہیں" نظر آئے یا وینس کے قصہ باب مجلس عظمیٰ" (Serreta del grum consiglio) کی طرح آیندہ کے لیے دروازہ بند کر دیا جائے گر مخصوص اعیانیت وہ اصول ہے جسے تمام مملکتیں قبول کر لیتی ہیں اور کسی حد تک اس پر عمل بھی کرتی ہیں اور عمومیت، اعیانیت کی نفی نہیں بلکہ صرف عددیت کی نفی ہے۔ پس ہمارے لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ کوئی ادارہ ایسا موجود ہے جو بہمہ وجوہ اعیانی ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ بعض مملکتوں میں

اعیانیت کا کچھ رنگ ڈھنگ موجود ہے اور بعض کا رنگ ڈھنگ کچھ عمومی ہے۔ میں اس کی تشریح میں ایک مثال قدیم تاریخ سے اور ایک جدید تاریخ سے پیش کرتا ہوں۔

زمانہ قدیمہ میں ایتھنز اصول عمومیت کا اور روما اصول اعیانیت کا گویا قائم مقام تھا گو ان دونوں کے فرق میں کسی قسم کی غلطی یا اشتباہ نہیں ہو سکتا پھر بھی یہ فرق کسی خاص نقطہ پر کچھ نمایاں و بدیہی نہیں ہے۔ دونوں مملکتوں میں مزدوری کرنے والے طبقہ کا ایک بڑا حصہ غلامی کے رواج کی وجہ سے نہایت بیدردی کے ساتھ سیاسی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ دونوں میں حق شہریت کی حفاظت بھی نہایت سختی سے ہوتی تھی۔ اس لئے دونوں میں ان لوگوں کی تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی جنھیں حقوق شہریت حاصل نہ تھے۔ اس حد تک دونوں مملکتیں اعیانی تھیں۔ دوسری طرف دونوں مملکتوں میں آخری اقتدار وسیع عمومی جمعیتوں کے ہاتھ میں تھا جن میں ہر شہری کو حق شرکت حاصل تھا؛ دونوں سلطنتوں میں حکام بکثرت بدلتے رہتے تھے اور کوئی شہری حیثیت کے لحاظ سے حاکم کا عہدہ حاصل کرنے کے ناقابل نہیں قرار دیا گیا تھا۔ اس حد تک دونوں مملکتیں عمومی تھیں۔ پس فرق کہاں تھا؟ جیسا کہ گروٹ نے بتایا ہے، ایتھنز میں ذمہ دارانہ عہدوں کے پر کرنے میں قوم کا میلان اعلیٰ حیثیت، خاندان اور دولت کی جانب ہوا کرتا تھا مگر روما میں لوگ اس سے بہت آگے بڑھ جاتے تھے۔ جب پیٹریشین طبقہ کی قدیم اجارہ داری پلیب طبقہ کے ہاتھوں ٹوٹ گئی تو رفتہ رفتہ ایک نئی اجارہ داری پیدا ہو گئی اور عملاً عہدہ ہائے حکام بعض خاندانوں کے اندر محدود ہو گئے۔ یہ وہ خاندان تھے جن کے ارکان پہلے ان عہدوں پر رہ چکے ہوں۔ عام طور پر کسی نئے شخص کو رائے دہندوں سے کوئی توقع نہیں ہوتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اعیانیت تھی جسے عمومیت کے گہرے اثر نے خراب کر دیا تھا۔ مگر یہ سمجھ لو کہ یہ محض رواج تھا کوئی قانون نہیں تھا، کوئی امر اس میں مانع نہیں تھا کہ کوئی نو وارد اگر چاہے تو امیدوار ہو جائے۔ نہ اس میں کوئی امر مانع تھا کہ قوم اگر چاہے تو اسے منتخب کر لے چنانچہ کبھی کبھی قوم اس حق سے کام بھی لیتی تھی۔

مزید براں مجلس سینات بہترین مفہوم میں ایک اعیانی جمعیت تھی۔ یہ ان لوگوں پر مشتمل تھی جو سرکاری عہدوں پر رہ چکے تھے اور اس لیے معاملاتِ عامہ کا تجربہ رکھتے تھے۔ ایتھنز میں اس کے مثل کوئی جمعیت نہیں تھی کیونکہ "بولے" (Baule) کی خصوصیت اعیانی نہیں تھی۔ بس یہ ایک شے ایسی ہے جو خصوصیت کے ساتھ اعیانی ادارہ کے مثل ہے۔ مگر مجلس سینات کو جو اقتدارِ عظیم حاصل تھا کسی اثباتی قانون پر نہیں بلکہ محض رواج پر مبنی تھا۔ قوم کے اعیانی احساس نے اسے اس جانب مائل کر دیا تھا کہ بہت سے اختیارات جو زیادہ قطعی معنی میں عمومی جمعیتوں سے تعلق رکھتے ہیں، انھیں وہ اسی جمعیت کے پاس چھوڑ دے۔

آخر میں ہم عمومی جمعیتوں میں سے ایک جلیل القدر جمعیت کی تنظیم میں دیکھتے ہیں کہ نسب و دولت کی جانبداری کی غرض سے ایک تدبیر اختیار کی گئی ہے۔ مجلس سنتوریہ میں لوگ فوج کی حیثیت میں آتے تھے اور فرداً فرداً رائے نہیں دیتے تھے بلکہ سو سو کی ٹولی میں یعنی فوجی جماعتوں کی صورت میں رائے دیتے تھے۔ چونکہ ابتدائی زمانہ کی فوج میں سپاہی خود اپنے آلاتِ حرب مہیا کرتے تھے اس لیے زیادہ دولتمند اشخاص صف تقدم میں آجاتے تھے۔ کیونکہ انھیں کی حیثیت ایسی ہوتی تھی کہ وہ پوری طرح مسلح ہو سکیں اس لیے زیادہ دولتمند اشخاص یعنی فوج سوارہ اور پورے مسلح پیدل غریبوں کے قبل رائے دینے کے لیے طلب ہوتے تھے۔ اب یہ دیکھو کہ کیا تدبیر نکالی گئی۔ ہر ایک سنتوریہ صحیح معنی میں سو آدمیوں پر مشتمل ہوتا تھا مگر انتظام یہ کیا گیا تھا کہ غریب سنتوریئے اتنے کم اور اتنے بڑے ہوں کہ متمول سنتوریوں کو کل تعداد میں کثرت حاصل ہو جائے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس جمعیت میں غربا امرا کے مقابلہ میں بے بس تھے۔ لیکن یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ غربا دوسری جمعیت یعنی مجلس قبائلی میں اپنا انتقام لے سکتے تھے کیونکہ اس مجلس میں تعدادی کثرت پر اس قسم کی روک نہیں تھی اور رومانی اعیانیت کے زوال پذیر دور میں یہ بڑھی ہوئی عمومی جمعیت اختیار میں ترقی کر گئی۔

اب ہمیں زمانۂ جدید کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ یہاں ہم اس امر کو کہ

اعیانی مملکت عملاً عمومی مملکت سے کیونکر مختلف ہوتی ہے، اس طرح معلوم کر سکتے ہیں کہ انگلستان اٹھارھویں صدی میں جس حالت میں تھا اس کا مقابلہ ممالک متحدۂ امریکہ سے کریں، یا یہ دیکھیں کہ ادھر حال میں خود انگلستان میں کونسے ایسے تغیرات ہوئے ہیں جن سے انگلستان زیادہ عمومی ہو گیا ہے۔

جدید عمومیت قدیم عمومیت سے زیادہ تر اس اعتبار میں مختلف ہے کہ یہ مزدوری پیشہ طبقہ کو بھی قبول کرتی ہے۔ ممالک متحدۂ امریکہ میں نہ صرف عالمگیر حق رائے دہی موجود ہے، نہ صرف ان لوگوں کو شامل کر لیا گیا ہے جنھیں ایتھنز میں غلاموں کی حیثیت میں مردود قرار دیدیا جاتا بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ انتہائی کارروائی کی گئی ہے یعنی آزاد شدہ حبشیوں کو شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ ایک اجنبی نسل ہے جو تعلیم و تربیت اور صدیوں کے تجربہ سے سیاسی زندگی کے لیے تیار نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ صرف بربریت اور غلامی سے واقف ہے۔ اس ہمہ گیری کے مقابلہ میں ایتھنز کے نظم کو عمومیت کے نام سے یاد کرنا بھی دشوار ہے۔ گو یہاں بھی اعیانی اصول نے عمومی اصول سے کم ترقی نہیں کی ہے۔ قابلیتوں کے اعتبار سے انسان کی عدم مساوات ہمیں قدما کی، بہ نسبت اتنی ہی زیادہ صاف نظر آتی ہے جتنی بعض ابتدائی حقوق کے اعتبار سے ان کی مساوات نظر آتی ہے۔ ہم اس امر کو نظر استعجاب سے دیکھتے ہیں کہ ایتھنز اور روما دونوں جگہوں میں ہر شخص یکساں طور پر عادل کے عہدے بلکہ فوج کی قیادت تک کے لیے موزوں سمجھا جاتا تھا۔ پریٹر اربانوس (رومانی لارڈ چانسلر) ہو جانے کے لیے کسی قسم کے خاص اوصاف کی ضرورت نہیں تھی اور یہ تقرر انتخاب عام سے ہوتا تھا۔ کلیون جو بظاہر ایک غیر فوجی شخص تھا اور صرف اپنی دریدہ دہنی اور عام پسند فصاحت کی وجہ سے مشہور تھا، اسے براسیداس کے مقابلہ کے لیے ایک اہم فوجی مہم کی قیادت سپرد کر دی گئی۔ اگر ہمیں بغاوت عمومی لاابالیانہ حرکت کی اس مثال سے تعجب معلوم ہوتا ہے تو نظر اٹھا کر سنجیدگی پسند اعیانی روما کی طرف دیکھو۔ مملکت کی انتہائی نازک حالت میں جب کہ خود ہنی بال اطالیہ کے قلب میں موجود تھا اور روما کو اس کے خلاف بظاہر اپنی آخری فوج بھیجنا تھی، اس وقت روما نے اس

فوج کو ایک پست طبقہ کے کامیاب وکیل تیرنتیوس وارو کی قیادت میں دیدیا۔ یہ فوج فوراً ہی روانہ ہو گئی لیکن غضبناک "افریقی" نے میدان کانا ے میں اس کا بالکل صفایا کر دیا۔ ہمارے نزدیک یہ کہنا نہایت درجہ کا مضحکہ خیز تمسخر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اہلِ قلم مدبر ایک لمحہ کی اطلاع پر رود بار کے بیڑے کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیلے۔

تم دیکھتے ہو کہ ایک نیا اعیانی اصول پیدا ہو گیا ہے جو ان قدیم مملکتوں کو معلوم نہیں تھا۔ مہارت خاص کا اصول اب تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس خصوص میں ایک شخص کی فوقیت دوسرے پر اتنی مکمل طور پر نمایاں ہو گئی ہے اور کسی اعتراض کی حد سے اس کامل طور پر باہر نکل گئی ہے کہ اب ہم مشکل ہی سے کسی ایسی مملکت کا تصور قایم کر سکتے ہیں جس میں اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو۔ لیکن یہ اصول اعیانی اصول ہے اور اس لئے ممالک متحدۂ امریکہ جہاں ایک اعتبار سے عمومیت میں ایتھنز سے بہت آگے بڑھا ہوا ہے وہیں دوسرے اعتبار سے اعیانیت میں وہ روما سے بھی بہت آگے بڑھا ہوا ہے کیونکہ ملک پر فی الجملہ ماہرین فن حکمرانی کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ صدر جمہوریہ ایسا شخص ہو سکتا ہے جسے خصوصیت کے ساتھ ماہر فن نہ کہا جائے مگر وہ ماہرین کی ایک کابینہ مقرر کرتا ہے۔ خزانہ دار کوئی ماہر مالیات شخص ہو گا؛ وزیر عدلیہ کوئی قانون داں ہو گا اور فوج کسی ماہر فوجی عہدہ دار کی قیادت میں ہو گی۔ قرعہ کے ذریعہ سے انتخاب عہدہ داراں، قانون پیشہ اشخاص کے زیر قیادت افواج، اب ایسے تصورات ہیں جو خیال میں بھی نہیں آ سکتے کیونکہ ہم کتنے ہی عمومی کیوں نہ ہوں مگر کم از کم اتنا ہم جانتے ہیں کہ مخصوص مہارت کے اعتبار سے لوگوں میں بے انتہا فرق ہوتا ہے۔

پس اس طرح ممالک متحدۂ امریکہ کی عاملانہ حکومت میں اعیانی اصول شایع ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ حکومت بہترین اشخاص کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے اور اگر روسائے جمہوریہ کی فہرست میں بعض ناقابل اشخاص کے نام نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عالم گیر رائے سے غلطی سرزد ہو گئی نہ یہ کہ یہ قرار دیدیا گیا ہو کہ صدر جمہوریہ کے عہدے کے لیئے ایک شخص اتنا ہی خوب ہے جتنا دوسرا۔ مزید براں ممالک متحدۂ امریکہ میں جمعیتیں اس سے بہت زیادہ اعیانی ہیں جتنی ایتھنز اور روما میں تھیں

کیونکہ یہ جمعیتیں وفاقیہ اور ریاستوں دونوں میں نیابتی ہیں، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں نیابتی پارلیمنٹ ایک قسم کی انتخابی اعیانیت ہے۔ جہاں ممالک متحدہ امریکہ کی طرح ارکان کو معاوضہ ملتا ہے ہاں یہ صحیح ہے کہ ارکان کا دولتمند یا تعلیم یافتہ طبقہ سے ہونا ضروری نہیں ہے مگر کم از کم اتنا ضرور ہے کہ ارکان وہ اشخاص ہوتے ہیں جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ معاملات عامہ پر صرف کرتے ہیں۔ مگر اتیھنز اور روما میں جمعیتیں ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتی تھیں جو اپنے کاموں کو چھوڑ کر بعجلت تمام جمعیت میں پہنچتے تھے اور پھر واپس ہو کر فوراً ہی اپنا کام کرنے لگتے تھے۔ اس نظم میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ غور و فکر کے اغراض کے لیے ایک شخص اتنا ہی اچھا ہے جتنا دوسرا؛ مگر تم مشاہدہ کرو گے کہ جدید عمومیت یہ قرار دیتی ہے کہ جو شخص اپنے کو معاملات عامہ کے لیے وقف کر دے، وہ ان اغراض کے لیے اس شخص سے بہتر ہے جو ایسا نہ کرے، اور یہ ایک اعیانی اصول ہے۔

آخری امر یہ ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ نے روما اور انگلستان سے ایک ایسے ادارے کی نقل کی ہے جو قطعاً اعیانی ہے اور وہ مجلس سینا ہے۔ اس کے ارکان کی میعاد زیادہ طویل یعنی دو برس کے بجائے چھ برس ہوتی ہے۔ ان کیلیے عمر کی ایک خاص حد یعنی تیس برس پر پہنچنا بھی ضروری ہے اور ان کا انتخاب قوم کی طرف سے نہیں بلکہ ریاستوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ تمام قیود اس اعیانی اصول پر مبنی ہیں کہ لوگ مساوی نہیں ہیں بلکہ بعض اشخاص بعض سے افضل ہیں۔

خود انگلستان کا نظم جس حالت میں کہ اب ہے متعدد جہات میں اس سے بہت زیادہ اعیانی ہے۔ انگلستان میں عالمگیر حق رائے دہی نہیں بلکہ صرف مکاندارانہ رائے دہی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی قوم کی ایک بہت بڑی تعداد بلکہ ان کی بہت بڑی کثرت کو ہنوز ملک کی حکومت میں کوئی حصہ نہیں ملا ہے۔ دوسرے یہ کہ ارکان کو معاوضہ نہیں ملتا۔ چونکہ انتخابات کے اخراجات بہت گھٹا دیئے گئے ہیں اس لیے اس کا مفہوم اب یہ نہیں رہا ہے کہ لازمی طور پر نشستیں صرف انہیں لوگوں کو ملیں جو بالضرور دولتمند ہوں مگر اس کا مفہوم یہ ہو گیا ہے کہ صرف وہی لوگ پارلیمنٹ میں نشست کر سکتے ہیں جو ذاتی طور پر غیر نفع بخش کام کے لیے بہت وافر وقت رکھتے

ہوں۔ تیسرے یہ کہ جو لوگ سب سے اعلیٰ عہدے یعنی وزارتِ عظمیٰ کے پُر کرنے کے لئے بہترین طور پر متصف ہوتے ہیں وہ انتخابِ طبعی کے ایک نہایت ہی زوردار مخصوص طریقے سے جو بہت طویل زمانے پر پھیلا ہوتا ہے چنے جاتے ہیں۔

لیکن اٹھارھویں صدی میں انگلستان میں ایک ایسا نظم موجود تھا جسے ہم دنیا کی نوعی اعیانیت کے لئے موزوں طور پر منتخب کر سکتے ہیں یعنی وہ اس شکلِ حکومت کا نمونہ تھا جس میں اعیانی اصول عمومی اصول کو مغلوب کر دیتا ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ جبشیوں کو شامل کر لینے سے عمومی اصول کا دعوے اس جرأت وقوت کے ساتھ ہوا ہے کہ باوجود ان تمام اعیانی مانعات و خارجات کے جنھیں میں بتا سکتا ہوں، ہم یہ کہنے سے باز نہیں آسکتے کہ بحیثیتِ مجموعی یہ نظم ایک عمومیت کا نمونہ ہے۔ اسی طرح قدیم انگریزی نظم اتنی ہی قطعی طور پر اعیانی تھا۔ روما کی طرح انگلستان میں بھی ایک ادارہ ہمیشہ الیسار ہا ہے جو خصوصیت کے ساتھ اعیانی تھا اور وہ دارالامرا ہے۔ مگر رومانی مجلس سینیٹ کی بہ نسبت یہ خالصاً اعیانی کم اور عدیدی زیادہ ہے۔ سینٹ میں تمام اعلیٰ حکام لا محالہ نشست کرتے تھے دارالامرا میں یہ امر اتفاق پر منحصر ہے اور علی العموم بعض نہایت ہی ذی وجاہت وزرا اس کے رکن نہیں ہوتے۔ دارالامرا میں زیادہ تر نسب ہی رکنیت کا قطعی و واحد استحقاق ہے اور یہ اعیانی سے زیادہ عدیدی ہے۔ مجلس سینانت میں اس قسم کا کوئی سخت قاعدہ نہیں تھا اور اگرچہ جمعیت بحیثیتِ مجموعی امرا ہی پر مشتمل تھی مگر پھر بھی نسب سے بذاتہٖ کوئی استحقاق نہیں پیدا ہوتا تھا۔

لیکن اگر اٹھارھویں صدی میں انگلستان اعیانی تھا تو یہ بالتخصیص دارالامرا ہی کی وجہ سے نہیں تھا۔ اعیانیت کا شتیبان دارالامرا نہیں بلکہ زیادہ تر دارالعوام تھا مگر یہاں بھی اعیانیت نے اپنے لئے مخصوص ادارات پیدا کرنے کے بجائے موجودالوقت ادارات پر اپنا رنگ چڑھا دیا تھا۔ انتخابات کے اخراجات، جلیل القدر زمیندار خاندانوں کے وسیع اثرات، چھوٹے چھوٹے ذی اختیار قصبات کا ان خاندانوں پر انحصار، بہت سے نہایت ہی وسیع اور نہایت ہی متمول شہروں کا استثناء ان تمام وجوہ سے دارالعوام ایک ایسا ایوان ہو گیا تھا جو ادنیٰ طبقات کی کچھ بھی نمایندگی

نہیں کرتا تھا بلکہ زیادہ تر زمیندارانہ اغراض کے زیرِ اقتدار تھا اور ان زمینداروں کو درجۂ اعلیٰ کے کچھ تاجروں کے شامل ہو جانے کے خلاف جد و جہد کرنا پڑتی تھی۔ ابتدائً یہ ایک بااعتدال خالص اعیانیت تھی، یعنی اول اول زمیندار طبقہ اور اعلیٰ تاجر انھیں میں فی الحقیقت قوم کی سیاسی زندگی مرکوز تھی؛ گو اٹھارھویں صدی کے تمام دوران میں اس کی اعیانی کیفیت کم ہوتی جاتی اور عدیدی کیفیت بڑھتی جاتی تھی۔ تاہم اس نے آخر تک صحیح اعیانیت کی ایک اعلیٰ و معزز خصوصیت کو قایم رکھا۔ "بوسیدہ قصبات" کے مالکوں نے اکثر صدقِ دل سے ترقی یافتہ قابل اشخاص کی تلاش کی اور اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں جن لوگوں کی فصاحت و بلاغت نے دار العوام کو شہرۂ آفاق بنا دیا اس میں سے بیشتر اشخاص کو انھیں لوگوں نے دار العوام میں داخل کیا تھا۔ تاریخ میں یہ دور جیسا درخشاں نظر آتا ہے وہ کم و بیش اسی امر کا نتیجہ ہے۔

پس حالت یہ ہے کہ ایک ہی مملکت کے ادارات پر ایک وقت میں اعیانیت اپنا رنگ چڑھا دیتی ہے اور دوسرے وقت میں عمومیت اپنا سکہ جما دیتی ہے۔ لیکن اگرچہ مساوات اور اوصاف خصوصی کے متخالف الفاظ فریقانہ معرکہ آرائی میں تقریباً دوسرے لفظ سے زیادہ استعمال کیے جاتے ہیں، پھر بھی یہ کہنا دشوار ہے کہ ترتیب و تقسیم کے کام میں وہ ہمارے لیے کچھ زیادہ کارآمد ہیں، کیونکہ ان دونوں کے مابین اصول کے اعتبار سے کوئی حقیقی مخالفت نہیں ہے، بلکہ سوال صرف "کمیت" کا ہے۔ اگر کسی خوش نصیب انکشاف کے ذریعہ سے اعیانیت و عدیدیت کے بدبخت تعلق کو ہمیشہ کے لیے منقطع کیا جا سکے اور کوئی ایسا معیار تجویز کیا جا سکے جسے قابلِ اطمینان تسلیم کیا جائے اور اس میں اس خطرناک تخریب کی قابلیت نہ ہو جیسی نسب و دولت کے معیاروں میں ہے، تو پھر مخالفت تقریباً ختم ہو جائے گی اور عمومیت و اعیانیت ایک دوسرے سے متصل ہو جائے گی۔ مملکتوں کی ترتیب و تقسیم کرتے وقت ہم صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ بعض تو اعیانی ہیں اور بعض عمومی، مگر یہ فرق فی الجملہ شکل میں اس قدر ظاہر نہیں ہوتا جس قدر رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر اعیانیت کی خصوصیت رکھنے والا کوئی ادارہ ہے تو ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ وہ ادارہ

ایوانِ بالائی ہے۔ مجلس سینیٹ یعنی معمر اشخاص کی جمعیت، مجلس عقلا یعنی ارباب دانش کا جلسہ، یہ دونوں اصولاً قطعی اعیانی ہیں۔ ایک طرف وہ عمومیت کی ضد ہیں اور دوسری طرف عددیت کی بھی ضد ہیں۔ گریہ ادارہ عملی طور پر اعیانی مملکتوں کا مخصوص نشان نہیں کہا جاسکتا چنانچہ اس موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ طاقتور و کارکن ایوانِ دوم ایک بہت بڑی نوعی عمومیت میں پایا جاتا ہے؛ یہ ایوان ممالک متحدۂ امریکہ کی مجلس سینیٹ ہے۔

شاید اس ضمن میں سب سے زیادہ صحیح بیان یہ ہوگا کہ تین قسم کی مملکتیں ہیں، ایک وہ جن میں عمومی و اعیانی اصول میں آشتی و توازن ہے اور دوسری وہ جن میں ان اصول میں سے ایک نہ ایک حاوی و غالب ہے۔ کیونکہ (جیسا کہ میں بااصرار کہہ چکا ہوں) اصولوں میں کوئی مخالفت نہیں ہے، صرف رجحانات میں عملی مخالفت ہے اور ہم نے حکومت اور حکومت ساز قوت میں جو امتیاز قایم کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہر ایک کو اس کے مناسب حدود اختیار عطا کر دینے سے یہ عملی مخالفت کیونکر روکی جاسکتی ہے۔ تمام حقوق و اغراض کی مساویانہ نمایندگی کے لئے عمومیانہ دلائل اور ہمہ گیری کے تمام پرزور احتجاجات، واقعاً حکومت کی طرف راجع نہیں ہوتے بلکہ حکومت ساز قوت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہر شخص اس سے خوش ہوگا کہ بشرطِ امکان غریبوں اور کمزوروں کو بھی حکومت کے بنانے میں کچھ حصہ ملے مگر کسی شخص کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ غربا و ضعفا خود حکمرانی کریں۔ دوسری جانب اعیانی دلایل تمامتر حکومت کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ یہ کہ حکومت ایک مشکل فن ہے جس میں تجربہ، مخصوص علم اعلیٰ تعلیم، استقامت طبع اور تیز ذہانت کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی رد و قدح نہیں ہے۔ اب اس زمانے میں اگرچہ عمومیت کا شیوع ہے مگر یہ اصول اس وقت اتنا موردِ اعتراض نہیں ہے جتنا اعیانی زمانوں میں تھا، لیکن اس اصول کا اشارہ اس حکومت ساز قوت کی طرف نہیں ہے۔ لوگ وسیع مہارت، اعلیٰ تعلیم و روشن خیالی کے بغیر براہِ راست یا اپنے سے زیادہ ماہر نمایندوں کے وسیلے سے حکومت کے بنانے اور بگاڑنے میں حصہ لے سکتے ہیں۔

لیکن ان دونوں اصول میں ایسی ہم آہنگی و یکسانی انھیں مملکتوں میں

ممکن ہے جہاں حکومت ساز قوت نے ترقی کرلی ہے اور اسے ایک عضو میسر آگیا ہے مگر تاریخ میں اس قسم کی مملکتیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ اس لیئے تاریخ میں یہ اصول عام طور پر ایک دوسرے سے ٹکراتے اور ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ قدیم مملکتوں میں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اعیانی اصول عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ قوم کو ہنوز سیاسی ادراک حاصل نہیں ہوتا۔ مگر سیاسی زندگی بجائے خود ایک تعلیم ہے اور اگر قوم خانہ جنگی کی وجہ سے کسی تباہی میں مبتلا نہ ہو جائے تو بعض حالات میں ایک زمانہ ایسا آجاتا ہے جب فہم و فراست وسعت کے ساتھ پھیل جاتی ہے اور ایک حد تک سیاسی ادراک عام ہو جاتا ہے۔ یہ مرورِ ایام جو اس حالت کے پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے وہی بالعموم حکمران اعیانی گروہ کے خراب کر دینے اور اسے ایک خود غرض و بد دماغ عدیدیت میں بدل دینے کے لیئے بھی کافی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک عمومی دور شروع ہوتا ہے۔ سابق تر زمانے میں عمومیت کا تصور تک محال اور قوم کے ہاتھ میں حکومت کے ہونے کا تخیل تک مضحکہ انگیز معلوم ہوتا تھا، چنانچہ ہومر نے تھرسی تیس پر لعن طعن کی بارش کی شیکسپیر نے جیک کیڈ کا نقشہ کھینچا ہے۔ کورنٹی نے یہ لکھا ہے کہ "بدترین مملکت وہ ہے جہاں عمومیت کا راج ہو۔" اب اس زمانے میں اعیانیت اسی قدر نا قابلِ پذیرائی ہوگئی ہے۔ لوگوں کے طبائع اب اس تصور کے قبول کرنے سے ابا کرتے ہیں۔ جب تم اعیانیت کا ذکر کرتے ہو تو وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد عدیدیت ہے۔ جب تم موزونیت، اعلیٰ اوصاف اور اعلیٰ اخلاق کا تذکرہ زبان پر لاتے ہو تو وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اس قدیم زمانے کی کج بحثیوں سے خوب واقف ہیں، جس کے ذریعے سے غربا امرا پر قربان کیئے جاتے تھے اور چالاک سادہ لوحوں کی آنکھوں میں خاک ڈالتے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ انسان کو لوٹنے کا پرانا قصہ ہے۔

بایں ہمہ انھیں ترقی یافتہ زمانوں میں جب کہ معاشرہ پیچیدہ ہوگیا ہے حکمرانوں میں خاص مہارت کی قطعی ضرورت لوگوں کو ہمیشہ سے زیادہ نظر آرہی ہے اور اعیانیت کا اصول عمومیت کے اصول سے کم عظیم الشان دا ہم نہیں معلوم ہوتا۔ ہم جانتے ہیں کہ وزرا کا ماہرانِ فن میں سے ہونا ضروری ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا اُن میں

محض مہارت سے زیادہ اوصاف کی ضرورت ہے۔

لیکن جہاں حکومت اور حکومت ساز قوت میں امتیاز قایم کیا جاتا ہے وہاں پھر ان کورانہ اہتزازوں سے بچاؤ نہیں ہو سکتا۔ ہم حکومت ساز قوت کے معاملہ میں عمومیت کو تقریباً غیر محدود اختیار دے سکتے ہیں پھر بھی کوئی امر اس رائے کے قایم رکھنے میں مانع نہیں ہوتا کہ خود حکومت کو اور زمانوں کی بہ نسبت کم نہیں بلکہ بہت زیادہ امیانی ہونا چاہیے اور یہ کہ جدید مملکتوں کی وسعت اور جدید زندگی کی پیچیدگی کا اقتضا یہ ہے کہ خود حکومت میں اس سے زیادہ ذہانت و فطانت، زیادہ سخت طریق کار، زیادہ قطعی علم اور زیادہ استقامت طبع ہو، جتنی کسی سابق زمانہ میں درکار تھی۔

خطبۂ ہشتم

سلسلۂ خطبات میں رسائل کی سی گنجائش و جامعیت دشوار ہے میں نے یہ تہیہ کیا تھا کہ تمھارے سامنے علم سیاسیات کی توضیح و تشریح کروں مگر میں اپنا سلسلۂ کلام ختم کرنے پر مجبور ہوا چنانچہ ابھی نصف سے زیادہ کام میں ہاتھ بھی نہیں لگا ہے مجھے جو کچھ توقع ہے وہ یہی کہ میں نے خاکہ کافی توضیح سے کھینچ دیا ہے اور طرز استدلال کی اتنی کافی مثلیں تمھارے سامنے پیش کر دی ہیں کہ تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ اس توضیح و تشریح کے کام کو خود آگے بڑھا سکو۔

ہم اس اثناء میں صرف ایک کام میں مشغول رہے ہیں اور وہ حکومتوں کی ترتیب و تقسیم کا کام ہے میں نے حسب حال چند نمونوں کی جانچ کی ان کے نہایت ہی اہم فرقوں کی نشان دہی کی انھیں فرقوں کے اعتبار سے انھیں مختلف طبقات میں ترتیب دیا اور ہر طبقے کا ایک نام رکھا ہم نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ یہ کام میرے نزدیک سیاسیات کی اس شق کا ایک نہایت ہی اہم و ضروری جزو رہا ہے، گر یہ یقینی ہے کہ وہ صرف ایک جزو ہی ہے۔ سلسلے کے آغاز میں میں نے یہ طے کیا تھا کہ اس قسم کے علم کی لازماً دو وسیع شقیں ہونی چاہئیں جن میں شق دوم میں حکومتوں کے باہمی تعلقات سے بحث کرنا چاہیئے۔ اس دوسری شق کو ہم نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے اور پہلی شق پر بھی مکمل طور پہ بحث کرنے سے ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

میں نے آغاز بحث میں اس تشریح کے بیان کرنے میں زحمت اٹھائی تھی کہ علم السیاست پر اس طرح بحث کرنے سے میں تاریخ کے مضمون کو ترک نہیں کرتا بلکہ میرے نزدیک جب مورخ زمانۂ گزشتہ کے اہم واقعات کی تحقیق کرتا ہے اور ایک مخصوص واقعے کی تصدیق کرتا ہے اور انھیں علل واسباب کے صحیح تعلق کے اعتبار سے ترتیب دیتا ہے تو وہ صرف ایک ایسا مواد تیار کرتا ہے جس پر علم سیاسیات مبنی ہو سکے۔ میری یہ بھی رائے ہے کہ مورخ کو صرف اس حد تک محدود نہیں رہنا چاہیے کہ وہ مواد تیار کر دے اور اس سے ایک جدید علم بنانے کا کام سیاسی فلاسفہ کے لیے چھوڑ دے، بلکہ اہم یہ ہے کہ وہ دونوں فرائض کو یکساں طور پر ہاتھ میں لے۔ مورخ اور سیاسی فلاسفہ کے درمیان تقسیم عمل نہ ہونا چاہیے۔

میں نے ان خطبات میں یہ وعدہ کیا تھا کہ میں تاریخ سے قریب رہوں گا اور میرا خیال ہے کہ میں نے اپنے وعدے کو پورا کر دیا ہے۔ میں نے کسی خیالی مملکت پر بحث نہیں کی ہے، میں نے کوئی قیاسی طریق نہیں استعمال کیا ہے، میں نے یہ نہیں کیا کہ نظریہ پہلے بنا یا ہو اور پھر بعد کو واقعات پر اس کا اطلاق کیا ہو۔ میرا طریق یہ رہا ہے کہ میں ان مملکتوں پر نظر کروں جو تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے، ان میں سے ایک کا دوسرے سے مقابلہ کروں اور وسیع ترین تشابہات اور نمایاں ترین تخالفات کو ضبط کروں۔ لیکن ہم نے اپنے کو محض مرجع واقعات کے اندراج ہی تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس کے برخلاف ہمیں تحلیل واستدلال کے لیے بہت موقع ملا ہے مگر ہمارا استدلال محض تخمینی نہیں رہا ہے؛ اس سے زیادہ تر یہ کام لیا گیا ہے کہ الفاظ کے استعمال میں عام بے پروائی اور تساہل کی وجہ سے دوسرے مضامین کے بہ نسبت اس مضمون میں جو زیادہ مغالطات و اشتباہات پیدا ہو جاتے ہیں انھیں رفع کیا جائے۔

مختصر یہ کہ میں نے مملکتوں کو اس نظر سے دیکھا ہے جس نظر سے سائنس داں نباتات وحیوانات کو دیکھتا ہے، مگر میں نے ان پر بحث بالکل اسی طرح نہیں کی ہے جس طرح ماہر علم توافق الاعضا، نباتات وحیوانات پر بحث کرتا ہے بلکہ اس طرح ان پر بحث کی ہے جس طرح ماہر علم نباتات درختوں کے متعلق اور ماہر علم حیوانات حیوانوں

کے متعلق بحث کرتا ہے۔ اگر میں اس مقصد میں کامیاب ہوا ہوں تو تم یقیناً اس قابل ہو گئے ہو گے کہ جب کوئی نئی مملکت تمھارے سامنے آوے تو تم فوراً اسے بالکل اسی طرح ایک قطعی نام سے موسوم کر سکو جس طرح کوئی ماہر علم نباتات دیکھتے ہی کسی پھول کا نام بتا دیتا ہے بلکہ وہ علمی نام بھی بتا دیتا ہے جو نباتاتی نظم میں اسے دیا گیا ہے۔ تمام نام ایک طرح کے مختصر اشارات ہیں، کتے یا گھوڑے کے الفاظ ہم جتنی مرتبہ استعمال کرتے ہیں اتنے مرتبہ ہم ایک طولانی تعریف کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔ مملکتوں کے متعلق علمی حیثیت سے بحث کرنے میں پہلا قدم اس وقت رکھا جاتا ہے جب ہم مملکتوں کے انواع و اقسام کے لیے اس قسم کے عام ناموں کا ایک ذخیرہ مہیا کر لیتے ہیں اس وقت تک شاہی، جمہوریہ، وفاقیہ وغیرہ کے ایسے چند ہی نام عام استعمال میں آئے ہیں، میں نے اپنا فرض یہ سمجھا ہے کہ ان ناموں پر تنقید کروں تاکہ اگر کوئی ابہام ان میں رہ گیا ہو تو رفع ہو جائے اور ساتھ کے ساتھ نئے ناموں کا بھی اضافہ کر دوں۔ نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس قابل ہو جائیں کہ ہم مملکتوں کی تعریف اور تاریخ میں ان کے ارتقا و انقلاب کا بیان اس طرح سے کریں کہ ان میں اختصار بھی زیادہ ہو اور ان کی قطعیت بھی بہت بڑی ہوئی ہو۔

پس غالباً میں خطبات کے اس سلسلے کو اس سے زیادہ مفید طور پر ختم نہیں کر سکتا جتنا وقت میرے پاس ہے اس میں سرسری طور پر یہ بتا کر کھینچ جاؤں کہ کس حد تک یہ نام تاریخ کی داستان میں استعمال ہو سکتے ہیں۔ میں تاریخ کی وہی موٹی موٹی باتیں لوں گا جو ہم سب کو معلوم ہیں اور اس پر تنقید یا اس میں تغیر و اضافہ کی فکر نہیں کروں گا۔ ماہرانِ علوم مصریات واشوریات و دیدیات نے جو نیا مواد پیدا کیا ہے اس پر میں کچھ بحث نہ کروں گا بلکہ صرف یہ کروں گا کہ پرانے قصہ کو اس نئی زبان میں بیان کروں جو ہم نے اپنے لیئے مہیا کی ہے۔ تمھیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ مجھے ایک لفظ بھی بیکار ضایع نہ کرنا چاہیئے۔

پس سب سے پہلے ہم بحر متوسط کے سواحل پر متعدد چھوٹی چھوٹی قوموں کو دیکھتے ہیں، جن میں بعض یونانی بولتی تھیں، بعض لاطینی یا اس کے مماثل زبانیں اور بعض بہت دور مشرق میں سامی زبانیں بولتی تھیں۔ ان میں سے بعض قوموں کی

نیم محو قدیمی تاریخ کا عبرانی تاریخ سے (جس کے خط و خال ابتدائی زمانہ کے لیے نسبتاً زیادہ صاف ہیں) مقابلہ کرنے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب قبایل کی حالت کے اعتبار سے یکساں تھیں اور سب کے سب ایک ہی سے زور دار طور پر مذہبی عقاید پر مشتمل تھیں۔ مذہبی یا حاکمانہ مذہبی اثر مندروں سے نکل کر قبایل میں ترمیم و اعتدال پیدا کر دیتا، اور اکثر انھیں مختلف لیگوں میں متحد کر دیتا تھا۔ متعدد معاشرے پیدا ہو گئے تھے جن میں ہنوز چند ہی نے سیاسی ادارات کی کیفیت اختیار کی تھی، مگر پرزور منصوب اور اعلیٰ درجے کے منظم مذہبی ادارات موجود تھے۔ قبیلہ ہر جگہ ایک حد تک اور بعض جگہ قطعی طور پر حکومتِ مذہبی کی حالت کو پہنچ گیا تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے معاشرے مسلسل لڑائیوں کے ذریعے سے ایک دوسرے پر اثر ڈالتے رہتے تھے اور یہ دباؤ بادشاہی اور منظم حکومت کے وجود میں آنے کا باعث ہوتا تھا مگر یہ انتظام مدتوں ابتدائی حالت میں رہتا تھا۔

اس طرح، یہ مذہبی حکومتیں ترقی کر کے مملکتیں بن گئیں۔ مگر یہاں یہ مملکتیں زیادہ تر شہری مملکتیں تھیں جو متجانس گروہوں میں پائی جاتی تھیں۔ قرابت اور اشتراکِ مذہب کے احساس نے ان میں سے ایک تعداد کو باہم متحد کر دیا تھا۔ مگر یہ اتحاد اخلاقی و لسانی تھا، نہ کہ سیاسی۔ اس اثنا میں ان قوموں کے رقبات سے خارج (جو زیادہ تر کوہستانی تھے) ایران کے مشرقی سطح مرتفع میں پہاڑیوں پر اور دریا ہائے عراق کی وادیوں میں ان سے مختلف طرز کی اور وسیع پیمانے پہ سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں۔ آخر ان کا دباؤ محسوس ہونے لگا۔ عبرانی سلطنتیں منتشر اور عبرانی ملتیں مفتوح ہو گئیں۔ مگر مملکتی حیثیت سے تباہ ہو جانے کے بعد، وہ مذہبی حکومت کی حیثیت سے قائم رہیں۔ یونان کی شہری مملکتوں کو بڑی دشواریوں سے ایک ملکی مملکت کے پہلے حملہ کے مسترد کرنے میں کامیابی ہوئی اور ایرانی پسپا کر دیے گئے۔ مگر کچھ زمانہ بعد یہ مملکتیں اسی قسم کے ایک دوسرے حملہ سے زیر ہو گئیں جو مقدونیہ کی ملکی مملکت نے شمال کی جانب سے کیا تھا۔

لیکن مغرب کی جانب شہری مملکت کی قسمت کچھ اور ہی واقع ہوئی تھی۔ اطالیہ کو یونان و شام کے مانند ایشیائی حملوں کی آزمائش میں نہیں پڑنا پڑا

کوہ آلپس سے شمال کی آبادیاں زیادہ تر قبائلی حالت میں رہیں، وہ صرف وحشیانہ یورشیں کر سکتی تھیں منضبط حملہ نہیں کر سکتی تھیں۔ لہذا اطالوی شہروں کو غیروں کا مطیع نہیں ہونا پڑا۔ مگر ان کا دباؤ ایک دوسرے پر برابر جاری رہا۔ جس طرح ہم نے یونان میں دیکھا ہے کہ کبھی یہ شہر کبھی وہ شہر یعنی کبھی انتھنز کبھی اسپارٹا کبھی تھیبز تقدم حاصل کر لیتے تھے وہی حال اطالیہ میں بھی تھا؛ مگر یہاں روما کی پرزور شہری سلطنت قوت و اقتدار میں برابر بڑھتی گئی اور آخرکار تمام فریقوں پر غالب آگئی اور تمام دوسرے اطالوی شہری اور قبیلے یا مفتوح ہو گئے یا اس کے تابع بن کر رہنے پر مجبور ہوئے۔ نتیجہ اس کا ایک قسم کی عہدیت ہوا۔ یہ عہدیت اگرچہ اپنی تنظیم میں عظیم الشان ملکی مملکتوں سے مختلف تھی مگر فوجی قوت میں ان کے برابر تھی۔ یہ اہم وفاقی اتحاد جب حملہ کی آزمائش میں پڑا اور پہلے پرہوس کا حملہ ہوا اور پھر عملاً اسپین کے بادشاہ اور کم و بیش قرطاجنہ کے بھی تخم دبنیں حکمراں ہنی بال کی زبردست فوجی قوت نے اس پر دست درازی کی اس وقت یہ اتحاد اس امتحان سے کامیاب نکل آیا۔

دنیائے قدیم کی تمام مشرقی جانب پر جو تباہی وارد ہوئی۔ اس کی تشریح ایک لفظ شہری مملکت سے ہو جاتی ہے۔ یہ لازمی ہے کہ جنگ میں شہری مملکت منضبط ملکی مملکت کی مدمقابل نہیں ہو سکتی۔ مغربی جانب کا اس قسمت سے بچ نکلنا اس وجہ سے ہوا کہ اطالیہ روما کی زبردست سرگروہی کے سایہ میں متحد ہو گئی تھی۔

اب طاقتور و فاتح مغرب مفتوح و ناتواں مشرق کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہو گیا۔

ہمارا اصول یہ تھا کہ فتح سے غیر عضوی مملکت وجود میں آتی ہے چونکہ یہ مملکت بالعموم رقبہ میں بہت بڑھی ہوئی اور تاب و توانائی میں بے انتہا گھٹی ہوئی ہوتی ہے اس لیئے وہ تقریباً ہمیشہ ہی کمزور ہوتی ہے۔ تھوڑا زمانہ گزر جانے کے بعد تمام فوجی شہنشاہیاں لاشۂ بے جان ہو جاتی ہیں۔ اس کمزوری کا اظہار سب سے پہلے ایرانی شہنشاہی میں ہوا۔ جب فیلقوس نے مقدونیہ کی ملکی مملکت کو متحد و مستحکم کر لیا تو اس کے جنوب میں کمزور شہری مملکتیں نظر آئیں اور اس کے مشرق میں بھی ازکار رفتہ غیر عضوی شہنشاہی تھی۔ اس ملکی مملکت نے یکے بعد دیگرے ان

سب کو سرنگوں کر دیا۔ فیلقوس نے یونان کو زیر کیا، سکندر نے ایران کو لیکن سلطنتِ مقدونیہ خود بھی غیر عضوی تھی، چنانچہ اسے بھی کچھ عرصہ گزرنے پر زوال ہو گیا۔

روما نے اسی طریقے پر جنگ کے ذریعے سے اطالیہ کو متحد کیا تھا مگر اس کے مانند یہاں نتیجہ غیر عضوی نہیں پیدا ہوا۔ اطالوی مملکتیں ہم جنس تھیں اور لفظ فتح سے موزوں طور پر اس عمل کا اظہار نہیں ہوتا جس عمل سے روما نے انھیں متحد کیا تھا۔ رومانی اطالیہ غیر عضوی مشرق کے مقابلہ میں بے انتہا زیادہ قوی تھی۔ ایک سلسلۂ مہمات کے دوران میں جس کے نتیجہ میں کبھی کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا، سپیو، فلیمنس، پولوس، ممیس، لوکلس اور پومپی نے سکندر کی شہنشاہی کے بیشتر حصہ کو روما کے لیے حاصل کر لیا۔

ان تمام تغیرات کی تشریح صرف ایک لفظ غیر عضوی میں موجود ہے۔

لیکن عظیم الشان اطالوی عہد یہ جس قدر اپنے مشرقی ہمسایوں سے قوت میں فائق و برتر تھی اسی قدر اپنے مغربی ہمسایوں سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس وقت ان ممالک نے جنھیں اسپین، فرانس، انگلستان، اور جرمانیہ کہتے ہیں، کوئی مستحکم سیاسی عمارت نہیں تیار کی تھی۔ ان میں نہ شہری مملکتیں تھیں اور نہ مضبوط ملکی مملکتیں۔ میرے نزدیک انھیں قبائلی حالت میں سمجھنا چاہیئے۔ گو غالیہ اور برطانیہ میں ایک مذہبی نظم یعنی طریق ڈروئڈ معقول حد تک ترقی کر گیا تھا مگر ان اقطاعِ ارض کے بعض حصص میں آبادی ہنوز مضبوطی کے ساتھ کسی معین مملکت سے وابستہ نہیں ہوئی تھی۔ نقل وطن جرمانی تاریخ کی بہت بڑی ہیئت مخصوص ہے خاص کر قدیم ترین زمانہ سے ایک ہزار برس بعد تک جرمانی قومیں جرمانیہ سے نکل کر اکثر مغرب کی طرف جاتی رہتی تھیں، (جس طرح کہ اس سے قبل زمانہ میں غالی قبائل غالیہ کو چھوڑ کر جنوب کو چلے گئے تھے) اور غیر ملکی قومیں مشرق کی طرف سے وقتاً فوقتاً جرمانیہ میں داخل ہوتی رہتی تھیں۔ معاشرے کی اس سیل رواں حالت میں مغربی قومیں صرف مختصر الوقت کوششوں میں اپنا زور دکھا سکتی تھیں۔ روما اپنے اوائل زمانہ میں ایک مرتبہ غالیوں کے سیلاب میں غرق ہو گیا تھا اور اپنے دورِ حکومت میں بھی ایک سے زیادہ مرتبہ ورائے آلپس کے قبائل کی نقل و حرکت سے خطرہ میں پڑ گیا تھا

مگر معمولی حالت میں یہ قبایل روما کی قوت کی مقاومت کی طاقت اس سے زیادہ نہیں رکھتے تھے جتنی مشرق کی غیر ملکی مملکتیں۔ اسپین ، غالیہ اور آخر میں برطانیہ کا خاص حصہ سب کے سب مقدونیہ کی شہنشاہی قسمت کے شریک کار نکلے۔ لیکن یہاں لفظ "قبائلی" سے وہ توجیہ مہیا ہو جاتی ہے جو وہاں "لفظ غیر عضوی" سے مہیا ہوتی ہے۔

اطالیہ کے حدود کے اندر روما غیر عضوی مملکت پیدا کیے بغیر فتوحات کر سکتا تھا مگر جب اُس کے فتوحات بحر متوسط کے تمام سواحل پر وسیع ہو گئے اُس وقت یہ ممکن نہیں رہا۔ صوبہ جات کی حکومت ایک مدت تک مہیب طور پر غیر عضوی رہی۔ جمہوریہ کی آخری ڈیڑھ صدی میں پروکانسل اور پروپریٹر ایران کے مرزبانوں اور ترکی کے پاشاؤں کے مثل ہو گئے تھے۔ رومانی شہنشاہی میں غیر عضوی مملکت کے دو خصوصیات وسعتِ عظیمہ و قوتِ قلیلہ معاً نمایاں ہو گئے۔ اتنی وسیع سرحد کی مدافعت کا کام حدِ برداشت سے زاید معلوم ہونے لگا اور اس لیے اسی مقصد کے لیے ایک خاص عضو کے جداگانہ پیدا کرنے کی ضرورت لاحق ہو گئی یعنی ایک وسیع مستقل فوج قائم ہونا شروع ہو گئی۔ مگر فی نفسہ اسی مستقل فوج سے شہنشاہی کی ذاتی قوت میں کمی کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ فوج مختلف اللسان و غیر متمدن تھی۔ مزید براں اتنے وسیع ادارات کی رہبری کرتے ہوئے روما کا قدیم دستور (جو ایک شہری مملکت کا چھوٹا سا نظم تھا) بالکلیہ غیر مکتفی ہو گیا۔ اس لیے رومانی شہنشاہی میں ایک بڑا تغیر ہو گیا۔ اس وسیع فوج کی قیادت اور سرحدوں کی ذمہ داری کے لیے ایک نئے عہدہ دار کا تقرر کرنا پڑا جس کے اختیار نے لامحالہ شہری مملکت کے قدیم حکام کو محو کر دیا اور ساتھ ہی کسی کو یہ ممکن معلوم نہ ہوا کہ اس اختیار کو اس حکومت ساز عضو کے تابع کر دیا جائے جس سے قدیم حکام کے تقرر کا کام لیا جاتا تھا۔ الغرض حکومت ساز اختیار مستتر ہو گیا اور مطلق العنانی برپا ہو گئی۔ اس کے ساتھ عدیدیت کی ایک خاص شکل بھی رونما ہو گئی۔ فوج کو اب سلطنت کے اندر تفوق حاصل ہو گیا ؛ اور شخصی حکومت شہنشاہی اصول کے مترادف قرار پائی۔ اگرچہ بہترین شہنشاہوں نے یہ کوشش کی کہ مجلس سینات کے اثر سے قوم کے اثر کو متوازن رکھیں پھر بھی آخر میں یعنی تیسری صدی عیسوی سے عسکریت نے ہر ادارے پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔ غیر عضوی مملکت میں فوجی

مطلق العنانی مملکت کی مرغوب شکل ہے، اور چونکہ رومانی شہنشاہی جیسی کچھ تھی وہ نیم عضوی تھی اس لیئے اس نے ایسی شکل کو موزوں ومناسب پایا۔

اب پہلی مرتبہ روما نے ورائے ایلپس کے اقطاعِ ملک میں ایک مستحکم سیاسی تنظیم جاری کر دی تھی۔ غالیہ اور برطانیہ میں وطنی تہذیب وتمدن کے تخم تباہ کر دیئے گیئے؛ طریق ڈروینڈ فنا ہو گیا؛ کلٹی زبان غالیہ کے بیشتر حصے میں مردہ ہو گئی؛ زبان، مذہب اور ہر شے میں غالیہ لاطینی بنالیا گیا۔ مگر جرمانیہ میں روما کو شدید رکاوٹ پیش آئی اور اسے مجبور ہونا پڑا کہ وہ رہائن کو اپنے فتوح کی حد قرار دیدے۔ جرمانی قبایل اگرچہ غیر مفتوح رہے مگر اس وقت سے دریائے مذکور کی اس جانب انھوں نے خود کو سخت دباؤ اور اس کے ساتھ ہی محرکِ اثر کے تحت میں پایا۔ دوسری صدی عیسوی میں اس سیاسی ارتقا کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے جو اس دباؤ کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ قدیم جرمانی قبیلے ناپدید ہو گئے اور الکمان سیکسن فرینک اور قوط کے ناموں سے زیادہ وسیع ومستحکم سیاسی اتحادات قایم ہو گیئے۔ مگر جرمانیہ میں نہ صرف یہ کہ شہری مملکت کا وجود نہیں تھا بلکہ معقول درجہ کا کوئی شہر بھی نہیں تھا اس لیئے اہلِ جرمانیہ خاص طور پر حملوں کے لیئے وقف تھے کیونکہ ان کے پاس قلعہ بند مقامات نہیں تھے۔ اگرچہ رومانیوں نے انھیں زیر کرنے کی مزید کوشش نہیں کی مگر مشرق کی جانب سے ان پر حملے ہوتے رہے کیونکہ وہ اب بھی زیادہ تر قبایلی حالت میں تھے اور قبیلہ ہمیشہ کمزور ہوتا ہے۔

جرمانیہ میں قلعہ بند مقامات کی کمی کا نتیجہ اب ان عظیم الشان انقلابات میں رونما ہوا جنھیں ہم قوموں کا نقلِ وطن کہتے ہیں۔ مشرقی جانب سے ایشیائی ہنون کے حملوں اور نیز سلافی قبایل کے بڑھنے سے جرمانیہ اب رومانی شہنشاہی پر پلٹ پڑا۔ اولاً زیادہ مشرقی جرمانی قبایل قوط اور وندال سیلاب کی طرح سے مغرب پر پھیل گیئے اور اسپین جنوبی غالیہ، افریقہ اور اطالیہ میں اپنی سلطنتیں قایم کر لیں۔ شہنشاہی اس نقلِ وطن سے بہت کچھ متغیر ہو گئی مگر اس سے دیرپا سلطنتیں نہیں قایم ہوئیں۔ ایک صدی بعد اطالیہ اور افریقہ کی جرمانی بادشاہوں کو بیلی ساریوس نارسیس کے تحت میں شہنشاہی فوجوں نے پھر تباہ کر دیا اور اسپین کی قوطی سلطنت

بھی زیادہ زمانہ تک قایم نہیں رہی مگر پانچویں صدی کے نصفِ ثانی میں نقلِ وطن کی ایک دوسری فوج اٹھی؛ المانیوں نے سوئیزرستان، الساس اور باڈن پر قبضہ کرلیا، فرنیک قوم شمال کی جانب سے غالیہ میں داخل ہوگئی اور سکسنون نے برطانیہ کے بیشتر حصص پر قبضہ کرلیا۔

شہنشاہی کو اس قدر حملے اس وجہ سے برداشت کرنا پڑے کہ وہ ایک نیم عضوی مملکت کی کمزوری میں مبتلا ہوکر ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ مگر متواتر کوششوں سے اس نے خود کو کسی قدر بند کرلیا تھا۔ بڑی بڑی شہنشاہیاں بالطبع کمزور عہدیتوں کے عنوان کے تحت میں آجاتی ہیں؛ یعنی ان میں مقامی قوت کے مقابلہ میں مرکزی قوت اتنی کمزور پڑجاتی ہے کہ وہ کم و بیش مفلوج سی ہوجاتی ہیں۔ تیسری صدی کے وسط میں جسے "تیس خود سروں" کا زمانہ کہا جاتا ہے رومانی شہنشاہی کا یہی حال تھا۔ دیوکلیتیان اور قسطنطین دو مصلحین نے اجتماعِ مرکزیت میں بڑا کارنمایاں دکھایا اور اس طرح انھوں نے ایک کمزور وفاقیت کو کہیں زیادہ زوردار بنادیا لیکن اس میں اتنی قوت نہیں آئی کہ وہ انجام کار جرمانی حملہ آوروں کا مقابلہ کرسکتی۔

یہ علاج جیسا کچھ بھی تھا محض بیرونی تھا اور مرض تھا اخلاقی چونکہ شہنشاہی قوت کی بناء پر قایم کی گئی تھی اس لیئے وہ اصلاً غیر عضوی اور اخلاقی حیثیت سے مردہ تھی پھر بھی اس کے اندر روحانی زندگی کا ایک وسیع ذخیرہ یعنی قدیم تہذیب و تمدن کا تمام خزانہ موجود تھا۔ ہم نے مملکت کی قوتِ حیاتیہ کا تجربہ کیا ہے اور اس سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کا خاص عنصر مذہب ہے۔ زندہ مملکتوں کے لیئے ضروری ہے کہ وہ ابتداءً مذہبی حکومتیں ہوں۔ اب اس موقع خاص پر رومانی شہنشاہی کو ایک مذہب مل گیا یعنی وہ مسیحی اور کیتھولک ہوگئی اور اب اس کے بعد سے وہ غیر عضوی نہیں کہلاسکتی تھی۔ اس وقت سے یورپ کی مذہبی حکومت کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس عظیم الشان حیاتِ ثانیہ میں شہنشاہی دو حصوں میں منقسم ہوگئی؛ مغربی شہنشاہی مشرقی شہنشاہی سے ممیز ہوگئی اور یہ امتیاز بتدریج شہنشاہی مذہب تک پھیل گیا۔ لاطینی کلیسا نے خود کو یونانی کلیسا سے علحدہ کرلیا۔

سلطنت نے مذہب سے جو نئی قوتِ حیات حاصل کی، اس نے اسے اخلاقی طرز میں عین اس وقت جارحانہ رنگ دیدیا جب اس پر فوجی حملے ہو رہے تھے فاتح فرینک سکیسن عیسائی اور مذہبی مفہوم میں رومانی ہو گئے، اور انگلستان کے سکیسن اپنے پہلے جوشش میں روما کے اخلاقی فتوح کو خود جرمانیہ کے اندر لے گئے۔

لیکن ایک عالم گیر مذہب اور اس کے عظیم الشان سیاسی اثرات نے نقل وتقلید کا جوش پیدا کر دیا ایک نیا عالم گیر مذہب جو ایک حد تک اسی مذہب کے مواد سے مرکب تھا عرب میں ظاہر ہوا اور اس نے مملکتوں کی ایک بہت بڑی نمود قائم کر دی جو باہم ایک طرح کی عہدیت میں بندی ہوئی تھیں۔ بہت جلد دنیا دو حریف سمتوں میں منقسم ہو گئی جو نیم سیاسی اور نیم مذہبی تھیں؛ ایک طرف عالم عیسوی تھا اور دوسری طرف عالم اسلامی۔ ان دونوں کی لڑائیاں ایک ہزار برس کے زمانہ کو گھیرے ہوئے ہیں، پہلے مسلمانوں کی طرف سے سبقت ہوئی اور شام، مصر، افریقہ، و اسپین عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل گئے؛ اس کے بعد جنگہائے صلیبی میں عیسائیوں کی جانب سے پیش دستی ہوئی، پھر مسلمانوں کی باری آئی اور ترکوں نے یونان بلغاریہ اور قسطنطنیہ کو فتح کر لیا؛ بعد ازاں پھر عیسائیوں نے قدم بڑھائے اور شہزادہ ایوجن اور روس کے فاتحانہ مہمات وقوع پذیر ہوئے۔

ان سب کی کنجی وہی رائے ہے جو ہم نے مذہب کے بارے میں اختیار کی ہے کہ وہ سیاسی زندگی کا ایک خاص عنصر ہے، اور حکومت مذہبی سلطنت کی ایک ابتدائی ہیئت ہے۔

اس قاعدے کے بموجب توقع یہ ہونی چاہیئے کہ مہتم بالشان عیسوی حکومت مذہبی ترقی کر کے ایک عظیم الشان عیسوی سلطنت بن جاتی یا چونکہ لاطینی و یونانی کلیساؤں میں افتراق ہو گیا تھا اس لیے دو عیسوی سلطنتیں بن جاتیں، اور ایک مدت تک ایسا ہونا غیر اغلب نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مغربی شہنشاہی عیسوی کلیسا کے نام سے پھر زندہ کی گئی۔ پہلے چارلس اعظم بحیثیت سرگروہ قوم فرینک اور اس کے بعد اوٹو نے بحیثیت سرگروہِ قوم سکیسن مذہبی شہنشاہی کو ایک

شکل و صورت عطا کی، اور اسے مقدس رومانی شہنشاہی قرار دیا۔ فرینک خاندان نے فرانس سے عربوں کو پسپا کیا اور سیکسن خاندان نے یورپ کو قوم مجیار سے بچالیا۔ گر عیسوی سلطنت ان ابتدائی حالات سے آگے نہیں بڑھی۔ اس کی وجہ مملکت کی بہت بڑی وسعت اور سیاسی تعمیر میں زمانہ کی بربریانہ کمزوری تھی۔ اس کمزوری کا اظہار نظم جاگیریت کی شکل میں ہوا جس نے تمام حکومتوں کو ایک انتہائی کمزور عہدیت کی شکل دیدی۔ اس زمانہ میں خود شہنشاہ اور ان بادشاہوں کو جو یورپ کے خاص خاص حصوں میں حکمراں تھے بہت کم عملی اختیار حاصل تھا؛ حقیقی حکومت جو کچھ تھی وہ جاگیرداروں کی بربری مطلق العنانی تھی۔ جب مزید ارتقاء اس طرح روک دیا گیا اور ہمہ گیر عیسوی سلطنت ہنوز کمزور تھی اس وقت میں اس سلطنت کے قائم مقام یعنی شہنشاہ اور اس کے تحت السطح مذہبی حکومت کے نمایندے یعنی پوپ کے درمیان مہلک نزاع برپا ہوگئی۔ یہ نزاع جسے ہلڈبرانڈ نے گیارھویں صدی میں شروع کیا دو صدیوں سے زاید تک جاری رہی اور عالم عیسوی کے توحد کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔

سیاسی ارتقا جب اس طرح روک دیا گیا تو اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ چونکہ عالم عیسوی بحیثیت مجموعی ترقی نہ کر سکا اس لیے اس کے مختلف اجزا نے ترقی شروع کردی۔ قبائلی جذبہ یا قرابت کا احساس جو تمام سیاسیات کی بیخ و بن ہے گر روحانی شہنشاہی نے اسے دبا دیا تھا اب اس نے پھر سر نکالنا شروع کیا۔ گر اب کے اس نے ایک خاص صورت اختیار کی۔ جدید قوم کا تخیل جس کا خاص تمغۂ امتیاز زبان ہے اب پیدا ہو چلا تھا اور یورپ جو اس وقت تک خود کو ایک واحد مذہبی شہنشاہی سمجھتا رہا تھا اب جنگہائے صلیبی میں وہ قوموں کی ایک برادری کی صورت میں ظاہر ہونے لگا اور مسیحی حکمرانوں میں اب شہنشاہ کا تقدم زیادہ سے زیادہ اتنا تھا جتنا کسی "اگیمیمیں" کا تقدم ہو۔

مذہبی شہنشاہی کے کالبد کے اندر قومی مملکت کا نشو و نما صدیوں کا معاملہ تھا۔ قومی مملکتیں شاید زمانۂ قدامت میں بھی معلوم و معروف تھیں گر جب انھیں خوشحالی حاصل ہوئی تو انھوں نے فتوح کے درپے ہو کر عام طور پر اپنی اس خصوصیت کو کھو دیا

اور غیر عضوی شہنشاہیوں کی حالت میں غرق ہو گئیں۔ اب قومی مملکتیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو ترقی کرنے لگیں اور وہ ایک دوسرے کو اسی طرح روکتی رہیں جس طرح قدیم یونان میں شہری مملکتوں کا حال تھا۔ فرانس اور جرمانیہ نویں صدی میں ایک دوسرے سے جدا ہو چلے تھے۔ پوپ اب فرانس کے نشو نما کی تائید کرنے لگے۔ کیونکہ شہنشاہ کے ساتھ اپنی کشمکش میں وہ فرانس ہی کے طرف جھکتے تھے، اور انھوں نے البی جنسیوں کے خلاف مذہبی جنگ کر کے فرانس کے جنوب میں ایک خود مختار سلطنت کا تخم ضائع کر دیا۔ انگلستان جو ڈنمارک والوں کے ساتھ کشمکش کی وجہ سے پہلی مرتبہ متحد ہوا اور اصل اپنی جزائری حالت کی وجہ سے اور اسی طرح اسپین اپنی جزیرہ نمائی کیفیت کی وجہ سے بچا رہا۔ تیرھویں صدی میں قومی واضعان قانون، فریڈرک دوم الفانسو، سنٹ لوئی اور ایڈورڈ اول کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد ہی بہت جلد قومی ادبیات نے اپنا زور دکھانا شروع کیا۔ مگر جب ہر ایک قومیت کی بنیاد پڑ گئی تو دو اہم مسائل حل کرنے کے لیے باقی رہ گئے؛ ایک یہ کہ ہر قوم کے حدود تعین ہو جائیں، لیکن یہ بے انتہا لڑائیوں کے بغیر ہو نہیں سکتا تھا؛ دوسرے یہ کہ جاگیری دور میں مذہبی شہنشاہی کی شنری سے ایک ایسی تنظیم پیدا کیجائے جو قومی مملکت کے لیے موزوں ہو۔

بارھویں صدی کی جنگہائے صلیبی سے ہم پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یوروپی اقوام کی دولت عامہ ہنوز اس ہیئت میں تھی جس کی تشبیہ ہومر سے دی جا سکتی ہے یعنی وہ ہنوز ابھی ہیولانی حالت میں تھی۔ پندرھویں صدی کے آخر میں فرڈیننڈ، وازابیلا، ہنری ہفتم، لوئی دوازدہم اور میکسیملین کے عہدوں میں سربرآوردہ یوروپی سلطنتوں نئے خاکے اور شکلیں ممیز ہو گئی تھیں۔ انگلستان و فرانس نے اپنے مدت کے مناقشہ کو طے کر لیا تھا؛ اسپین متحد ہو گیا تھا اور اس نے عربوں کو ملک سے نکال دیا تھا؛ برگنڈی کی جا جب مملکت کو زوال ہو گیا تھا، اور سوئیزرستان کے صوبوں کی خود مختاری متیقن ہو گئی تھی۔

اس کے بعد سولھویں صدی میں قدیم شہنشاہی و مذہبی کالبد آخری طور پر شکست ہو گیا۔ چارلس پنجم نے ہمہ گیر عیسوی شہنشاہی کے تجربے کی ایک

آخری کوشش کی، مگر اپنے اس فعل سے اس نے پاپاؤں کے ناقابلِ آشتی فساد کی تجدید کر دی۔ گوئلف اور گیبےلین فرقوں کا قدیم مناقشہ جس نے دو صدی قبل متحدہ یورپ کی ترقی کو روک دیا تھا، اب اس نے ہمہ گیر کلیسا کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ پوپ اور شہنشاہ ایک دوسرے سے اس قدر بدگمان ہو گئے تھے کہ وہ الحاد و زندقہ فرو کرنے پر متحد نہیں ہو سکتے تھے اور یہ الحاد متعدد سلطنتوں میں مستحکم ہو گیا۔ اب قومی کلیسا پیدا ہو گئے؛ انگلستان نے اتحادِ مذہبی کے مرکز روما کے ساتھ کامل بے پروائی کا برتاؤ کیا اور فرانس نے اگرچہ اس کی وقعت کو مدِ نظر رکھا مگر اپنی آزادی بھی برقرار رکھی۔ اسپین اور شہنشاہی نے اس سے قریبی تعلق قایم رکھا مگر گوئلف اور گیبےلین میں آتشِ مناقشہ اب بھی خفیہ طور پر بھڑکتی رہی اور اسپین بظاہر روما کی اطاعت کا دعوے کرتا تھا اور یہ باطن حکمرانی کرتا تھا۔

قومی مملکتیں اس وقت تک موزوں حد تک قایم ہو گئیں تھیں ان کی خود مختاری مسلم ہو گئی مگر ان کی حکومت کی شکل میں ہنوز حکومتِ مذہبی کے زمانے کا اثر باقی ہے جو جاگیریت سے نقل کیا گیا تھا۔ حکمرانوں کی حیثیت زمینداروں کی سی تھی۔ وہ جس سلطنت پر حکمرانی کرتے تھے اسے وہ ایک ایسا زمیندارانہ تعلقہ سمجھتے تھے جو ان کے قبضہ میں ہو اس لیے بادشاہیاں ورثہ میں املاک کی حیثیت سے منتقل ہوتی تھیں اور چونکہ بہت سے ملکوں میں عورتوں کی جانشینی بھی مسلم تھی، اس لیے ایسا ہوتا رہتا تھا کہ عقدِ نکاح کے بعد سلطنتیں نہایت ہی نوورایانہ طریق پر متحد کر دی جائیں۔ سولھویں صدی کے اوایل میں اس عجیب و غریب صورتِ حال کے باعث ایک مرتبہ پھر قومی سلطنتوں کو برباد کر دینے اور چارلس پنجم کے تحت میں ہمہ گیر شہنشاہی کو دوبارہ زندہ کر دینے کا خیال پیدا ہو گیا لیکن حسنِ اتفاق سے اس کے نتائج اچھے بھی ہوئے، چنانچہ اسپین، فرڈیننڈ اور ازابیلا کے نکاح ہی سے وجود میں آیا۔ اسی طرح انگلستان و اسکاٹلینڈ کو متحد کر کے اسی قسم کی معاقدے نے بتدریج برطانیۂ عظمی کی صورت پیدا کر دی۔ سترھویں صدی کے آغاز کے بعد سے قومی مملکتوں کے سامنے یہ مسئلہ پیش تھا کہ کس طرح وہ جاگیری تنظیم سے

قومی تنظیم کو ترقی دیں۔ قدیم طرز جب کمزور نہ رہا تو پھر لامحالہ اس کا میلان مطلق العنانی کی طرف ہو گیا۔ جہاں حکومت وراثت کے معین قاعدے کے تحت میں زمینداری کبھی جاتی تھی وہاں کوئی حکومت ساز عضو ہی نہیں سکتا تھا۔ سولھویں صدی کی مذہبی لڑائیوں کے دوران میں اس نظم میں پہلی مرتبہ رخنہ پڑا اور ایک ایسی سلطنت وجود میں آئی جس میں ایک حکومت ساز عضو موجود تھا، صوبجاتِ متحدہ" میں حکومت کبھی کبھی ایک اسٹاٹ ہولڈر (Stadtholder) کے قبضہ میں ہوتی تھی جو اس اعتبار سے بادشاہ کے مشابہ ہوتا کہ وہ ہمیشہ ایک ہی خاندان سے ہوا کرتا تھا۔ کبھی حکومت متعدد لوگوں کے قبضے میں ہوتی تھی۔ مگر ہر دو صورتوں میں ایک حکومت ساز عضو موجود تھا جو اگرچہ بھدا سا تھا مگر موثر تھا۔ سترھویں صدی کے نصف اول میں یہ کوشش کی گئی کہ اس قسم کا نظم انگلستان و فرانس میں بھی جاری کیا جائے۔ انگلستان میں بظاہر کامیابی ہوئی؛ پارلیمنٹ نے چارلس اول کی حکومت کو برباد کر دیا۔ مگر کسی قابلِ اطمینان نظم کے قایم کرنے میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کشمکش کی گرما گرمی میں اختیار فوج کے ہاتھ میں چلا گیا؛ ایک جماعتی مملکت یعنی ایک آمریت قایم کی گئی اور آخر میں قوم بہت ہی بددل ہو گئی۔ اسی زمانے کے قریب ولندستان میں اسٹاٹ ہولڈر کا عہدہ جو شاہی شکل سے زیادہ قربت رکھتا تھا منسوخ کر دیا گیا۔ مگر یہاں اور یہاں سے زیادہ فرانس میں یہ تجربہ ناکام رہا۔ فروند میں جو یہ کوشش کی گئی کہ پیرس کی پارلمان کو بادشاہ کے خلاف بھڑکایا جائے اس سے اس امر کا قطعی عدم امکان ثابت ہو گیا کہ فرانس کے قدیم ادارات مقصد زیرِ نظر کے حسب خواہ بنائیے جا سکتے ہیں، اور ولندستان میں یہ واضح ہو گیا کہ اسٹاٹ ہولڈر کے عہدے سے کم درجے کا کوئی عہدہ جنگ کے زمانہ میں موزوں نہ ہوگا۔ لہذا سترھویں صدی کا نصف ثانی رجعت کا زمانہ تھا اور نہ صرف انگلستان کے لیئے بلکہ ولندستان کے لیئے بھی اور فرانس میں تو لوئی چہار دہم موروثی مطلق العنانی کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ یہاں تک ردِ عمل کا بیان ہوا۔ مگر اسی زمانے میں ۱۶۸۸ء کے انقلابِ انگلستان سے ارتقا کو

بھی قابلِ یادگار ظفرمندی حاصل ہوئی۔ اس انقلاب کے ذریعے سے حکومت ساز عضو مستحکم طور پر قایم ہوگیا اور اس نے بہت جلد سویڈن اور پولستان کے ناکام دستوری تجربات کے لئے نمونے کا کام دیا۔

لوئی چہاردہم کے دور میں اپنی عظیم الشان کامیابی کے باعث موروثی بادشاہی پست اور مبتذل ہو کر "سلطانیت" کو پہنچ گئی۔ اور اس نے محض حرص و ہوس کے واسطے طول طویل لڑائیاں لڑنی شروع کردیں جس سے بے اندازہ مالی بربادی ہوئی۔ آہستہ آہستہ انقلابی بددلی کا ایک سرمایہ جمع ہوتا گیا اور اب پہلی مرتبہ یورپ نے اس نظارے کا مشاہدہ کیا کہ ایک جدید مملکت بالکل نئے سرے وجود میں آرہی ہے۔ امریکہ میں حکومت ساز عضو علانیہ عمل کرتا ہوا نظر آیا اور ایک کامیاب حکومت وجود میں آگئی۔ فوراً ہی یورپ بھی اسی ارتقائی راستے پر پڑ گیا جس میں اتنے دنوں اسے تاخیر ہو رہی تھی۔ اس کارروائی کا آغاز فرانس سے ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ اس سے ایسی ابتریاں اور تباہیاں برپا ہوئیں جن کی کوئی نظیر نہیں ملتی مگر کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ فرانس میں حکومت ساز عضو کو نشو و نما حاصل ہوگیا۔ اس اثناء میں انگلستان نے بغیر کسی پریشانی و ابتری کے پیچ در پیچ کارروائیوں سے اس کام کی تکمیل کرلی جسے اس نے انقلاب کے وقت شروع کیا تھا اور ذمہ دار وزارت کی تدبیر نکال کر موروثی بادشاہی اور حکومت ساز عضو کے درمیان صورت آشتی پیدا کردی۔ اس کے بعد سے امریکہ اور انگلستان کے بھی دو نمونے یورپ کی بیشتر دوسری سلطنتوں میں نقل ہوتے رہے ہیں۔

ختم کلام یہ کہ قدیم مذہبی حکومت کی آخری علامت بھی زایل کردی گئی۔ قومی مملکتیں جو دوسری جگہوں میں قایم ہوگئی تھیں ابھی تک ان کا عمل دخل جرمانیہ و اطالیہ یعنی شہنشاہ و پوپ کے ممالک میں نہیں ہوا تھا۔ سنہ ۱۸۶۰ء اور سنہ ۱۸۶۶ء کے انقلابات سے اطالیہ اور جرمانیہ بھی یورپ کی دوسری سلطنتوں کے پہلو بہ پہلو قایم ہوگئی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ تم یہ سمجھ لوگے کہ میں نے یہ طولانی داستان کیوں دہرائی ہے۔ میں نے کوشش یہ کی ہے کہ دنیا کی تقریباً ساری تاریخ نصف گھنٹے

میں سنا دوں، محض اس لیے کہ تمھیں یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے ان خطبوں میں جو اسمائے عام جمع کیے ہیں اور اس قدر غور و فکر سے ان میں امتیاز قایم کیا ہے ان کا عملی نفع کیا ہے۔ تاریخ عام طور پر، لا محدود متفرق واقعات کا ایک ناقابلِ حفظ واحاطہ لاتناہی ذخیرہ، اور ایک حیرت انگیز بھول بھلیاں سمجھی جاتی ہے۔ میرا عقیدۂ راسخ یہ ہے کہ جب تک اس میں یہ غیر محدود متفرقات اور حیران کن کیفیات باقی رہینگے اس وقت تک اس کا مطالعہ ہرگز نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ تمھارے لیے کوئی ایسی چیز مہیا کر دوں جو اس بھول بھلیاں کے لیے رہبر کا کام دے۔

میں نے ابتدا کرتے وقت یہ قرار دیا تھا کہ اگرچہ ان حوادث و واقعات کی تعداد اور اُن کا تنوع جو ایک معنی میں تاریخی کیے جا سکتے ہیں قریب قریب غیر متناہی ہے پھر بھی تاریخ خاص کا تعلق صرف ایک ہی قسم کے مظاہر قدرت یعنی اُن سیاسی گروہوں سے ہے جنھیں بنی نوع انسان تقریباً ہر جگہ بنا لیا کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تقریباً ہر ایک قابل یادگار کام جو بنی نوع انسان سے ظہور میں آیا ہے انھیں گروہوں کے اندر، انھیں کی تنظیم کی سرپرستی کے تحت، یا انھیں کے تصادم باہمی کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا ہے۔ مگر تاریخ کو اولاً و اقدماً ان گروہوں کے مشتملہ افراد یا ان کے یادگار کارناموں سے غرض نہیں ہے بلکہ خود ان گروہوں، ان کے ارتقا و تنظیم، ان کے اتحادات و تصادمات سے غرض ہے اور افراد سے صرف اس حد تک غرض ہے جس حد تک انھوں نے اس ارتقا اس تنظیم ان اتحادات اور ان تصادمات پر اثر ڈالا ہے۔

یہ اصول اگر قبول کر لیا جائے تو یہ تاریخ کی صورت کو فوراً ہی بدل دیگا اور واقعات کے انبار میں تمام ناقابلِ ضبط تفرقات کو غایب کر دے گا۔

لیکن میں ایک دوسرا قدم آگے بڑھتا ہوں۔ پہلی نظر میں یہ سیاسی گروہ اپنے تنوع اور اپنے اتحادات گوناگون کی وجہ سے بجائے خود حیران کن معلوم ہوتے ہیں مگر میں یہ کہتا ہوں کہ یہ محض واہمہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بے انتہا انفرادی فرق

موجود ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ایک گڈریا اپنے گلّے کی ہر ایک بھیڑ میں فرق کر سکتا ہے مگر تشابہات کے مقابلہ میں یہ تخالفات بے حقیقت ہیں۔ مملکت کے اقسام کی تعداد اور مملکت کے ارتقا کے پیرایوں کی تعداد محدود ہے اور شاید اس سے زیادہ محدود ہے جتنا ہم خیال کرتے ہیں۔ ہم نے مشابہت اور مقابلے کے طریقے سے کام لیکر ان اقسام میں تمیز کرنے کی کوشش کی ہے اور تمام قیاسی تعمیم سے بچتے رہے ہیں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں ایسی ترتیب و تقسیم کر سکوں جو کسی اعتبار سے مکمل ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہم نے جو فہرست بنالی ہے تم اس میں دوسرے اقسام اور شاید متعدد دوسرے اقسام کا اضافہ کر سکو۔ تمھارے لئے ترتیب و تقسیم کے ضروری کام کو انجام دیدینا اب مجھے اتنا منظور نہیں تھا جتنا منظور یہ تھا کہ میں یہ اشارہ کردوں کہ تقسیم و ترتیب کے کام کو کیونکر انجام دینا چاہیئے اور اس کے عمل کے نمونے بھی تمھارے سامنے پیش کردوں۔ پھر بھی میں نے ایک ایسی فہرست بنالی ہے جو کافی طویل ہے۔ مزید براں ہم نے خصوصیت کے ساتھ انھیں اقسام پر توجہ کی ہے جو تاریخ میں بہت کثرت کے ساتھ واقع ہوتے ہیں۔ اگر میرا طریقہ فی الواقع مفید ہے تو جو عام نام ہم نے جمع کر لئے ہیں صرف انھیں کی مدد سے میں یہ ظاہر کر سکوں گا کہ زلف تاریخ فی الواقع پہلے سے کم پریشان و ژولیدہ معلوم ہونے لگی ہے اور ہم نے اس بھول بھلیاں میں ایک سلسلہ معلوم کر لیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج اس طرح سانس لئے بغیر دنیا کی تاریخ کے تمام عرض و طول اور اس کے نہایت ہنگامہ خیز زمانے سے تمھیں گزار لے گیا ہوں۔ قدامت کے ابتدائی قبائلی دور سے شروع کرکے ہم ان انقلابات تک پہنچ گئے جو خود ہمارے زمانے میں واقع ہوئے ہیں۔

اگر میرے پاس زیادہ وقت ہوتا تو میں کم از کم دو یا تین خطبے تاریخ کے اس تبصرے کے لئے وقف کر دیتا، مگر مجھے امید ہے کہ میری مفصلۂ بالا عاجلانہ تکرار داستان مقصد زیر بحث کو پورا کر دے گی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی یہ مسلمہ عام ترتیب و تقسیم اس کے صرف ایک دو منتشر واقعات پر روشنی ڈالتی ہے۔

بلاشبہ شاہی و جمہوریت، اعیانیت و عمومیت وہ الفاظ ہیں جو یونان و روما کی تاریخ میں اور پھر تاریخ جدید کی ایک یا دو آخری صدی میں کار آمد ہیں۔ درمیان کے وسیع دور میں وہ شاید اس وقت مفید ہیں جب ہم اطالوی جمہوریت سے بحث کرتے ہیں۔ مگر تاریخ کے حصے میں (اور یہ حصہ بہت بڑا حصہ ہے) یہ الفاظ بہت کم کار آمد ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اولاً تو ابتدائی یا غیر متمدن سیاسیات کا بیان واقعی ان الفاظ سے نہیں ہو سکتا۔ ایشیا، افریقہ یا پولی نیشیا کے سیاح کو ان الفاظ سے بہت کم مدد ملتی ہے۔ ہندوؤں کا نظم معاشرت اور ان کی تاریخ کے انگریز مبصروں کو ان الفاظ کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔ ثانیاً یہ کہ جو طالب علم تاریخ میں ان صفات کے سوا اور کوئی صفت لیکر نہیں آتا وہ اس سے پریشان ہو جاتا ہے کہ مذہب کے ساتھ برابر اس کا تصادم ہوتا رہتا ہے۔ خود داستان مذہب اور نئے مذہبوں کی نشر و اشاعت اور حریف مذہبوں کی کشاکش سے تاریخ کا ایک بہت بڑا حصہ بھرا پڑا ہے اور دوسرا بہت بڑا حصہ جسے ہم سیاسیات کہتے ہیں اس پر بھی مذہب کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ ہم اس مشکل سے بچنے کے لئے مجبوری تاریخ کی دو ممیز قسمیں دینی و دنیاوی قرار دیتے ہیں مگر اس امتیاز سے زیادہ کوئی امتیاز نہیں ہو سکتا، اس تصور سے زیادہ باطل کوئی تصور نہیں ہو سکتا کہ تم مذہب کا ذکر زبان پر لائے بغیر مملکت کا مکمل بیان دے سکتے ہو یعنی یہ کہ مملکت ایک دنیاوی ادارہ ہے اور صرف کلیسا مذہبی ادارہ ہے۔ علاوہ ازیں یہ مسلمہ تقسیم ان تمام شہنشاہیوں کو بالکلیہ خارج کر دیتی ہے جس میں فتح کے ذریعہ سے متعدد قومیں ملائی جاتی ہیں۔ لیکن قدیم زمانہ میں رومانی شہنشاہی اور حال کے زمانہ میں ترکی شہنشاہی یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی مثالیں ہیں کہ فتح کے یہ مظاہر قدرت تاریخ میں کس قدر اہم ہیں۔

اگر ہم اپنے کو ان دو امور کے خلط مبحث سے پریشان نہ کرلیں کہ کیا ہے یا کیا ہوتا رہا ہے اور ہمارے خیال کے موافق کیا ہونا چاہیے، تو ایسی صورت میں یہ اور بھی روشن ہو جاتا ہے کہ یہ تقسیم کس درجہ غیر مکتفی ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ ابتدائی مملکت کی طرف سے تغافل ہوتا جاتا ہے تو جواب یہ ملتا ہے کہ ضرور ایسا

ہوتا ہے مگر یہ تکلیفیں تو غیر متمدن ہیں۔ نتیجے کے مظاہر کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے جواب یہ ہے کہ بیشک، مگر ہمیں یہ توقع کرنا چاہئے کہ انسانیت کی ترقی یوماً فیوماً جنگ و فتح کو متروک بنا دے گی۔ مذہبی مظاہر قدرت کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے، لاریب، مگر افسوس کے ساتھ اسے بھی صحیح ماننا پڑتا ہے کہ ازمنۂ ماضیہ میں رواداری کی حسن و خوبی بہت کم سمجھی جاتی تھی اور اس وقت یہ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا کہ یہ مذہب ایک ایسا معاملہ ہے جو انسان اور اس کے خالق کے درمیان میں ہے، مگر ان بدبخت مناقشات کی یاد کو اب تازہ کرنے کی ضرورت کیا ہے؟

یہ صاف ظاہر ہے کہ جب تک ہم اس طریق سے استدلال کرتے رہینگے اس وقت تک ہم کوئی ایسا علم سیاسیات نہیں مہیا کر سکتے جو تاریخ کے لئے رشتہ سراغ کا کام دے۔ تاریخ پر میرے اس عاجلانہ تبصرے کا خاص مقصد یہی ظاہر کرنا تھا کہ ان نقایص کے لئے معذرت کرنے کے بجائے ان کی تکمیل کی زحمت اٹھانے سے ہم اس رشتۂ سراغ کو پا سکتے ہیں ہم نے جتنے صفات جمع کئے ہیں ان میں سے اس مقصد کے لئے تین صفات سب سے زیادہ اہم ہیں۔ قبایلی، مذہبی اور غیر عضوی۔ زیادہ تر انھیں کی مدد سے ہم ان رخنوں کو بند کر سکتے ہیں جنھیں عام تقسیم چھوڑ جاتی ہے اور اس طرح تاریخ کے صرف چند متفرق اجزا کو نہیں بلکہ کل تاریخ کو ضابطہ کی روشنی میں لا سکتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ جن لوگوں نے میرے بیان کو سنا ہے ان میں بعض اشخاص میرے ان خیالات کا وزن و اندازہ کرینگے اور جہاں تک وہ ترقی کے قابل ہوں گے انھیں ترقی دیں گے۔ بظاہر اس نسل کے طلبہ پر یہ کام عاید ہوا ہے کہ وہ سیاسیات اور تعلیم دونوں کے اندر تاریخ کی مناسب جگہ مہیا کریں۔ پہلے کبھی اس قدر دلچسپی و استعجاب کے ساتھ اس پر نظر نہیں کی گئی تھی، کبھی اس جوش و خروش کے ساتھ لوگوں نے اس کام میں ہاتھ نہیں لگایا تھا اور نہ محققین کی اتنی بڑی فوج اس کے درپے ہوئی تھی۔ مگر اس میں ایک رکاوٹ ہے اور یہ زیادہ تر اس مطالعہ کی اس دلچسپ و عام پسند خصوصیت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

مجرد و عسیر الفہم مطالعات میں جس طرح قبول عام کے محرکات کی ہوتے ہیں اسی طرح وہ اس رکاوٹ سے بھی بری ہیں۔ وہ ان چند اشخاص کے ہاتھوں میں چھوڑ دیے جاتے ہیں جن کو ان سے تعلق ہوتا ہے اور چونکہ یہ لوگ خود بحال تو چھوڑ دیے جاتے ہیں اس لئے انہیں راہ راست کے ترک کرنے کی کوئی وجہ ترغیب نہیں ہوتی۔ مگر وہ کثیر التعداد اشخاص جو تاریخ میں گہری دلچسپی لیتے ہیں ان میں سے نصف سے زاید ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی علمی مقصود مطلق نہیں ہوتا۔ بعض محققین قدامت اور عجائبات کے جمع کرنے والے ہوتے ہیں اور بعض فسانہ نگار افسانہ پسند ہوتے ہیں، بعض اہل پیشہ وکیل یا پادری وغیرہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تعداد کی عادت علمی ہونے کے بہ نسبت ادبی ہوتی ہے۔ یہ سب حکمیات کے سیدھے راستہ سے خود بہک جاتے اور دوسروں کو بھی بہکا دیتے ہیں۔ ان کے مقاصد دوسرے ہوتے ہیں ایک شخص تاریخ میں اپنے شاعرانہ احساس کے لئے تلاش کرتا ہے دوسرا حب الوطنی کے لئے تیسرا فنون کے لئے اور چوتھا کارآمد معلومات کے لئے۔ جن لوگوں کا مقصود علمی ہوتا ہے ان میں بھی بعض کو تاریخ میں ایک علم کا مواد نظر آتا ہے اور بعض کو دوسرے علم کا۔ اور بہترین ذہانت کے جو اشخاص اپنے کو تاریخ کے لئے وقف کر دیتے ہیں وہ آخر میں ایک بڑے سائنس داں عالم ہونے کے بجائے ایک بڑے ادیب بن جاتے ہیں۔

عین اس وقت مجھے یہ سب سے زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے طالب علم کو خود یہ سوچنا چاہیئے اور اپنے دل میں رائے قایم کر لینا چاہیئے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کس کام کا کرنا اس کا مقصود ہے۔ جن سوالات کے جوابات دیئے جائیں وہ اس قسم کے ہیں کہ کیا تاریخ کی تہ میں کوئی سائنس ہے۔ کیا اس کی تہ میں متعدد سائنس ہیں اگر متعدد سائنس ہیں تو کیا ان میں سے کوئی ایک سائنس دوسرں کے بہ نسبت زیادہ صحیح تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ان علوم کے ساتھ تاریخ کی کیا نسبت ہے؟ اگر تاریخ وہ واقعات مہیا کرتی ہے جنہیں سائنس تقسیم کرتا ہے تو کیا اس صورت میں

یہ درست ہوگا کہ طلبہ کا ایک طبقہ بالکلیہ واقعات کے جمع کرنے پر اور دوسرا ان کی تقسیم پر موقوف ہو جائے یا یہ کہ تاریخ کا طالب علم عام طور پر واقعات کی تحقیق کرنے والا اور نظریاتی طور پر استدلال کرنے والا دونوں ہو۔

تم یہ دیکھتے ہو کہ ہم ان سوالوں کا جواب کس طرح دیتے ہیں ہم تاریخ کی تہ میں ایک علم سیاسیات پاتے ہیں اور جیسا کہ چاہیئے ہم تمام تاریخی تحقیق کو اس علم کی رہبری و حکومت میں دیدیتے ہیں لیکن یہ علم ہنوز حالت تکوین میں ہے۔ ہم ابھی تک کسی قابلِ اطمینان درسی کتاب کا حوالہ نہیں دے سکتے۔ ان حالات میں بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ آیا اس قسم کا کوئی علم موجود ہے یا بن سکتا ہے اور اکثر لوگ اس پرانے طریقہ کو ترجیح دیں گے کہ محض علمیت تحقیقات، خود تحقیقات ہی کی غرض سے ہو اور بے انتہا تلاش و جستجو سے واقعات جمع کئے جائیں۔ انھیں ادیبانہ کتابوں میں جگہ دی جائے، اور کسی ایسے اصول کے متعلق کچھ نہ کہا جائے جو اس پریشان انبار میں ترتیب قایم کر دے۔

اس لئے میں یہ کہتا ہوں کہ یہ وقت نازک ہے اور علم سیاسیات کے ان خطبات میں جنھیں میں اب ختم کر رہا ہوں میں نے تخم پانی پر ڈال دیا ہے اور اُمید رکھتا ہوں کہ اس دارالعلوم کے ترقی کن معلمان تاریخ آئندہ چند برسوں میں جو کچھ کرینگے میں کچھ دنوں بعد ان کے کاموں میں اس تخم کی نشو و نما دیکھوں گا۔

تمت

صحت نامہ تقریب علم السیاست

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۱۳	صوم اکبیر	صوم کبیر	۹۷	۱۶	دما	دبا ہوا
۱۴	۲	میری او	میری مراد	"	۲۲	وجودہ صدی	موجودہ صدی
۱۶	۶	ہمتیں	ہیئتیں	"	۲۳	ذرا	فدا
۲۰	۱۸	بناتی	نباتی	۱۱۲	۷	دوسرے کے حکومت	دوسرے کی حکومت
۲۲	۲۱	ہرمر	ہرامر	۱۱۵	۷	قانوں	قانون
۳۱	۵	مکر	مگر	۱۱۷	۳	کرتاہے	کرتا ہے
۴۴	۲۲	مختصر	محتقر	۱۲۱	۲	مگر	گر
۴۸	۱۸	لسی	کسی	۱۳۳	۱۷	طوپر	طور پر
۵۳	۱	آنثار بافیہ	آثار باقیہ	۱۳۴	۱۷	لئی	گئی
۵۸	۱	یورپ	یورپ	۱۳۶	۱۴	غرض	غرض سے
۵۹	۱	رکھتا	رکھنا	۱۳۹	۵	ٹیورڈر	ٹیوڈر
۵۹	۲۲	اشدائی	ابتدائی	۱۵۶	۲۰	مبقات	میقات
"	۲۴	روس تر	روشن تر	۱۶۳	۵	مگرس	مگراس
۶۷	۱۷	انگریز	انگریزوں	"	۱۶	گرابھی	مگرابھی
۶۸	۱۳	ہونا	ہوتا	۱۶۷	۵	ایک مقنینہ	ایک مقننہ
۷۰	۱۷	کرتا	کرنا	۱۶۹	۴	مالانہ	عاملانہ
۷۸	۲۳	نقطی	لفظی	۱۷۰	۱	خون و خاک میں	خاک و خون میں
۸۶	۲۰	در	اور				
۹۵	۲	ضرورت	صورت				
۹۹	۱۵	زوردوشور	زوروشور	۱۷۳	۹	نہیں بن سکتا تو کیونکہ	نہیں بن سکتا کیونکہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۷۹	۱۲	لائمہ عمل	لایحہ عمل
۱۷۸	۶	حق اجماع	حق اجما
۱۷۸	۲۴	ظاہر کرتا	ظاہر کرنا
۱۸۴	۴	ہلاتاخیر	بلاتاخیر
۱۹۹	۱۳	اٹھ گھڑی	اٹھ کھڑی
۲۰۱	۱۲	کی مبیخ	کی تنسیخ
۲۰۶	۲	نششتوں	نشستوں
〃	۹	مارلیمنٹیں	پارلیمنٹیں
〃	۱۶	کاہل	کاہلی
۲۱۵	۱۶	اجماع	اجما
۲۱۶	۹	اجماع	اجما
۲۲۹	۹	رہسری	رہبری
۲۳۷	۱	یا بہ کہیں	یا یہ کہیں
۲۴۱	۹	صدر مسحل	صدر مسبل
〃	۱۱	یہ کام س	یہ کام اس
〃	۱۳	تحریجات	تحریکات
۲۴۱	۲۳	بڑو گئی	بڑھ گئی
۲۴۴	۲۱	سلافی فونی ملکتوں	سلافی ملکتوں
۲۴۷	۳	یغنی	یعنی
〃	۶	بھی	یہی
۲۵۲	۸	تہیج	تہییج
۲۵۵	۱۹	گرفایعتں	گرفاتحین
۲۵۶	۲۵	یا بتناع	یا صنّاع
۲۶۱	۱۶	بے حقیقی	بے حقیقتی
۲۷۱	۸	ایک	ایک
۲۷۴	۱۵	استثنا	استغنا
۲۷۵	۱۹	پٹرلیتیں	پیٹرلیسین
۲۸۳	۲۴	حو	جو
۳۰۳	۱۷	بھی	یہی
۳۰۷	۱۵	ان رفتوں کو	ان رخنوں کو
〃	۲۲	دوسرل	دوسروں